Late Fine Ordinary books 25p. per day, Text Book Re 1 per day, Over night book Re 1 per day.

for text books and Re 1.00 for over-night books per day shall be charged from those who return them late.

damage done to the book and will have to replace it, if the same is detected at the time of return

ماھنامہ کتاب نما کی خصوصی پیشکش

جائزے

(تبصرے اور تعارف)

مرتب

ڈاکٹر مظفر حنفی

صلاح کار

ولی شاہجہانپوری ۔ خالد محمود

ماہنامہ کتاب نما۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

معاون اڈیٹر شاہد علی خاں
اڈیٹر ولی شاہجہاں پوری
مہمان اڈیٹر مظفر حنفی

جلد نمبر ۲۵
ضمیمہ شمارہ نمبر ۷ ، جولائی ۸۵ء

قیمت سالانہ : ۳۰ روپے
فی پرچہ : ۲ ۵ روپے
غیر ممالک کے لیے : ۸۵ روپے

تقسیم کار
صدر دفتر :
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی 110025

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

قیمت =/

تعداد 750

پہلی بار جولائی ۸۵ء

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج، نئی دہلی میں چھپواکر شائع کیا

صاحبِ طرزِ مبصر

ظ-انصاری

کے نام

مظفر حنفی

عرضِ مرتّب

ھرچند کہ "جائزے" کو ماھنامہ "کتاب نما" (دہلی) کی اشاعتِ خاص کی حیثیت سے پیش کرنے کا ارادہ تھا اور اسی لحاظ سے "کتاب نما" میں اس کا اشتہار بھی شائع کیا جاتا رہا ہے لیکن آخری منزل پر پہنچتے پہنچتے یہی صورت بہتر نظر آئی کہ اسے آزادانہ کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔ اس اجمال کی تفصیل بھی سُن لیجیے۔ یہ جو "مجیب صاحب۔ احوال و افکار" جیسی مفید و اہم اور "عبد اللطیف اعظمی۔ خیابات و خرابات" جیسی دلچسپ کتابیں اس طمطراق سے قلیل ترین مدّت میں تیار ھوکر ادبی حلقوں میں پہنچتی ھیں ان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ھیں کہ شاھد علی خاں صاحب کے زرخیز ذہن کی پیداوار ھیں جنھوں نے اس مخصوص موضوع کا انتخاب کر کے مناسب قلم کاروں سے بروقت مضامین حاصل کیے اور ہفتے پندرہ دن کے اندر ہی کتاب حُسن و نفاست کے ساتھ شائع بھی کر دی۔ "جائزے" کا حال بھی کچھ ایسا ہی ھے۔

ماہنامہ "کتاب نما" (دہلی) اپنے اوّلین دور میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی مطبوعات اور دیگر اداروں کی شائع کردہ کتابوں پر تبصروں کے لیے وقف تھا چنانچہ دوسرے رسائل کی بہ نسبت اس میں تبصرے کے لیے بہت زیادہ کتابیں آتی تھیں۔ پھر اسے ایک مکمّل ادبی جریدے کی شکل دے دی گئی جس کے نتیجے میں تنقیدی و تحقیقی مضامین، غزلیں اور نظمیں، افسانے اور انشائیے وغیرہ رسالے کے بیشتر صفحات گھیرنے لگے۔ اور تبصروں کے لیے دوچار سے زیادہ صفحات کی گنجائش نہ رہ گئی۔ پالیسی کے مطابق پرچے کی قیمت کم سے کم رکھنی تھی اس لیے ضخامت بھی ایک خاص حد سے زیادہ بڑھائی نہیں جاسکتی تھی لیکن رسالے میں تبصرے کی غرض سے تازہ بہ تازہ مطبوعات کا سلسلہ برابر جاری رہا جبکہ ھر ماہ چار چھ سے زیادہ تبصرے "کتاب نما" میں شائع نہیں کیے جا سکتے تھے۔ دو سال کے اندر ہی ایسی کتابوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی تو شاھد علی خاں صاحب کے ذہنِ رسا نے اس کا حل یہ تلاش کیا کہ ھر سال موصول ہونے والی کتابوں پر تبصروں کی حامل ایک بھرپور کتاب مرتب کر دی جایا کرے جو ایک حوالہ جاتی تصنیف کی حیثیت سے رسالوں کی بہ نسبت زیادہ کارآمد ثابت ہوسکتی ھے۔

"جائزے" اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

یہ کتاب ظ۔ انصاری کی "کتاب شناسی" یا شمس الرحمان فاروقی کی "فاروقی کے تبصرے" جیسی نہیں ہے کہ مذکورہ کتابوں میں تمام تبصرے ایک ہی مبصر کے قلم سے نکلے ہیں جبکہ "جائزے" میں تقریباً سوا دو سو کتابوں پر مختلف نظریہ، اسکول فکر کے حامل کم و بیش ستر اہلِ قلم کے تبصرے شامل ہیں۔ چنانچہ موضوعات اور اسالیب کا تنوع اس کا وصف ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان میں وہ کتابیں شامل نہ ہوں جن پر "کتاب نما" میں تبصرے شائع کیے جا چکے ہیں۔ کتاب کی محدود ضخامت کے پیش نظر کئی طویل تبصروں کی تلخیص پیش کر دی گئی ہے ورنہ۔ باور کیجیے کہ کچھ مبصرین نے تو سوا سو صفحے کی کتاب پر بیس تیس صفحات کے تبصرے ارسال کیے تھے۔ راقم الحروف کو لطور خاص اپنے تبصروں میں اختصار کو پیش نظر رکھنا پڑا تاکہ "جائزے" میں زیادہ سے زیادہ تبصروں کی گنجائش نکل سکے۔ اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مختلف مبصرین کی متعلقہ تصانیف پر قلمبند کردہ رایوں سے مرتب یا ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی کرنا چاہوں گا کہ گذشتہ دو تین برسوں میں تبصرے کے لیے ادارہ "کتاب نما" کو موصول ہونے والی کتابوں میں سے متعدد مطبوعات کا ذکر "جائزے" میں شامل نہیں ہے۔ یہ کتابیں ملتے ہی مبصرین کو برائے تبصرہ بھیج دی گئی تھیں افسوس کہ ہماری پیہم گزارشوں اور یاد دہانیوں کے باوجود بعض کتابوں پر تبصرے مبصروں سے حاصل نہیں کیے جا سکے۔ علاوہ ازیں "جائزے" کی ترتیب و تدوین کے دوران کئی کتابیں اور تبصرے بھی ملے ہیں جنھیں اس منزل پر شاملِ اشاعت کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ "جائزے" کی اگلی جلد میں انشاءاللہ شریک کر لیے جائیں گے۔

محترم ولی شاہجہانپوری اور برادرم خالد محمود کی معاونت کے بغیر اس پھیلے ہوئے کام کو تکمیل تک پہنچانا دشوار تھا اُن کے اس تعاون کے لیے میں شکرگزار ہوں۔ شکریہ اُن مصنفین کا جنھوں نے اپنی کتابیں مکتبے کو برائے تبصرہ ارسال کیں اور ان مبصرین کا بھی جنھوں نے ہماری فرمائش پر بروقت تبصرے کیے۔ اُمید ہے کہ کتاب کا خاطر خواہ خیر مقدم ہوگا اور یہ مفید سلسلہ سال بہ سال جاری رہے گا

مظفر حنفی

۳۵۸ بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

۱۰ اپریل ۸۵ء

ترتیب

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مرتب	مبصر	صفحہ
	تنقید و تحقیق			
۱	اقبالیات کی تلاش	پروفیسر عبدالقوی دسنوی	مظفر حنفی	۱۶
۲	کلاسکیت در روایت اور دوسرے مضامین	ڈاکٹر ام ہانی اشرف	سیدہ فاحسین	۱۷
۳	اسالوبی ادب (تحقیق و تجزیہ)	ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی	عمار علی ارشد	۱۸
۴	امام بخش صہبائی : شاعر، شارح	پروفیسر خواجہ محمد حامد	شعیب اعظمی	۱۹
۵	ہندستانی فارسی ادب	پروفیسر سید امیر حسن عابدی	مقبول احمد	۲۰
۶	مسافرۂ زنداں	اترپردیش اردو اکیڈمی۔ لکھنو	سیفی پریمی	۲۲
۷	ادب و نظر	ڈاکٹر افتخار احمد فخر	نازل عباسی	۲۳
۸	مرزا بیدل	ڈاکٹر بی بادی	کوثر چاند پوری	۲۴
۹	کامٹی کی ادبی تاریخ	ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل	عبداللطیف اعظمی	۲۵
۱۰	وجی اللہ صفا۔ حیات اور کارنامے	کبیر احمد جائسی	نذیر احمد	۲۶
۱۱	آزاد غزل، شناخت کی حدوں میں	علیم صبا نویدی	تنویر چشتی	۲۸
۱۲	شعری ضرب الامثال	شمس بدایونی	عبداللہ ولی بخش قادری	۲۹
۱۳	نشان منزل	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	مظفر حنفی	۳۰
۱۴	اردو افسانہ روایت اور مسائل	پروفیسر گوپی چند نارنگ	عبدالقوی دسنوی	۳۱
۱۵	میر تقی میر نمبر نقوش (لاہور)	محمد طفیل	عبدالقوی دسنوی	۳۲
۱۶	مشیر علی صدیقی شخصیت اور فن	ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی۔ ویریندر پرساد سکسینہ، شمس بدایونی	رام لعل	۳۴
۱۷	شفیع الدین نیر ایک مطالعہ	ڈاکٹر اطہر پرویز	عشرت صدیقی	۳۵
۱۸	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	ڈاکٹر عبیدہ بیگم	سیفی پریمی	۳۷
۱۹	سخنوران گجرات	سید ظہیر الدین مدنی	سیفی پریمی	۳۸
۲۰	اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا	ڈاکٹر ممتاز فاخرہ	سیفی پریمی	۳۹
۲۱	زندہ کتبے	عروج زیدی	سیفی پریمی	۴۰

		جائزے		۹
۵۵	شعور ادب	ادارہ مکتبہ جامعہ	اعجاز علی ارشد	۸۰
۵۶	الفاظ کا مزاج	غلام ربانی	ہارون ایوب	۸۱
۵۷	معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	اعجاز علی ارشد	۸۲
۵۸	کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	ہارون ایوب	۸۳
۵۹	ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	عبدالحی	۸۵
۶۰	معنویت کی تلاش	پروفیسر عنوان چشتی	مظفر حنفی	۸۷
۶۱	آتی جاتی لہریں	مظہر امام	ابو رصدیقی	۸۸
۶۲	شاعری اور شیوہ پیغمبری	صفدر	عبداللطیف اعظمی	۹۰
۶۳	شخص و عکس	حباب علی شاعر	مظفر حنفی	۹۲
۶۴	میر کی شعری لسانیات	قاضی افضال حسین	شمیم حنفی	۹۲
۶۵	آسان اردو	شکیل اختر فاروقی	شمیم حنفی	۹۳
۶۶	نقد ادبیات فارسی	ڈاکٹر صبیح الدین احمد	شمیم حنفی	۹۳
۶۷	رشید احمد صدیقی: آثار و اقدار	اصغر عباس	شمیم حنفی	۱۲
۶۸	یادگار سلیمان	پروفیسر عبدالقوی دسنوی	نثار احمد فاروقی	۹۱
۶۹	اقبال اور قرآن	ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں	خالد محمود	۹۵
۷۰	نواب صدیق حسن خاں	ڈاکٹر رضیہ حامد	خالد محمود	۹۶
۷۱	وضاحتی کتابیات (جلد دوم)	پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر مظفر حنفی	شمیم حنفی	۹۷
۷۲	نذیر احمد کی ناول نگاری	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد	اسمٰعیل حسن القرن	۹۸
۷۳	زبان اسلوب اور اسلوبیات	ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ	سیفی پریمی	۹۹
۷۴	محمد اقبال	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	مظفر حنفی	۱۰۰
۷۵	فن تاریخ گوئی	رئیس ہندو رودی	سیفی پریمی	۱۰۱
۷۶	ذکر حیات	صبا فتح آبادی	سیفی پریمی	۱۰۲

شاعری

۱	ذرات لہو	نسیم میرٹھی	سیفی پریمی	۱۰۴
۲	پدمنی	شرر فتح پوری	سیفی پریمی	۱۰۵
۳	آئینہ جذبات	نادر نادری ککرالوی	سیفی پریمی	۱۰۶
۴	نیم تراشیدہ صنم	جاوید اکرم	سیفی پریمی	۱۰۷
۵	باقیات شہباز	ڈاکٹر سید صابر حسن	سیفی پریمی	۱۰۹
۶	اردو گلدستہ	انور حسین انور	سیفی پریمی	۱۱۰
۷	شفق زار	ادم کرشن راحت	سیفی پریمی	۱۱۲
۸	آئینہ غزل	منزل لوہاٹھیری	سیفی پریمی	۱۱۳

فہرست

ناول اور افسانہ

جائزے

طنز و مزاح

سفرنامہ، سوانح عمری، مکاتیب وغیرہ

مذہبیات

بچوں کا ادب

		جائزے	
۳	دوست	شکنتلا کشواہا	سیفی پریمی
۴	نیلا ہیرا	ڈاکٹر مظفر حنفی	محمد یوسف پاپا
۵	بچو! آؤ گیت سنائیں	نذیر فتح پوری	محبوب راہی
۶	اردو شناسی	ڈاکٹر فضل امام	سید غلام مرتضیٰ
۷	اندرا گاندھی کی کہانی	شمیم حنفی	مظفر حنفی

متفرقات

۱	تاریخ کے آنچل میں	رفعت سروش	مظفر حنفی
۲	ماہنامہ اسباق (پونا)	حکیم رازی نذیر فتح پوری سید آصف	محبوب راہی
۳	ماہنامہ روشن (فانی بدایونی نمبر)	شمس بدایونی	مبشر علی صدیقی
۴	تاریخ ناگپور	ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل	اعجاز علی ارشد
۵	کیا انجیلیں قابلِ اعتبار ہیں	جان وائن گارڈس مترجم ایم ایچ ایم اور علی ناصری	خالد حامدی
۶	ہندستان کدھر	پروفیسر آل احمد سرور	اعجاز علی ارشد
۷	ہماری غذا	پروفیسر ایم این پوری اور پروفیسر اے این طیش	اندرجیت لال
۸	گلستان سائنس	خلیل انجم	اندرجیت لال
۹	تاریخ طب عربی (تاریخی جائزہ)	حکیم شاہ لور فیصل	اعجاز علی ارشد
۱۰	ایک سیاسی ڈائری	اثر بن یحییٰ انصاری	مشیر الحق
۱۱	انقلاب ۱۸۵۷ء (تصویر کا دوسرا رخ)	مترجم شیخ حسام الدین	سیفی پریمی
۱۲	ماہنامہ سبیل (گیا)	ڈاکٹر علیم اللہ حالی۔ جمیل منظر سہسرامی	خالد محمود
۱۳	قلم (میگزین)	الیاس شوقی	خالد محمود
۱۴	تاریخ اطبائے بہار (جلد دوم)	محمد اسرار الحق	شمشاد لکھنوی
۱۵	امنگ (میگزین)	عبدالحق خاں۔ خالد محمود	ولی شاہجہاں پوری

تنقید و تحقیق

اقبالیات کی تلاش

مصنف : پروفیسر عبدالقوی دسنوی
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
قیمت : پینتیس روپے

پروفیسر عبدالقوی دسنوی ان اصحاب میں سے ہیں جنھیں اپنی ذات سے ایک انجمن کہا جاتا ہے۔ سیفیہ کالج بھوپال کا شعبۂ اردو کہ بیشتر یونیورسٹیوں کے شعبوں سے بازی لے گیا ہے۔ تن تنہا قوی صاحب کے خون جگر کا پروردہ ہے۔ اردو کے بہت کم شعبوں سے لکھنے والوں کی اتنی بڑی تعداد تربیت پاکر نکلی ہے جتنی کہ سیفیہ کے شعبۂ اردو سے اپنے شاگردوں کے علمی ذوق کو جلا بخشنے اور تخلیقی جوہر کو ابھارنے کا جیسا سلیقہ قوی صاحب کو حاصل ہے خدا اردو کے تمام اساتذہ کو نصیب کرے ان اوصاف کے ساتھ پروفیسر دسنوی شانِ استغنا اور عالمانہ بے نیازی کے ساتھ گذشتہ تیس برسوں سے تحقیقی تنقیدی کاموں میں منہمک ہیں۔ دوسروں کا یہ عالم کہ ایک مختصر سا مقالہ چار چار سمیناروں میں خطبۂ صدارت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور قوی صاحب کا یہ حال کہ ہر سال ان کی ایک دو وقیع تصانیف منظرِ عام پر آجاتی ہیں چنانچہ ۱۹۵۴ء میں ان کی پہلی تحقیقی کاوش "ایک اور مشرقی کتب خانہ" کتابی شکل میں شائع ہوئی تھی اور ۱۹۸۵ء میں ان کی اٹھائیسویں کتاب "اقبالیات کی تلاش" چھپ کر نکلی ہے اور ان اٹھائیس کتابوں میں "حسرت کی سیاسی زندگی"، "بھوپال اور غالب"، "مہدی حسن افادی" اور "مطالعہ غبارِ خاطر" جیسی بلند پایہ تصانیف شامل ہیں۔

پروفیسر دسنوی نے "اقبال انیسویں صدی میں"، "بچوں کا اقبال"، "اقبال اور دلّی"، "علامہ اقبال بھوپال میں" اور "ہندستان میں اقبالیات" جیسی گرانقدر کتابیں لکھ کر ماہرین اقبالیات میں اپنے لیے ایک ممتاز مقام پہلے ہی بنالیا تھا۔ اب "اقبالیات کی تلاش" کے وسیلے سے ان کی یہ حیثیت مزید مستحکم ہو جائے گی۔

پیش نظر کتاب دراصل ان مضامین کا انتخاب ہے جو پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے مختلف اوقات میں اقبال کے فن اور شخصیت کے مختلف گوشوں پر قلم بند کیے تھے۔ تمام مضامین قبل ازیں ہند و پاک کے موقر علمی و ادبی جریدوں میں شائع ہو چکے تھے اور یکجا کتابی صورت میں سامنے آئے ہیں کتاب کا پہلا مضمون حیاتِ اقبال کے مختلف مدارج و مراحل کو واضح انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش ہے دوسرے مضمون میں اقبال کی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک کی نظم گوئی اور تیسرے میں ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے چوتھے مضمون میں بچوں کے لیے لکھی گئی اقبال کی نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچویں، چھٹے اور ساتویں مضمون میں بالترتیب بمبئی، علی گڑھ اور پانی پت سے اقبال کے تعلق کی روداد بیان کی گئی ہے۔ آٹھویں اور نویں مضمون میں اقبال کے ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور خواجہ حسن نظامی سے تعلقات کی نوعیتیں اجاگر کی گئی ہیں اور کتاب کے آخر میں کتابیات، کے تحت ان مآخذ کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے ان مضامین میں استفادہ کیا گیا ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

کلاسیکیت و رومانیت اور دوسرے مضامین

مصنفہ: ڈاکٹر ام ہانی اشرف
ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
قیمت: ۱۲ روپے

ڈاکٹر ام ہانی اشرف کے تنقیدی مضامین رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ مصنفہ نے کتاب کے شروع میں "چند باتیں" کے عنوان سے اپنی ادبی دلچسپیوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے ادب کا مطالعہ ایک قاری کی حیثیت سے کیا ہے اور اپنے "تاثرات کو تحریری شکل دی ہے۔ یہ مضامین اپنے موضوعات کے اعتبار سے متنوع ہیں۔ گو ان مضامین میں پختگی اور بصیرت کی سطحیں مختلف ہیں اور کہیں کہیں تو مشقی کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اپنے اکثر مضامین میں مصنفہ انہام و تفہیم کے عمل سے سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ گذری ہیں اور ان کے "تاثرات ایک تربیت یافتہ قاری کے تاثرات ہیں انھوں نے جا بجا اپنے فیصلے بھی دیے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی انھوں نے کسی اصول یا نظریے کے حلقہ بگوشی قبول نہیں کی ہے۔

قصیدہ" ڈاکٹر ام ہانی اشرف کا خاص موضوع ہے اور انھوں نے شمالی ہند کے قصائد کی فرہنگ پر ریسرچ بھی کی ہے۔ اس مجموعۂ مضامین میں غالب اور ذوق کے قصائد کے مطالعے شامل ہیں۔ توقع کی جا سکتی تھی کہ ان مطالعوں میں غالب اور ذوق کے قصائد کا سیر حاصل تنقیدی جائزہ ہوگا لیکن یہ دونوں مضامین کچھ تو اپنے اختصار کی وجہ سے اور کچھ غیر ضروری باتوں کی شمولیت کی بنا پر اس توقع کو پورا نہیں کر پاتے۔ خاص طور سے ذوق والے مضمون کو کتاب میں شامل کرتے وقت ایڈٹ (Edit) کرنا چاہیے تھا۔ سودا اور ذوق کا تقابل ضروری تھا لیکن اس تقابل کو مختصر کر کے ذوق کے قصائد کا ذکر اور تفصیل کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ دونوں مضامین کے وہ حصے بہتر ہیں جن میں تجزیاتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ غالب کے قصیدے "دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں" کی مشہور تشبیب کا مطالعہ کیا گیا ہے اور تراکیب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے لیکن اس تشبیب کی معنی آفرینی ایک مکمل مضمون کا تقاضا کرتی ہے۔

"ہجو نگاری کا فن اور سودا" ایک جامع مضمون ہے جس میں مصنفہ نے ہجو نگاری کا ایک معیار قائم کر کے اس پر سودا کو پرکھا ہے اور باوجود سودا کی ہجویات کی بعض خوبیوں کے اعتراف کے ان ہجویات کو ناقص پایا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ سودا کے "ہجویاتی نہج کے پس پشت کوئی ایسا حیات بخش فلسفہ نہیں جو قاری کو وقتی اور جمالیاتی آسودگی بخش سکے۔" ہمارے یہاں ہجو کی روایت تنفر بھی انداز میں اپنے غم و غصے کے اظہار کی رہی ہے۔ ہجو میں ادبی اوصاف تو ہو سکتے ہیں لیکن اسے کسی اہم شعری کارنامے کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ یہ سوال بحث طلب ہے کہ مغربی تنقید سے برآمد شدہ ہجو یہ شاعری کے معیار پر اردو کی ہجویہ شاعری کو پرکھنے میں ہم کہاں تک حق بجانب ہیں۔

حسرت کا طرزِ سخن، ایک نسبتاً طویل مضمون ہے۔ حسرت کی عشقیہ شاعری کو ان کی سب سے اچھی شاعری قرار دے کر کہا گیا ہے کہ حسرت نے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۶ء تک اپنی بہترین شاعری کی۔ مصنفہ حسرت کو اردو کے دوم درجے کے غزل گو شعرا میں ایک نمایاں اور بڑا شاعر مانتی ہیں ان واضح تنقیدی تعینات کے باوجود مضمون میں کچھ الجھاؤ ہے اور بعض ایسے مباحث درمیان میں آگئے ہیں جن سے بچا جا سکتا تھا۔ حسرت کی سیاسی شاعری کے ضمن میں یہ بڑی بصیرت افروز بات کہی گئی ہے کہ

"حسرت کی دلچسپی ملکی سیاست سے تھی نہ کہ سیاسی شاعری سے" اس کے علاوہ حسرت کے اس نظریے کی وضاحت میں کہ جذبات کی صحیح ترجمانی فاسقانہ غزل گوئی نہیں ہے، پرنسپل عبدالشکور کے انتخاب حسرت کے حوالے سے حسرت کے ایک غیر مطبوعہ مضمون کا ایک بہت اہم اور قابلِ قدر اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ کسی حد تک ناہموار ہونے کے باوجود یہ مضمون موضوع سے لکھنے والے کے شغف اور ایک لگن اور محنت کا مظہر ہے۔

اس مضمون کے پہلے دو مضامین 'نو کلاسیکیت اور رومانیت، اور ٹریوائن کمیڈی۔ ماخذ اور موضوع' اپنی نوعیت کے لحاظ سے معلوماتی ہیں جن کا مقصد مغرب کے بعض ادبی رجحانات اور تخلیقات کو اردو میں متعارف کرانا ہے۔ دونوں مضامین (خاص طور سے دانتے کی عظیم تخلیق کا تعارفی مطالعہ) بہت اچھے لکھے ہوئے ہیں۔ نو کلاسیکیت اور رومانیت زیادہ تر انگریزی شاعری تک محدود ہے لیکن مضمون کا سلجھا ہوا وضاحتی انداز قابلِ تعریف ہے۔ دانتے کی نظم کے ماخذات کے بارے میں یہ پتے کی بات کہی گئی ہے کہ یہ ماخذات شاعری میں منتقل ہوگئے ہیں۔ ایک اور معلوماتی قسم کا مضمون 'لغت اور فرہنگ' ہے جو اس کتاب کا سب سے لشتہ مضمون ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ام ہانی اشرف کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہے، ان کے تنقیدی مزاج میں متانت اور میانہ روی ہے اور وہ ادب کے اپنے مطالعہ کا حاصل اچھی وضاحتی نظر میں پیش کر سکتی ہیں۔ کہیں کہیں جو نومشقی اور تقلیدی روش کے آثار ہیں۔ یقین ہے کہ وہ ان کی آئندہ تحریروں میں معدوم ہو جائیں گے۔ ان کی یہ ابتدائی تنقیدی کاوشیں خاصی امید افزا ہیں۔

(سید وقار حسین)

افسانوی ادب

(تحقیق و تجزیہ)

مصنف: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
قیمت: تیس روپے

"افسانوی ادب"، ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر صدیقی نے داستانوں سے لے کر عہدِ حاضر تک کے افسانوی ادب کو ایک تاریخی تسلسل کے ساتھ پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کتاب کے بغور مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صدیقی کا مزاج تنقید کی بہ نسبت تحقیق کی طرف زیادہ مائل ہے۔ کل چودہ مضامین میں سے کم از کم سات

جن میں سے چار صرف رتن ناتھ سرشار سے متعلق ہیں، یقینی طور پر تحقیق کے زمرے میں آتے ہیں۔ خود تنقید نگار نے بھی پیش لفظ میں یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ مضامین ایک نامکمل کتاب کا حصہ ہیں اور تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ دیگر مضامین میں بھی تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق کے جلوے ملتے ہیں۔

اس کتاب کا جو حصہ میرے خیال سے اہم ہے وہ آخری چار مضامین پر مشتمل ہے "جدید افسانوی ادب اور ماضی کی تخلیقی بازیافت" ایک اہم موضوع ہے۔ اور بعض اہم تنقیدی آراء سے ناواقفیت یا چشم پوشی کے باوجود ڈاکٹر صدیقی نے اس موضوع پر محنت بھی کی ہے۔ اس لیے یہ مضمون معلوماتی بھی ہے اور مفید بھی۔ کرشن چندر کے مختلف افسانوں کے حوالوں سے ان کے ذہنی اور فنی سفر کا جو جائزہ لیا گیا ہے۔ وہ بھی کافی اہم ہے گرچہ اس میں مزید وسعت اور تنوع کی گنجائش تھی۔ البتہ "کرشن چندر اور انسان دوستی" سرسری طور پر لکھا گیا مضمون ہے جس میں مطالعے کی کمی نمایاں ہے۔ کرشن چندر کی انسان دوستی تسلیم شدہ سہی لیکن صرف ایک دو ناولوں اور افسانوں کے حوالے سے اس موضوع پر گفتگو کرنا اچھا نہیں لگتا۔ مجموعے کا آخری مضمون انتظار حسین سے متعلق ہے جس میں انتظار حسین کے افسانوں کی روشنی میں ان کی فکری اور فنی انفرادیت واضح کی گئی ہے۔ ان تمام مضامین کا انداز بیان تجزیاتی اور مدلل ہے اس لیے ابہام کی گنجائش بہت کم ہے اور بیشتر نکات واضح ہو جاتے ہیں۔ اسلوب میں بھی دلکشی ہے۔

کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے اور کتابت وطباعت عمدہ۔ اردو ادب کے باذوق قارئین کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ (ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

مصنف: پروفیسر خواجہ محمد حامد

امام بخش صہبائی شخص، شاعر، شارح

ملنے کا پتا: بزم غالب، کامٹی (مہاراشٹر)
قیمت: ڈی لکس اڈیشن ۴۰ روپے۔ عام اڈیشن ۳۰ روپے

انیسویں صدی کی ابتدا میں اردو ادب کے آسمان پر جتنے ستارے آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے ان میں شیخ امام بخش صہبائی، کا نام کسے یاد نہیں اور ان کی خدمات جلیلہ کی تفصیل اردو ادب اور شاعری کے کس طالب علم کو معلوم نہیں۔ ہاں یہ بات ہے کہ صہبائی کو وہ مقام نہیں دیا جا سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ باکمال علما ادبا اور شعرائے وقت اور امرائے زمانہ کی کون سی ایسی صحبت تھی جس میں صہبائی حاضر نہ ہوتے ہوں اور دوسروں سے فیض یاب ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو مستفید نہ کیا ہو۔ اس وقت کی دہلی میں صہبائی کو جہاں ایک طرف مفتی صدرالدین خاں آزردہ، ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیر، ذوق، مومن، غالب، ممنون، مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے مقتدر اور یگانہ روزگار حضرات کا قرب حاصل تھا وہیں دوسری جانب دہلی کالج کی ملازمت کے سلسلے میں وہاں کے انگریز پرنسپلوں اور ہندستان کے چیدہ اساتذہ کے ساتھ مل کر جدید علوم، تہذیب اور طور طریقوں کو سیکھنے اور استفادہ کرنے کا بہترین موقع بھی

حاصل ہوا چنانچہ وہ اس انحطاطی دور کے محقق، مصنف اور شاعر اور دہلی کالج کے اساتذہ کی صف اول میں شمار ہوتے۔

صہبائی ایک عہد تھے، ایک تہذیب تھے۔ چنانچہ ان کی شہادت کے ماتم نامے اور تعزیت نامے راشد الخیری، اکبر الٰہ آبادی اور سر سید احمد خاں کی نثر و نظم میں گواہی دیتے ہیں۔ غدر کی کہانی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ صہبائی گوروں کے ہاتھوں کیسی اذیت کا شکار ہوئے تھے مصلی سے اٹھا کر دریا کنارے مشکیں کس کے لاتے گئے اور گولیوں سے بھون دیے گئے لیکن ان کی تقریظیں شرحیں صرف و نحو اور صنفِ شعر ہیں مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ مخمس وغیرہ اور منظوم رسائل ایسی شاندار اور دوامی یادگاریں ہیں جنھیں ادب و شعر کی محفل میں ہمیشہ عزیز رکھا جائے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد حامد نے یہ سب تمام تفصیلات اپنی تصنیف "امام بخش صہبائی، شخص، شاعر، شارح" میں یکجا کر دی ہیں۔ ہر موضوع کو تحقیقی، علمی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے ہی نہیں دیکھا ہے بلکہ مشاہیر اہلِ قلم، مستند حوالوں، قابلِ ذکر تذکروں اور اشعار و اقوال سے زیادہ سے زیادہ موثر اور دلچسپ بنایا ہے اور ہر طرح سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ امام بخش صہبائی ایک مکمل انسان، ایک قادر الکلام شاعر اور ایک دقاق شاعر تھے۔ شاعری میں اساتذہ سے تلمذ، قدما کی پیروی اور پھر خود اپنا ایک منفرد انداز اور اسلوب اختیار کر لینے کے بعد مجموعی حیثیت سے اردو اور فارسی شاعری میں اپنا ایک مستقل مقام بنا گئے مگر ان سب کے باوجود انھیں غالب اور ذوق کی شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ پروفیسر خواجہ محمد حامد نے اس کے اسباب اور نتائج سے بھی بھرپور بحث کی ہے۔

اس کتاب کی کئی خصوصیات ہیں۔ فارسی ادبیات ہندستان میں کن مراحل سے گذری اور اس کے انحطاطی دور میں اردو زبان و ادب کس طرح پنپا، شروع کے ادیبوں اور شاعروں نے کس طرح فارسی اور اردو زبان، ادب اور شعر کی خدمت کی اور خاص طور سے صہبائی نے اس میدان میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیے؟ فاضل مصنف اس سے بدرجہ اتم عہدہ برآ ہوئے اور باخبر ہیں اور کتاب کے پڑھنے والوں کو ان تمام موضوعات کی تفصیل سے آشنا کرایا ہے۔ اس کتاب کی ایک نمایاں خوبی اس کے حواشی ہیں جو تعلیقات کا درجہ رکھتے ہیں اور اسی بنا پر اس کتاب کی قدر و قیمت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

فارسی اور اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے "امام بخش صہبائی شخص شاعر شارح" مفید معلومات کا ذخیرہ ثابت ہوگی اور امید ہے کہ اس سے اہلِ ذوق کو تسکین بھی ہوگی (شعیب اعظمی)

ہندستانی فارسی ادب

مصنف: پروفیسر سید امیر حسن عابدی
ناشر: انڈو پرشین سوسائٹی ۱۸۲۸، لال کنواں دہلی
قیمت: ۴۰ روپے

پروفیسر سید امیر حسن عابدی صاحب تقریباً ۴۰ برس سے دہلی یونی ورسٹی میں فارسی زبان و

ادب کی درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ آپ عرصہ دراز سے فارسی ادب اور خاص طور سے ہندستانی فارسی ادب کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی اور ادبی مقالات لکھ رہے ہیں۔ یہ مقالات ہندستان اور دیگر ممالک کے اہم مجلات میں شائع ہوتے اور اہل نظر حضرات سے داد تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔ عابدی صاحب کے ایک لائق شاگرد ڈاکٹر شریف حسین قاسمی ریڈر شعبۂ فارسی، دہلی یونی ورسٹی نے آپ کے ۱۳ مضامین اس کتاب میں شائع کیے ہیں۔ ڈاکٹر قاسمی نے پروفیسر عابدی صاحب کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا اپنے مقدمے میں مختصر جائزہ لیا ہے اور اس کتاب میں شامل مضامین پر اجمالی مگر جامع تبصرہ کیا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کی تفصیل یہ ہے:

فارسی زبان و ادب کی ترویج و توسیع میں ہندستان کا حصہ، شاہ نامۂ فردوسی اور ہندستان، دوسری زبانوں سے فارسی میں تراجم، حیاتی گیلانی اور تغلق نامہ، عہد ہمایوں و اکبر کی دو اردو غزلیں، کالی شیرازی، نوعی خبوشانی، کلیات ساعی، پنڈت زندہ رام موبد کشمیری، نظیر اکبرآبادی اور سبک ہندی، جلیس المشتاق، ایران کا سماجی اور انقلابی ادب، ایران کا بنیاد گزار شعر نو، افغانستان و ہند۔

پروفیسر عابدی صاحب کے ان مضامین کے مطالعے سے ڈاکٹر قاسمی کا یہ عقیدہ درست ثابت ہوتا ہے کہ: "پروفیسر عابدی صاحب کے مقالات سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی بیشتر توجہ ہندستانی فارسی زبان و ادب کی طرف مبذول کی ہے۔ اس ادب کی گوناگوں خصوصیات کو اجاگر کرنا اور اس کی وسعت، گہرائی، اور گیرائی کو واضح کرنا آپ کی علمی اور تحقیقی جدوجہد کا مقصد رہا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ پروفیسر عابدی صاحب کے مقالات کا یہ انتخاب فارسی کے طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ اردو داں فارسی دوست حضرات کے لیے بھی اہم اور مفید ثابت ہوگا۔ ہر مقالے میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو زیر بحث آیا ہے کہ دوسرے ذرائع سے مفصل روشنی نہیں پڑتی۔ فارسی ادب پر مزید کام کرنے کے لیے یہ مقالے راہ نما ثابت ہوں گے۔

ڈاکٹر قاسمی نے پروفیسر عابدی صاحب کے ایک مقالے "دوسری زبانوں سے فارسی میں تراجم" پر تبصرہ کرتے ہوئے عابدی صاحب کی تحقیقی کوششوں اور ہندستانی فارسی ادب کے ایک مقصد کی طرف بڑی خوبی سے اشارہ کیا ہے کہ: اس مضمون سے ایک اہم نکتے کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں ہند اسلامی اور ہند ایرانی تہذیب کی تشکیل میں فارسی شعرا و ادبا نے نمایاں اور اہم کوششیں انجام دی ہیں۔ اہل نظر اس بات سے متفق ہیں کہ جمہوری اور سیکولر ہندستان کی بقا کا انحصار ہماری گنگا جمنی تہذیب پر ہے۔ اس گنگا جمنی تہذیب کی ابتدا، تشکیل اور اس کی ترویج کی تاریخ مرتب کرنے میں ہندستانی فارسی ادب نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ سنسکرت میں مذہبی اور تہذیبی آثار کو فارسی میں منتقل کرنے کا جذبہ ہماری اسی گنگا جمنی تہذیب کا جنم داتا ہے۔ ڈاکٹر قاسمی نے پروفیسر عابدی صاحب کے یہ مقالات شائع کر کے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ امید ہے کہ وہ اپنے استاد گرامی کے

کے دیگر مضامین بھی شائع کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ کتاب کی قیمت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب کتابت وطباعت کافی گراں ہوگئی ہے۔ (ڈاکٹر سید مقبول احمد)

مشاعرۂ زندان

مرتب وناشر: اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ

قیمت: چار روپے پچاس پیسے

"تحریک آزادی ہند" اس صدی کی عجیب وغریب تاریخی دستاویز ہے جس میں کاروان شوق کا نغمہ بھی ہے اور طوق وسلاسل کی جھنکار بھی۔ صلیب بھی ہے اور کامرانی کا پرچم بھی۔ خطابت بھی ہے اور شاعری بھی۔

اردو اکاڈمی لکھنؤ کی زیرِ نظر تصنیف "مشاعرۂ زنداں" ایک نادرہ کار اشاعت ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی کے "پیش لفظ" نے اس کی قدر وقیمت کو بڑھا دیا ہے۔ قاری کو بہشت گم شدہ کی بازیابی کا سامان فراہم کیا ہے۔

بہت کم لوگوں کو یہ علم ہوگا کہ آگرہ ڈسٹرکٹ جیل میں آزادی کے پرستاروں نے ۱۹۲۲ء میں مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ "پیش لفظ" کا یہ اقتباس بعض ناقدین کے لیے شمع ہدایت ہے۔

آگرہ جیل کے ان مشاعروں کی آج یوں بھی اہمیت ہے کہ فراق گورکھپوری کی شناخت یہیں ہوئی اور ان کا ابتدائی کلام انھیں مشاعروں سے دستیاب ہوا۔ آگرہ ڈسٹرکٹ جیل کے مشاعروں میں جو کلام انھوں نے سنایا تھا وہ ۱۹۲۲ء کے بعض اخبارات میں شائع ہو چکا تھا۔"

مشاعرے کی روداد اخبار زمیندار لاہور سے حاصل کی گئی ہے۔

پہلا مشاعرہ (۲۳ر فروری ۱۹۲۲ء) دوسرا مشاعرہ (۴ر فروری ۱۹۲۲ء) تیسرا مشاعرہ (۳ر مارچ ۱۹۲۲ء) اور چوتھا مشاعرہ (۴ر مئی ۱۹۲۲ء کو منعقد ہوا) مشاعرے طرحی ہوتے تھے۔ کبھی کبھی دو مصرع طرح تجویز کیے جاتے تھے۔ ان مشاعروں میں شریک شعرا میں سے چند نام:

مولانا نذیر احمد خجندی میرٹھی، خواجہ عبدالمجید شیدا، شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ فراق گورکھپوری، پنڈت کرشن کانت مالوی، مہابیر تیاگی، رتن لال زمرد، حفیظ فرخ آبادی، احمق پھپھوندوی، مولانا عارف ہسوی، پنڈت دیا شنکر گنجور، حافظ محمد عثمان علی گڑھ، کشور بہاری ماتھر، شاہد حسن الہ آبادی، اندرجی ورما علی گڑھ، عبدالمجید الہ آبادی، اطہر مارہروی، شاہ حفیظ عالم جنیدی۔ عزیز احمد زبیری مارہروی وغیرہ۔

"مشاعرۂ زنداں" سے اردو زبان کی تنفیذی کشش، اتحاد، جذبہ حریت اور آزادی وطن کے جاں نثاروں کی تاریخ کا ایک اہم باب مرتب ہوتا ہے۔ مشاعرے اور وطن سے لگن رکھنے والوں کو "مشاعرۂ زنداں" کا مطالعہ لازمی ہے۔ کتاب صاف ستھری ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

ادب و نظر

مصنف: ڈاکٹر افتخار احمد فخر
پتا: جمیل اصغر باہتمام ناظمہ پبلیکیشنز ۲۵۳۲ مادھوپور دھولیہ
قیمت: بارہ روپے

زیر نظر کتاب مصنف کے ۹ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جن کے منجملہ چار مضامین غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ مضامین جگر مرادآبادی، ریاض خیرآبادی، حنیف کریمی اور سلام سندیلوی کی شاعری اور شعری مزاج کے متعلق ہیں۔ آخری مضمون اردو غزل کے جدید رجحانات" سے متعلق ہے۔ مختصر یہ کہ اس کتاب میں اردو ادب" پر غزل کے پس منظر میں 'نظر' ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمام ہی مضامین غزل اور غزل گو شعرا کے متعلق ہیں لیکن ادب صرف شاعری یا غزل ہی پر تو موقوف نہیں ہے جیسا کہ "ٹائٹل سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مضامین بقول مصنف ہندستان اور پاکستان کے متعدد رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

ان مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے توسط سے بعض شعرا کے سوانحی اور شخصی خاکے ان کے ماحول کے پس منظر میں سامنے آتے ہیں جن کی مدد سے انھیں سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر افتخار کی کاوشیں اگرچہ کہ تفہیم کے مناظر میں کمزور ہیں لیکن تحقیق اور جستجو نے اردو ادب کے قاری یا طالب علم کے لیے تفہیم کے راستے متعین کر دیے ہیں پھر بھی غالب کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ مصنف نے اپنے چار مضامین میں جو کچھ کہا ہے ان سے کوئی نتیجہ خیز بات سامنے نہیں آتی اور مصنف کے مضامین "تنویر چراغ دیگراں" سے آگے کی منزلیں طے نہیں کرتے۔

جگر مرادآبادی کی شخصیت پر جو اثرات شاہ عبدالغنی اور اصغر گونڈوی کے رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں ان اثرات کے تحت ایک نمایاں تبدیلی بھی پیدا ہوئی اور زمانے کی تبدیلیوں اور نشیب و فراز سے جگر نے ساز باز کرنے کا سلیقہ بھی سیکھا۔ مصنف نے ان کی شاعری اور شخصیت سے جو نقاب اٹھائے ہیں اور جن تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے وہ جگر کی فعال طبیعت کی بھی غماز ہے۔

زبان اور ادب کا رشتہ شاعری کے آرٹ میں پائندہ ہوتا ہے۔ لفظوں کے پرے مفہوم کی ایک 'قطار' استعاروں کی اور علامتوں کا ایک ہجوم اس کے حسن کو ہمیشہ برقرار رکھتا ہے۔ جب کہ مصنف نے ریاض خیرآبادی کے آرٹ کو 'کل' کا آرٹ کہا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا آرٹ 'آج' متروک سمجھا جاتا ہے اور اسے سمجھنے کے لیے ہمیں اسی عہد یا زمانے میں خود کو تصور کرنا چاہیے لیکن ریاض کا یہ شعر آج بھی زندہ ہے اور آج کی زبان کا شعر ہے ؎

عالم ہو میں اک آواز سی آجاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

حنیف کریمی کی شاعری اور سلام سندیلوی کی کتاب "نکہت و نور" پر جو مضامین شامل کتاب ہیں۔ ان میں حنیف کریمی کی شاعری سے متعلقہ مضمون سے سماجی اور نشریحی تنقید کا

نمونہ ہے۔ اگر مصنف یہی طریقہ کار جگر اور ریاض کی شاعری کے لیے اختیار کرتا تو ممکن ہے کہ ان کی نظر کی وسعت اور تجزیے کی متانت کا سراغ مل سکتا۔ جب کہ سلام سندیلوی کی کتاب "نکہت و نور کے متعلق مصنف نے تجزیاتی انداز میں تاثراتی تنقید پیش کی ہے اور حوصلہ افزا نتائج برآمد کیے ہیں۔

"اردو غزل کے جدید رجحانات" کے متعلق مصنف نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ تمہید سے زیادہ نہیں ہے کہ اردو شاعری کے معماروں کے آگے کا تذکرہ کرنے کے بعد جدید شاعری کے رجحانات کے متعلق کوئی بات نہیں کہی گئی۔ صرف پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ (بازل عباسی)

مرزا بیدل

مصنف: ڈاکٹر نبی ہادی
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اور مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی
قیمت: ۳۱ روپے

مرزا بیدل بلند پایہ شاعر اور فارسی کے مشہور نثر نگار تھے۔ ابتدائی تخلص رمزی تھا سفینہ خوش گو اور سحرِ عشق میں یہی تخلص اختیار کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ باغ کی سیر کر رہے تھے کہ یہ مصرع نظر سے گزرا۔

بیدل از بے نشاں چہ گوید باز

اسی وقت تخلص تبدیل کر کے بیدل اختیار کیا۔

(دیدۂ بینا از کوثر چاندپوری صفحہ ۱۸۷)

کتاب زیر تبصرہ مرزا کے سوانح حیات کلام نیز تنقید کلام اور انتخاب اشعار پر مشتمل ہے ایسے عظیم القدر سخن ور پر یہ کتاب لکھ کر ڈاکٹر نبی ہادی نے اپنے علم و دانش اور منصب لطیف کا بہترین ثبوت دیا ہے مرزا نہایت ذہین اور شروع ہی سے موزوں طبع تھے۔ سات سال کی عمر میں ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ اس اندوہ ناک سانحے سے متاثر ہو کر مرزا نے کچھ اشعار موزوں کیے تھے۔ ان میں ایک یہ ہے۔

خورشید فرا ید و فروغ بہ نظر ماند
دریا بکنار دگر افتاد و گہر ماند (دیدۂ بینا)

موزونیٔ طبع کے ساتھ ہی وہ حسن پرستی کا مذاق بھی رکھتے تھے۔ مدرسے میں ایک لڑکا قریب بیٹھتا تھا وہ منہ میں لونگ رکھنے کا عادی تھا خوشبو مرزا کو بھی آیا کرتی تھی۔ انھوں نے اس رباعی میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یارم ہر گاہ در سخن می آید — بوئے عجبے کہ از دہن می آید
ایں بوئے قرنفل است یا نکہت گل — یا رائحہ مشک ختن می آید

(دیدۂ بینا صفحہ ۱۸۶)

ڈاکٹر نبی احمد نے مرزا کے سوانح تفصیل سے لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی واردات حیات کا

صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ کلام پر جو تنقید کی گئی ہے اس سے ان کی سخن شناسی اور وسعتِ نگاہ کا ثبوت ملتا ہے انتخاب کلام میں بھی دیدہ وری جھلکتی ہے کتاب کو اول سے آخر تک پڑھنے کے بعد شعور میں ایک لفظ کھٹکتا رہا۔ شہزادہ معظم صوبہ دار کابل اورنگ زیب کی وفات کے بعد تختِ دہلی پر متمکن ہونے کی غرض سے بزرگوں کے مزارات پر دعائیں کرتا اور آگرے سے روانہ ہونے سے پہلے ہی بے دریغ روپیا لٹاتا دہلی کی جانب گامزن رہا۔

ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت تو نہیں ہے کہ شہزادے کی نذر و نیاز سے

"کچھ بیدل کی مٹھی بھی گرم ہوئی (صفحہ ۴۴)

مٹھی گرم ہونا اردو کا مشہور محاورہ ہے لیکن ایسی علمی و ادبی کتاب کے لیے موزوں نہیں بیدل شاعر بھی تھے اور صوفی بھی اس کے باوجود ان کی فطرت میں جنگ جوئی اور مدافعت کا جذبہ بھی تھا۔ اس روز وہ نظام الملک آصف جاہ کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ نواب حسن علی خاں کا قاتل محمد امین خاں بھی آگیا اس نے یہ دیکھ کر کہ نواب کے پاس بغیر داڑھی مونچھ کا قلندر بیٹھا ہوا ہے۔ پوچھا

کون ہے؟

نواب نے جواب دیا مرزا بیدل، محمد امین خاں نے کراہت کے ساتھ کہا کہ داڑھی مونچھ منڈا رکھی ہے کیا اسی کا نام درویشی ہے محمد امین خاں آصف جاہ کا عزیز تھا اور ان کے دکن جانے کے بعد وزیر بھی ہو گیا تھا اس کے باوجود مرزا نے پوری بیباکی سے کہا۔

ریش خود را تراشیدہ ام دل کسے را نخراشیدہ

محمد امین اس طنزیہ اشارے پر بگڑ گیا اور خنجر پر ہاتھ ڈالا مرزا طاقت ور اور تنومند آدمی تھے انھوں نے بھی مکہ تان لیا آصف جاہ نے درمیان میں پڑ کر صلح کرا دی اور مرزا کی بڑی دلجوئی کی۔ (دیدۂ بینا بحوالہ تذکرہ حسینی صفحہ ۵۷)

کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ طباعت و کتابت اور کاغذ بہت عمدہ ہے۔ یقین ہے کتاب مقبولیت حاصل کرے گی اور ڈاکٹر نبی ہادی کی اس کوشش کو سراہا جائے گا۔ قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ (کوثر چاند پوری)

کامٹی کی ادبی تاریخ

مصنف: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
ناشر: بزم غالب۔ کامٹی (ضلع ناگپور)
قیمت: ۲۵ روپے

زیر تبصرہ کتاب میں جن ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہے، ان میں بچوں کے ادیب اور جامعہ کے سابقہ استاد جناب مولوی محمد حفیظ الدین صاحب بھی شامل ہیں، جن کا ابھی حال میں ۱۰ اگست کو ناگپور سے کچھ فاصلے پر تسر (ضلع بھنڈارہ) میں انتقال ہو گیا۔ دوسرے روز ان کے وطن کامٹی میں ان کو سپردِ خاک کیا گیا۔ کتاب کے مصنف مرحوم سے بہت قریب تھے،

اس لیے امید ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں ان کے جو حالات لکھے ہیں، مرحوم سے براہِ راست معلوم کر لیے ہوں گے اور وہ یقیناً صحیح اور مستند ہوں گے، مگر سنہ پیدائش کے متعلق میرا خیال ہے کہ شاید وہ صحیح نہیں ہے۔ اس کتاب میں سالِ پیدائش ۱۲ر فروری ۱۹۰۳ء درج ہے اور ساہتیہ اکیڈمی (دہلی) کی Who is Who of Indian Literature مطبوعہ ۱۹۶۱ء کے مطابق سالِ پیدائش ۱۹۰۵ء ہے (صفحہ ۱۲۶) میرے خیال میں یہی صحیح ہے۔ ایک اور سنہ کی صحت کے بارے میں مجھے شبہ ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مرحوم نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مصر جانے کی کوشش کی اور اس غرض سے بمبئی تشریف لے گئے مگر بہ وجوہ وہ مصر نہ جا سکے۔ اس لیے کچھ عرصے تک وہیں مقیم رہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں بمبئی جانے کی تاریخ درج نہیں ہے، مگر بمبئی کے دورانِ قیام کا سنہ ۱۹۲۱ء لکھا ہے۔ فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ: "انھوں نے بمبئی میں کچھ عرصے روزنامہ 'خلافت' میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا، بعد کو وہیں سے ۱۹۲۱ء میں ہفتہ وار "جمہور" مصور جاری کیا جو آٹھ مہینے تک نکلتا رہا۔" اگر موصوف نے یہ ہفتہ وار اخبار اسی زمانے میں جاری کیا تھا تب وہ مصر کے لیے بمبئی تشریف لے گئے تھے۔ یہ سنہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ مصر کے لیے پاسپورٹ کے اجراء کی تاریخ ۸ر اگست ۱۹۲۸ء ہے، اس کے مطابق بمبئی میں مرحوم کا مختصر قیام ۱۹۲۸ء میں ہو سکتا ہے اور غالباً اس کے بعد ہی وہ جامعہ ملیہ تشریف لائے اور درجۂ خاص میں داخلہ لیا۔

فاضل مصنف نے بہت اچھا کیا کہ اپنی اس کتاب کو جناب محمد ظہیر وارثی صاحب کے نام نامی سے منسوب کیا جو کامٹی کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے روحِ رواں ہیں اور مصنف کے الفاظ میں "کامٹی کی ادبی تاریخ کا سرچشمہ ہیں۔"

بہر حال ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل نے یہ کتاب لکھ کر اور کامٹی کی فعال سوسائٹی "بزمِ غالب" نے اسے شائع کر کے ایک مفید خدمت انجام دی ہے، امید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں یہ کتاب پسند کی جائے گی اور مقبول ہو گی۔

(عبداللطیف اعظمی)

ذبیح اللہ صفا — حیات اور کارنامے

مصنف: کبیر احمد جائسی
ناشر: ترقی اردو بیورو دہلی
قیمت: بارہ روپے

یہ ایک کتابچہ ہے جو ڈاکٹر کبیر احمد جائسی ریڈر شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ اس میں تین مطالعے ہیں پہلا "نقشِ حیات" کے نام سے جس میں ڈاکٹر صفا کی ابتدائی زندگی سے لے کر ان کے علمی کارناموں تک کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور آخر میں ان کی کتابوں کی مکمل فہرست شامل ہے۔ دوسرے مطالعے کے تحت ڈاکٹر صفا کی مشہور کتاب "حماسہ سرائی در ایران" پر تفصیلی ریویو اور تیسرے مطالعے کے ذیل میں ان کی کتاب "تاریخ ادبیات در ایران" کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ راقم نے ڈاکٹر صفا کو بہت قریب سے دیکھا ہے بلکہ ۱۹۵۵ء میں تقریباً ۵ ماہ تک ان کے محضر شریف سے بطور ایک دانش جو کے استفادہ بھی کیا ہے

وہ ایران کے موجودہ دانش وروں میں سب سے بلند درجہ پر فائز ہیں۔ ان کی شخصیت گوناگوں صفات کی حامل ہے، وہ بلند پایہ مورخ ادب وزبان ہیں۔ اعلا درجے کے نقاد اور مورخ بھی، ایک شفیق استاد، خلیق دوست اور منکسر المزاج انسان ہیں، ان کے اساتذہ میں فروزانفر تھے جن کی شخصیت کا ان پر گہرا اثر ہے۔ اور اس طرح وہ علمی روایت جو قزوینی، بہار، دہخدا اور فروزانفر کی قائم کردہ تھی، اب بھی کسی نہ کسی درجے میں باقی ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ جانسی صاحب کے کتابچے کے تین ابواب ہیں پہلے باب میں ان کی زندگی کا مختصر خاکہ ہے اور ان کی کتابوں کی ایک جامع فہرست۔ ضرورت تھی کہ ان کتابوں کا ذرا تعارف ہو جاتا تو زیادہ مفید ہوتا۔ اس باب میں اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ ڈاکٹر صفا کی فکری صلاحیتوں کا ذکر ان خطوط پر ہوتا، صفا بہ حیثیت مورخ، بہ حیثیت محقق، بہ حیثیت ناقد اور بہ حیثیت انشا پرداز، ڈاکٹر صفا کی علمی زندگی کے یہی چار نمایاں پہلو ہیں۔ غالباً کتاب کا حجم ڈاکٹر صفا کی زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں مانع رہا ہوگا۔

جانسی صاحب کا دوسرا مقالہ حماسہ سرائی پر ہے اس میں جانسی صاحب نے جس عالمانہ اور مبصرانہ انداز میں اس کتاب پر نظر ڈالی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر صفا کی صلاحیت کے پرکھنے میں انھوں نے اپنی نقادی کا بڑا اچھا ثبوت فراہم کیا ہے میری نظر میں حماسہ سرائی پر اس سے اچھا تبصرہ نہیں ہو سکتا۔

جانسی صاحب کا تیسرا مقالہ ڈاکٹر صفا کی کتاب "تاریخ ادبیات در ایران" پر ہے۔ ڈاکٹر جانسی نے تاریخ ادب کے، ان تقاضوں کو جو ڈاکٹر صفا کی کتاب میں اجمالاً بیان ہوتے تھے۔ انتقاد کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ چوں کہ ڈاکٹر صفا کی کتاب انتقاد کی کسوٹی پر پوری اتری اسی وجہ سے جانسی صاحب مصنف سے بے حد متاثر معلوم ہوتے ہیں اور یہ بالکل فطری بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صفا کی کتاب سوائے اس کے کہ اس میں شعرا کے کلام پر تبصرہ کی کمی محسوس ہوتی ہے ہر طرح کی صفات سے متصف ہے۔

ڈاکٹر جانسی نے صفا صاحب پر یہ کتابچہ لکھ کر نہایت مفید علمی خدمت انجام دی ہے۔ اس سے چند در چند فوائد منصور ہیں۔

۱۔ ایک ایرانی عالم اور دانش ور کی شخصیت سامنے آئی اس سے یہ معلوم ہوا کہ اُن پر ابھی اور بہت سا کام کرنا ہے کیوں کہ ان کی متعدد تصانیف نقد و تبصرہ چاہتی ہیں۔

۲۔ ان کے متقدمین اور معاصرین کے علمی کارناموں کا مطالعہ ہمارے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ ایرانیوں اور ہندستانیوں میں تہذیبی، علمی اور لسانی اعتبار سے بہت سی چیزیں مشترک یا مماثل ہیں اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے افکار و خیالات سے بڑی حد تک بے گانے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ فارسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوتا ہے اور نہ اردو کتابوں کا فارسی میں اور نہ ہندستان کے علما اور دانش وروں پر ایران میں کتابیں لکھی جاتی ہیں نہ ایران کے علما و فضلا ہماری توجہ کا مرکز بنتے ہیں؟ جانسی صاحب کی یہ کتاب کسی

حد تک اس خلا کو پورا کرتی ہے۔
۳۔ فارسی اور اردو کے لسانی، تہذیبی، ادبی اور تاریخی مسائل میں بڑی مماثلت ہے۔ ان کا گہرا شعور اردو کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے میں مفید ہو سکتا ہے۔ جالسی صاحب کی کتاب کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی بے حد مفید ہے۔
۴۔ قدیم ایران سے ہمارا رشتہ کافی استوار رہا ہے۔ اس دور کی ہزاروں تلمیحات، استعارات ہماری شاعری اردو ادب کا جز و بن چکی ہیں۔ چنانچہ غالب کے وہاں قدیم ایران ایک اہم موضوع کی حیثیت سے نمایاں ہوتا ہے، اوستا، زند، پازند، نسک وغیرہ کے ذکر سے غالب کی تحریریں پر ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عظیم شاعر اور ادیب کو قدیم ایران کے تاریخی دلچسپی تھی لیکن غالب سے جذباتی لگاؤ کے باوجود ہم اس طرف کبھی متوجہ نہ ہوتے اور حق بات تو یہ ہے کہ اسی عدم توجہی کا نتیجہ ہے کہ ہم غالب کی تحریروں کو سمجھنے اور پرکھنے سے قاصر ہیں جالسی صاحب نے حاسہ سرائی پر نقد و تبصرہ میں جس طرح قدیم ایران کے تاریخی حقایق پر روشنی ڈالی ہے وہ غالب کے اقوال کو جانچنے اور پرکھنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔
جالسی صاحب کی کتاب مختصر ہے لیکن اختصار کے باوجود یہ جتنی مفید ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس کا بغور مطالعہ کریں گے میرے نزدیک فارسی اور اردو کے ہر طالب علم کے لیے جو ادبی اور تاریخی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس کا مطالعہ ناگزیر ہے اگر یہ کتاب فارسی میں ترجمہ ہو جائے تو ایرانی اہل علم کو بھی اس سے استفادہ کا موقع ملے گا۔ میں جالسی صاحب اور ترقی اردو بیورو دونوں کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ (نذیر احمد)

آزاد غزل: شناخت کی حدوں میں

مرتب: علیم صبا نویدی
ناشر: انجمن مصنفین اردو۔ تامل ناڈو۔ مدراس
قیمت: پچاس روپے

اردو شاعری میں تجربوں کی رفتار تیز سے تیز تر ہو رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بہت سے نئے ادیب اور شاعروں نے شاعری کے اہم تقاضوں سے صرف نظر کر کے محض تجربہ پسندی پر اکتفا کیا ہے روایت پرستی جتنی بری چیز ہے، تجربہ برائے تجربہ اس سے بری بات ہے۔ پھر بھی اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ اس عمل سے ہیئت کے جبر سے انحراف کا حوصلہ ملتا ہے۔ گزشتہ دنوں ماہنامہ سباق پونا کا سالِ اول میں نمبر شائع ہوا تھا اس میں آزاد غزل پر مضامین کے ساتھ آزاد غزلیں بھی شامل تھیں۔ ابھی ابھی ماہ نامہ "شاعر" بمبئی کا آزاد غزل اور نثری نظم نمبر شائع ہوا ہے۔ یہ نمبر ہر اعتبار سے اس موضوع پر ایک مکمل دستاویز ہے۔ جس میں تمام مطبوعہ مضامین کو یک جا کیا گیا ہے اور نئے مضامین کے ساتھ آزاد غزلوں کا ایک وافر ذخیرہ شائع کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں بعض مطبوعہ مضامین مثلاً آزاد غزل میری نظر میں از کرامت علی کرامت۔ طرز کہن پہ اڑنا از سلیم اختر، آزاد غزل ایک تجزیہ از عنوان چشتی اور چند دیگر مضامین شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین مطبوعہ ہیں

جنھیں یک جا کر کے شائع کرنے میں کسی ترتیب اور سلیقہ کا ثبوت نہیں دیا گیا ہے۔ کتاب کا سائز ۳۰×۲۰/۱۶ ہے صفحات ۲۸۸ ہیں۔ کتابت و طباعت بہت خراب ہے۔ اسی صورت میں اس کتاب کی قیمت پچاس روپے کا کوئی جواز نہیں۔ اس کتاب کے شائع کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نظر نہیں آتا کہ مرتب نے کتاب کے آخر میں ہر اس جملہ کو شامل کر دیا ہے جو ان کی مدح میں ہے۔

(تنویر چشتی)

شعری ضرب الامثال

مرتبہ: شمس بدایونی
ناشر: روشن پبلی کیشنز، روشن محل، محلہ سوتھا بدایوں
قیمت: ۱۵ روپے

ایک یا چند جملے جو مدت سے کسی خاص موقعے پر مثال کے طور پر بولے جاتے ہیں اور اپنے لفظی معنی سے ہٹ کر کچھ اور معنی ادا کرتے ہیں، ان کو ضرب المثل یا کہاوت کہتے ہیں۔ یہاں ایک وسیع تجربہ، ایک گہرا مطالعہ، کلیے یا اصول کی صورت میں علامتی انداز اختیار کر کے پیش ہوتا ہے کہاوتوں کو علم و دانش کے جواہر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جن سے تحریر و تقریر میں توانائی آتی ہے۔ ان کی زبان بھی ایک تراشیدہ ہیرے کی سی صفائی رکھتی ہے، الفاظ کی بندش چست اور انتخاب درست ہوتا ہے۔ ان کے اندر صداقت اور قدامت کے ساتھ ساتھ لطافت اور قبولیت پیوستہ ہوتی ہے۔

اردو نثر اور نظم میں یہ جواہر بکھرے پڑے ہیں۔ شمس بدایونی اپنی تازہ ادبی کاوش "شعری ضرب الامثال" میں ایک نئے زاویے سے ان کی تفہیم ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے پر مغز مقدمے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ ان کا کہنا یہی ہے کہ "وہ اشعار جو ہماری کیفیات و واقعات کے لیے ساختہ اظہار کا ذریعہ بنے اور مختلف اوقات میں مختلف افراد کے حالات پر منطبق اور چسپاں ہوتے بالآخر ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ اس طرح "شعری ضرب المثل" نے جنم لیا۔ یوں تو ہم سب اپنی اپنی کیفیات کے اظہار میں زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں اشعار کا بے تعلقی اور فراخ دلی کے ساتھ استعمال کرتے رہے ہیں لیکن "شعری ضرب الامثال" کو ایک مستقل اصطلاح کے طور پر برتنے اور پیش کرنے کی یہ پہلی باضابطہ اور مربوط کوشش منظر عام پر آئی ہے۔

اس پیش کش میں شمس بدایونی نے تقریباً دو سو شعرا کے پانچ سو سے زائد ایسے اشعار منتخب فرماتے ہیں جنھیں وہ "شعری ضرب الامثال" قرار دیتے ہیں۔ ان اشعار میں کئی غیر معروف شعرا کے نہایت معروف اشعار بھی شامل ہیں جنھیں ہم جیسے اردو داں خوب پیش کرتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ یہ جان دار امثال کس کی دین ہیں۔ مثلاً:

عاشق حسین بزم اکبرآبادی

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے یہ گھر سے مرے ساماں نکلا

داصل شعر یوں قرار پایا ہے)
ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند   گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا

اس طور انھوں نے ایک عام قاری کے علم میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک مصرع ہی زباں زد ہو کر رہ گیا ہے۔ انھوں نے پورا پورا شعر لکھ کر بھی واقفیت کو مکمل کرایا ہے:

نواب علی اصغر اصغر
اگر بخشے زہے قسمت، نہ بخشے تو شکایت کیا   سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

امیر احمد امیر مینائی
خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر   سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی اہتمام فرمایا ہے کہ شعرا کے مکمل نام درج کیے ہیں سید محمد علی شاد عظیم آبادی، اسرار حسین خاں مجروح سلطان پوری، محمد حید رخاں خمار بارہ بنکوی۔ ان کے اس عمل سے بھی ایک عام اردو دوست کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس انتخاب میں شعرا کی ترتیب باعتبار حروفِ تہجی، رکھی گئی ہے اور کتاب کے آخر میں فہرست باعتبار ردیف، کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہاں ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ شعرا کی ترتیب باعتبار دور، رکھی جاتی یا پھر اچھا ہوتا کہ موجودہ صورت میں ہر شاعر کے ساتھ اس کی پیدائش اور وفات کی صورت میں رحلت کی تاریخ درج کر دی جاتی۔ اس طور زیادہ مکمل نشان دہی ہو جاتی اور ایک عام قاری کو ان ضرب الامثال اشعار کے خالق شعرا بالخصوص غیر معروف شعرا کو زیادہ صحیح طور پر جاننے میں مدد ملتی۔ شمس بدایونی نے اس ضمن میں ایک اور مفید کام یہ انجام دیا ہے کہ متعدد ضرب الامثال غلط اشعار کی تصحیح شدہ شکل بھی پیش کر دی اور حوالا بھی دے دیا ہے۔

شمس بدایونی نے اپنے عنوانِ تالیف کے نیچے درج کر دیا ہے کہ "اردو کے ضرب الامثال اشعار کے انتخاب کی پہلی قسط۔" لہٰذا اس خوشہ چینی میں ان سے کوتاہ دستی کی شکایت قبل از وقت اور بے جا ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انتخاب میں انھوں نے دیدہ وری اور دیدہ ریزی دونوں کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ وہ ہمارے ان چند نوجوان ادیبوں میں سے ہیں جو طباعی کے باوصف "سعی کے پاس" جانے سے نہیں کتراتے ہیں۔ ان کی یہ کاوش ہمارے لیے "نیار مانے" کی حیثیت رکھتی ہے جو معتبر بھی ہے اور موقر بھی۔   (عبداللہ ولی بخش قادری)

نشانِ منزل

مصنف: جگن ناتھ آزاد
پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۲
قیمت: ۴۰ روپے

"نشانِ منزل" جگن ناتھ آزاد کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر آزاد بحیثیت شاعر کسی تعارف کے محتاج نہیں، اقبال اور اقبالیات پر ان کا کام ہند و پاک میں بڑی وقعت

کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے انھوں نے سفرنامے بھی لکھے اور خاکے بھی۔ پیش نظر کتاب میں وہ ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس کی اس اشاعت میں جگن ناتھ آزاد کے چودہ مقالات اور نو ریڈیائی مضامین شامل ہیں۔ اقبال اور مخدوم ان کے میدانِ تخصیص ہیں چنانچہ اس کتاب میں بھی اقبال سے متعلق چار اور مخدوم کے تعلق سے ایک مضمون شامل ہے۔ جو اپنی جگہ قول فیصل کی سی حیثیت رکھتے ہیں بقیہ مقالات میں "جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ" "فرحت کی راماین" "امر سنگھ منصور" اور "رام لعل" "کا فن" ان شخصیتوں کے کچھ ایسے ادبی اوصاف کو روشنی میں لاتے ہیں جن کی طرف عام لکھنے والوں کی نگاہ کم جاتی ہے۔ دو تین مضامین میں مقالہ نگار نے ترقی پسند اور جدید شاعری سے متعلق مباحث اٹھائے ہیں جن سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن مصنف کے خلوص پر شبہ کرنا ممکن نہیں۔ چار پانچ مضامین میں زبان و ادب کی رفتار و ترقی اور اسے درپیش مسائل کے بارے میں گہری اور کارآمد باتیں کہی گئی ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب جگن ناتھ آزاد کی تنقیدی بصیرت اور ژرف نگاہی کا ثبوت ہے (ڈاکٹر مظفر حنفی)

اردو افسانہ: روایت اور مسائل

مرتبہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ
ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ دہلی
قیمت: ۷۵ روپے

یہ کتاب ۷۴۳ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس کی کتابت و طباعت اعلا درجے کی، کاغذ قیمتی جلد پائیدار اور نفیس اور گرد پوش سادہ لیکن پرکشش ہے۔ کتاب کی ان ظاہری خوبیوں کو دیکھ کر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نفاست پسندی اور خوب سے خوب تر کی خواہش کا پتا چلتا ہے۔

پروفیسر نارنگ کئی سال تک بحیثیت استاد، شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی سے منسلک رہے، بعد میں پروفیسر و صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے متعلق ہو گئے جہاں انھوں نے شعبہ کا مزاج بنایا ہے اور اسے باوقار بنایا ہے۔

درس و تدریس کے فرائض منصبی کے انجام دہی کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید اور تدوین و ترتیب سے بھی نارنگ صاحب کو بڑی دلچسپی رہی ہے چنانچہ وہ ان کے ذریعے بھی اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں ان کی نگاہ دوررس ہے۔ تجربہ وسیع ہے، تحقیق و تنقید اور تلاش و جستجو کے رموز سے باخبر ہیں۔ تخلیقات کی پرکھ کی صلاحیت بھی قدرت نے بڑی اچھی عطا کی ہے اس لیے اپنی ناقدانہ بصیرت سے کام لے کر اردو کے تنقیدی خزانہ میں بھی قیمتی اضافہ کر رہے ہیں۔

ادھر چند برسوں سے وہ انیس، اقبال، اور میر تقی میر کے علاوہ "جدید اردو ادب میں زبان کا تخلیقی استعمال" اور "لغت نویسی" پر مختلف وقتوں میں سیمینار منعقد کرتے رہے ہیں، جو نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ جامعہ کے ان سیمیناروں کا غلغلہ دور دور تک سنائی دیا۔ ڈاکٹر نارنگ نے انھیں مفید تر اس طرح بنا دیا کہ ان میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جن کے بارے میں یہ کہنا بجا ہے کہ اردو کتابوں کی طباعت

کی دنیا میں ان کتابوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے

"اردو افسانہ" روایت اور مسائل" اس سلسلے کی ایک اہم کتاب ہے جس میں اردو افسانہ فن تکنک اور روایت سے متعلق چھ مضامین۔ پریم چند۔ فکر و فن سے متعلق پانچ مضامین ہیں۔ عہد ساز افسانہ نگار۔ منٹو، کرشن، بیدی، عصمت، قرۃ العین سے متعلق چودہ مضامین۔ اور نیا افسانہ: مسائل اور تجزیہ سے متعلق اٹھارہ مضامین ہیں، یہ سارے مضامین کم و بیش اچھے اور کچھ بہت اچھے ہیں۔

ابتدائیہ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو افسانہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے صحیح کہا ہے:

"اردو کی نثری اصناف میں افسانے کو جو مرکزیت حاصل ہے اور بیسویں صدی میں اس صنف نے جو ترقی کی ہے وہ ہر لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس پر توجہ کی جائے، ایک طرف تو ماضی کی شاندار روایت ہے اور دوسری طرف جدید افسانے کے اظہاراتی تجربے، فنی بلندیاں اور نئے نئے مسائل ہیں جو قابلِ غور ہیں"۔

یقیناً اردو افسانے توجہ چاہتے ہیں ان سے متعلق سیمینار کی بھی ضرورت تھی اور بڑے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس کی اہمیت کو محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اسے عملی جامہ پہنایا اور بازی جیت گئے۔ انھوں نے اردو کے چھوٹے بڑے، فن کاروں، افسانے کے قدردانوں اور اس کے ناقدوں کو ہند اور بیرونِ ہند سے اکٹھا کیا اور ان کی تحریروں سے نہ صرف سیمینار میں گرما گرمی پیدا کی بلکہ انھیں یکجا کر کے کتابی شکل میں محفوظ کر دیا تاکہ زیادہ سے زیادہ اہلِ علم تادیر ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ اِن مضامین کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو افسانہ کی تاریخ میں یہ سیمینار نہایت اہم تھا اور یہ کتاب بیش قیمت ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اسے اور زیادہ مفید بنانے کے لیے بعض اہم نقادوں کے اہم مطبوعہ مضامین بھی شامل کر دیے ہیں اور بعض نقادوں سے نئے مضامین لکھوا کر اس میں اضافہ بھی کیا ہے اور اس طرح یہ کتاب اور زیادہ جامع اور مکمل ہو گئی ہے جس کے لیے پروفیسر نارنگ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (عبدالقوی دسنوی)

میر تقی میر نمبر نقوش (لاہور)

مرتبہ: محمد طفیل
پتا: مکتبہ جدید، لاہور
قیمت: سو روپے

نقوش جب جاری ہوا تو اس کا اپنا مزاج، معیار، انداز ہم عصر دوسرے رسائل سے مختلف تھا۔ ظاہری صورت بھی اس کی عام رسائل کی طرح نہیں تھی، اس لیے اس کے عام شمارے بھی توجہ کا باعث رہے، لیکن جب محمد طفیل اس کے مدیر ہوئے اور یہ رسالہ ان کا اپنا ہو گیا تو اس کے خاص اور اہم نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا، اس کے شخصیات نمبر، افسانہ نمبر، منٹو نمبر، آپ بیتی نمبر، طنز و مزاح نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، ادبی معرکہ نمبر،

انیس نمبر، میر نمبر، اور رسول نمبر اس قدر معیاری اور بھاری بھرکم ہیں کہ ان کی اشاعت نے لوگوں کو حیران کر دیا اس لیے کہ عام طور سے اردو میں ایسے مفید اور ضخیم نمبروں کے منظر عام پر آنے کا رواج نہ تھا۔ اس کے بعض نمبر دو دو اور تین تین حصوں میں پیش کیے گئے ہیں لیکن رسول نمبر کی دس جلدوں نے حیرت میں بہت زیادہ اضافہ کیا ہے اور یقین دلایا گیا ہے کہ یہ جو محمد طفیل ہیں وہ ایک آدمی نہیں کئی آدمی کا مجموعہ ہیں یا پھر ان کے قبضے میں کوئی دیو ہے جو ہر وقت ان کے حکم کا منتظر رہتا ہے۔ اور ہر وقت حکم کی تعمیل کرتا ہے اور یہ محمد طفیل اور ان کے عاشق صادق اس سے کچھ نہیں مانگتے۔ سوائے عظیم و ضخیم نقوش کے نمبروں کے ـــ سو وہ دیو حکم کا بندہ تعمیل حکم حاکم یعنی محمد طفیل کیے جا رہا ہے اور قیمتی نمبروں کے انبار لگائے جا رہا ہے۔ جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں انھیں نمبروں میں میر تقی میر سے متعلق نقوش کی تین جلدیں ہیں جو مجموعی صورت میں تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔

پہلی جلد (مطبوعہ اکتوبر ۱۹۸۰ء) میں دیوان میر۔ نسخہ محمود آباد (مخطوطہ ۱۲۰۳ھ) بہ حیات میر ڈاکٹر اکبر حیدری کی ترتیب و تدوین کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس نمبر کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اس کے ذریعہ نقوش نے پہلی بار پاکستان میں میر کے ۲۷ غیر مطبوعہ اشعار پیش کیے ہیں۔

دوسری جلد (مطبوعہ نومبر ۱۹۸۰ء) میں ۳۷ مضامین ہیں جن میں "مطالعہ میر (ڈاکٹر جمیل جالبی)" کے علاوہ تمام مضامین مطبوعہ ہیں۔ محمد طفیل نے انھیں میر نمبر (دلی کالج میگزین) مرتبہ نثار احمد فاروقی اور حدیث میر مرتبہ مقبول احمد لاری کے علاوہ میر سے متعلق دوسرے مطبوعہ مضامین میں سے انتخاب کیے ہیں۔ اس لیے یہ جلد بھی نہایت اہم ہے۔ یقین ہے کہ آئندہ میر شناسی کے لیے دلدادگان میر کی اس نمبر سے رہنمائی ہوتی رہے گی۔

تیسری جلد اگست ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی ہے جو میر کے غیر مطبوعہ فارسی کلام پر مشتمل ہے۔ جس میں نسخہ رضوی کو نسخہ رام پور سے تقابلی مطالعہ کے بعد شائع کیا گیا ہے اور نسخہ حیدرآباد دکن کا عکس بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس میں کلیات میر کے ایک مخطوطہ کا ذکر، دیوان میر سوم کے مخطوطہ کا ذکر، دیوان میر چہارم کے مخطوطہ کا ذکر اور سیر حاصل تبصرہ کے علاوہ ذکر میر کے مخطوطہ کا احاطہ بھی ہے۔ آخر میں رالف رسل اور ڈاکٹر خورشید الاسلام کے انگریزی مضمون کا ترجمہ "میر کی عشقیہ شاعری" بھی شامل ہے اور منظفر علی سید کا مضمون "میر کی فارسی سخن گوئی اور کسرا منہاس کا مضمون "میر کی اصطلاحیں" بھی منقولات میں درج ہیں۔ یہ ساری تحریریں خاص طور سے میر کی فارسی کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں، اس لیے بہت اہم ہیں۔

اس طرح میر کے چاہنے والوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے ان میں محمد طفیل نے اپنا بلند مقام بنا لیا ہے۔ انھوں نے تنہا میر سے متعلق سب سرمایہ یک جا کر دیا ہے جو کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور اس طرح انھوں نے اردو والوں کو خدائے سخن میر تقی میر پر مزید غور و خوض کرنے اور نئی سمت کی تلاش کرنے کے لیے آسانیاں فراہم کر دی ہیں جس کے لیے وہ شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(عبدالقوی دسنوی)

مبشر علی صدیقی ۔ شخصیت اور فن

مرتبین : ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی ۔ دریندر پرشاد سکسینہ شمس بدایونی
ناشر: سلیم مبشر اردو سوسائٹی (رجسٹرڈ) محلہ سوتھہ بدایوں
قیمت: پندرہ روپے

میں اس کتاب کو ایک ہی نشست میں پڑھ گیا ۔ جس کا سبب کتاب کے مضامین ہیں جو بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی ہیں ۔ مبشر علی صدیقی کی زندگی کا ایک طویل عرصہ تعلیم و تربیت اور تصنیف و تالیف کے میدان میں اجتہاد سے عبارت ہے جس کا ثبوت اس کتاب نے مہیا کیا ہے ۔ اردو کے جس پُرآشوب دور میں ہم سانس لے رہے ہیں' اردو زبان سے محبت رکھنے والے لوگ خال خال ہی ملتے ہیں ۔ اس حقیقت میں ان کی شخصیت ہر لحاظ سے ممتاز اور منفرد ہے ۔ ان جیسے اردو کے خاموش سپاہی کو میں اپنا سلام پیش کرتا ہوں ۔

پروفیسر آل احمد سرور نے ان کی تنقید نگاری پر ایک قابلِ قدر تعارف سپردِ قلم فرمایا ہے جس میں تنقید کی مختلف تحریکوں اور اس سے متعلق چند ممتاز پیش رو نقادوں کے افکار کا بھی جائزہ لیا گیا ہے ۔ عمر کے اعتبار سے مبشر صاحب سرور صاحب کے ہم عصر ہیں ۔ میں ان کے مضامین ۱۹۴۸ء سے لے کر اب تک "جادہ بھوپال" "شاعر" بمبئی و دیگر رسائل و جرائد میں ایک طالب علمانہ لگن و ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں ۔ ان کے فکر و فن کا جائزہ تو سرور صاحب ہی لے سکتے تھے ۔ یا پھر مرحوم خلیل الرحمٰن اعظمی جن کے ساتھ ان کے بارے میں پانچویں چھٹی دہائی میں اکثر گفتگو ہوتی تھی ۔ وہ زمانہ تنقید اور تخلیق دونوں اصناف ادب میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا تھا ۔

جگر بریلوی (مرحوم) نے اپنے مضمون میں ان کے ایک مضمون "اردو مزاحیہ نگاری کی مختصر تاریخ" کا سرسری سا ذکر کیا ہے ۔ شاید یہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا ۔ اگرچہ میں نے طنز و مزاح کے بارے میں لکھے ہوئے اپنے مضامین اور نقوش کے خاص نمبر کے علاوہ چند اور کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھی ہیں ۔ ابھی حال ہی میں خواجہ عبدالغفور صاحب نے اسی موضوع پر ایک بسیط مقالہ لکھ کر پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے ۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا بھی اس سلسلے میں بڑا قابلِ قدر کام موجود ہے ۔ انھوں نے بھی اسی موضوع پر بہت پہلے ریسرچ کی تھی اور اردو ادب کی اس صنف پر انھوں نے ہی قلم اٹھا کر اہلِ نظر کو سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا تھا ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طنز و مزاح کے بارے میں لکھی ہوئی چند ضخیم کتابوں و فاضل نمبروں کی موجودگی میں اب اس کی ایک مختصر تاریخ بھی مرتب کر دی جائے ، جس سے ہمارے طلبہ مستفید ہو سکیں ۔ یہ کام مبشر صاحب ہی جیسا کوئی محنتی شخص سرانجام دے سکتا ہے ۔ یا پھر طنزیہ و مزاحیہ ادب کے لیے قلم کاروں میں احمد جمال پاشا ہی متوجہ ہوں جو اس صنفِ ادب پر کافی دنوں سے کام کر رہے ہیں ۔ امید ہے کہ ناظرین میرے اس خیال سے متفق ہوں گے کہ ادب کی مختصر ترین تاریخ کی بھی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے اور اسے تسلیم کیا جا چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اختصار ہی مبشر علی

کی تنقید نگاری کی ایک خاص خوبی ہے۔ اس کتاب میں قابل مطالعہ کئی تحریریں ہیں۔ دیمتروں کے تبصرے ان کی تصانیف پر، ان کے تبصرے دوسروں کی تصانیف کے بارے میں اور ان کے نام دوسروں کے خطوط جن میں اس خاکسار کا بھی ایک ذاتی خط شامل ہے لیکن ویریندر پرشاد سکسینہ نے ان کے جو سوانحی حالات سپردِ قلم کیے ہیں، وہ بھی میری خاص دلچسپی کا باعث ہے۔ اس کتاب سے یہ معلوم ہوا کہ ان کے والد محترم ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے اور چیف گڈس کلرک کے عہدے تک پہنچے۔ گویا آپ ریلوے کی ملازمت کی ساری دِقتوں، مشقتوں اور حرکتوں سے واقف رہے۔ اور شاید اسی لیے انھوں نے اپنے والد کی خواہش کے باوجود ریلوے کی ملازمت کرنا پسند نہ فرمایا۔ میرے بیٹے نے بھی ایسا ہی کیا اور جب ریلوے کے اکاؤنٹس آفس کی سروس نے اسے طلب کیا تو اس نے اچانک انکار کر دیا۔ اگرچہ بعض سہولیات کے پیشِ نظر میں چاہتا تھا کہ وہ اسے قبول کرے۔ اب وہ یو پی بجلی بورڈ کی ملازمت میں ہے اور مطمئن ہے اور میں بھی اس کے فیصلے سے مطمئن ہوں۔ خیر۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ مبشر صاحب نے خود اپنے والد کے بارے میں حالات قلم بند کیے ہیں یا نہیں! اگر اب تک نہ کیے ہوں تو فرصت نکال کر سو پچاس صفحے ضرور لکھ ڈالیں۔

میں اس کتاب کے مرتبین کو جن کے نام اوپر درج ہیں، مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے مبشر صاحب کی شخصیت اور فکر و فن پر بھرپور روشنی ڈالنے کے لیے کاوش کی۔ یقین ہے کہ یہ کتاب مقبول ہو گی۔

(رام لعل)

شفیع الدین نیّر — ایک مطالعہ

مرتب: اطہر پرویز
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی
قیمت: سات روپے پچاس پیسے

بچے قوم کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ہم قوم کو جو کچھ اور جیسا بنانا چاہتے ہیں: بچوں کو اسی سانچے میں ڈھالنا پڑے گا لیکن ابھی اس حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں دی گئی۔ ہم نہ بچوں کو مناسب اہمیت دیتے ہیں، نہ ان کی جسمانی صحت و نشوونما کو، نہ ان کی ذہنی تربیت و پرداخت کو، نہ ان کی دیگر ضرورتوں کو۔ اسی ذیل میں بچوں کا ادب بھی ہے، جس کو کم از کم اردو میں ابھی تک وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کا وہ مستحق ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے اچھے لکھنے والے اس طرف سنجیدگی سے متوجہ نہیں ہوتے اور جو متوجہ ہوتے ان کی وہ قدر و منزلت نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے، لیکن اس ناقدری روزگار کے باوجود جن لوگوں نے بچوں اور ان کی تربیت کی اہمیت کو محسوس کر لیا، انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو انھیں کے لیے وقف کر دیا۔ شفیع الدین نیّر ہمارے ایسے ہی چند مصنفین میں سے ایک ہیں۔ قدرت نے ان کو شاعرانہ صلاحیتیں ودیعت کی تھیں، ان کے اندر نثر نگاری کا جوہر تھا، وہ علم سے بھی بے بہرہ نہ تھے، لیکن انھوں نے اپنی ان تمام صلاحیتوں کو استعمال کیا صرف بچوں کے لیے۔

نیّر صاحب نے نصف صدی سے زیادہ بچوں کے لیے نظم و نثر کے موتی پروئے۔ انھوں نے بچوں کو کہانیاں سنائیں ــ پریوں کی کہانی، اخلاقی اور سبق آموز کہانیاں۔ انھوں نے ان کو ہلکے پھلکے نغمے دیے۔ وہ جو بچوں کو اپنی نغمگی کے سہارے پریوں کی دنیا میں لے جا سکتے تھے، ان کی سوئی ہوئی شوخی کو گدگدا سکتے تھے، ان کے دل میں حوصلہ پیدا کر سکتے تھے، اور ہنستے گاتے ان کو تہذیب کا درس دے سکتے تھے، اتنے عرصے اور اتنی مقدار میں انھوں نے بڑوں کے لیے لکھا ہوتا تو کیا کچھ نام وری حاصل نہ ہوئی ہوتی ــ ان کو عزت کے تاج پہنائے جاتے، ان کو انعامات سے نوازا جاتا، ان کے اعزاز میں جلسے ہوتے، دانش گاہیں اور علمی ادبی ادارے ان کو مدعو کرتے اور مفتخر ہوتے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جیسے ہم کہہ رہے ہوں " بچے ہمارے سماج کا حصّہ نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے لیے نغمے تراشنے والا شاعر اور ان کی نفسیات کو متاثر کرنے والا کہانی کار ہمارے سماج کی توجہ کا مستحق نہیں ہے۔"

بچوں کے مقبول مصنّف جناب اطہر پرویز صاحب نے اس سمت میں پہلا قدم اٹھایا ہے۔ اگرچہ ماہ نامہ " پیامِ تعلیم " دہلی اپنے ایک شمارے کو نیر صاحب کے لیے مخصوص کر کے ان کو خراجِ عقیدت پیش کر چکا ہے۔ لیکن کتابی شکل میں یہ پہلی کاوش کہی جا سکتی ہے۔ یہ کتابچہ نہ نیر صاحب کی تصنیفات پر تنقید ہے، نہ ان کی سوانح ہے، بلکہ اس میں ایک انوکھے انداز میں ان کا دلچسپ خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اطہر پرویز کو خود یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ سنجیدہ اور گہری باتوں کو بھی بڑے دلکش انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ مثالوں سے، چٹکلوں سے اور اپنے رواں دواں اندازِ بیان سے دقیق مسائل کو بھی پانی کر دیتے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں گفتگو کا آغاز خود اپنے ہی بارے میں گفتگو سے کیا اور پھر عبارت کی موجوں میں ان کے بیان کی کشتی بہتی چلی گئی ــ کبھی تیز رو کبھی سبک رفتار، کبھی موجوں میں غلطاں و پیچاں کبھی ان سے بلند خرام؛ کبھی " میں " کا دھارا تیز، کبھی " وہ " کی روانی غالب۔ سب ایک دوسرے میں اس طرح گتھے ہوتے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل۔ اندازِ بیان اتنا دلکش کہ اس کی رو میں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کہاں سے " میں " ختم ہو کر " وہ " شروع ہو گیا اور کہاں " وہ " پیچھے رہ گیا اور " میں " منزلیں مارتا ہوا آگے بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اطہر پرویز الف لیلا کی شہرزاد کی طرح ایک قصّہ کو جہاں چاہتے ہیں، روک دیتے ہیں، دوسرے قصّے سناتے ہیں اور پھر پہلے قصّے کی ڈور تھام کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ اسی روانی میں الف لیلا کی بھی ایک کہانی سنا گئے ہیں ــ خواہ مخواہ نہیں، بلکہ نیر صاحب کی فطرت کے ایک پہلو کی تشبیہ کے طور پر!

چھوٹے چھوٹے قصّوں کے ذریعہ اطہر پرویز صاحب نے چٹا پٹی کے رنگوں سے نیّر صاحب کا ایک بڑا ہی دلآویز خاکہ تیار کر دیا ہے۔ ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ ان کی بچوں جیسی معصومیت، مقصد کی سچی لگن، لالچ اور ہوس سے بیگانگی، درویشوں جیسے فقر و استغنا، توکل و قناعت، کلاسیکی طرز کی مروت اور وضع داری، دوستوں سے دوستی، دشمنی کسی سے نہیں کا رویّہ! لیکن ہے یہ محض خاکہ ــ اس میں ابھی رنگ بھرنے کی ضرورت

ہے کہ ان کی شاعری اور فن کا تفصیلی اور بھرپور جائزہ لیا جائے، بالخصوص بچوں کی نفسیات کے آئینہ میں اس کو پرکھا جائے تاکہ اس کی قدر و قیمت کا تعین ہو سکے۔ آغاز سازہوا ہے تو کوئی مرد میدان اس کو انجام کار تک بھی ضرور پہنچائے گا۔ (پروفیسر عتیق صدیقی)

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

مصنف: ڈاکٹر عبیدہ بیگم
ناشر: نصرت پبلشر لکھنؤ
قیمت: ساٹھ روپے

"تاریخ تعلیم" اور تاریخ اردو ادب" دونوں میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی بڑی اہمیت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کو نظر انداز کر کے اردو ادب کا تاریخی سلسلہ ہی منقطع جاتا ہے بلکہ اس کی ترویج واشاعت کا طلسم ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی لیے اس موضوع پر اردو، ہندی اور انگریزی میں محققین نے پوری توجہ کی ہے۔ تلاش اور محنت سے کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی اہمیت وافادیت کو مدّنظر رکھتے ہوتے ریسرچ تک ہونے لگی ہے۔ اس ریسرچ کا ماحصل ہمارے سامنے ہے۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اپنا تحقیقی مقالہ یعنی "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومتِ اترپردیش کے مالی تعاون سے شائع کر دیا ہے۔ یہ مقالہ گورکھپور یونیورسٹی کے لیے تیار کیا گیا اور نگرانی کا فریضہ پروفیسر محمود الٰہی نے بوجہ احسن ادا کیا۔ یہ کتاب ضخامت کے لحاظ سے مولوی نجم الغنی اور جمیل جالبی کی کتابوں کا جواب ہے۔

"فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کو وسعت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ اس لیے کہ اس میں فردوس گم شدہ کی تلاش ہے۔ نئی ترجمانی ہے۔ تسامحات کی صحت کی گئی ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کا دائرہ الگ الگ تھا اب اس دائرے میں وہ تمام دائرے بھی شامل ہیں اور وہ دائرے بھی داخل ہیں جو محققین کی نگاہ سے ابھی تک پوشیدہ تھے۔

ابواب کی تقسیم سے جامعیت کا اندازہ ہوگا۔

۱۔ فورٹ ولیم کالج کے اغراض و مقاصد
۲۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین
۳۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات
۴۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر کا اسلوب
۵۔ اردو نثر پر فورٹ ولیم کالج کے اثرات

آخر میں مآخذ ومصادر کی فہرست شامل ہے۔ سہولت کے لیے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تصانیف کا اندراج کر دیا گیا ہے۔ اس دانش گاہ سے وابستہ اردو ہندی کے تمام مصنفین کے حالاتِ زندگی بھی ملتے ہیں۔

پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے اس کتاب کے متعلق فرمایا ہے:

"اس موضوع پر اتنی مفصل اور مستند کتاب میری نظر سے نہیں گزری"

ڈاکٹر احمر لاری کی رائے ہے:

"وہ بہت سے تسامحات کی تصحیح اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالے میں کامیاب ہوئی ہیں"

پروفیسر سید محمد عقیل کا بیان ہے:

"یہ کتاب پھر محققین پر فورٹ ولیم کالج کے مطالعے کے لیے نئے دروازے کھولتی ہے"

یہاں چند اشارے غور طلب ہیں۔ گل کرسٹ کا تقرر پرنسپل یا اعلا آفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ پہلے پروفیسر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ نقلیات ہندی اور نقلیات نقمانی ایک کتاب نہیں بلکہ جداگانہ طور پر دو کتابیں ہیں۔ "ہندستانی زبان کی قواعد" ۱۷۹۶ء میں شائع ہوئی مگر نیشنل لائبریری کلکتہ میں جو نسخہ محفوظ ہے اس میں یہ اورینٹل لنگوسٹ کے ساتھ شامل ہے اور ینٹل لنگوسٹ پر ۱۷۹۸ء اور قواعد پر ۱۷۹۶ درج ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کی اصل تاریخ اور لارڈ ولزلی کی افتتاحی تقریر کو نادر بازیافت کہنا چاہیے۔

کتاب بڑے اہتمام سے چھپی ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

سخنورانِ گجرات

مرتب: سید ظہیر الدین مدنی

ناشر: ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸ آر کے پورم نئی دہلی ۲۲

قیمت: ۷ روپے

"سخنوران گجرات" پی، ایچ، ڈی کے لیے لکھا گیا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس میں ترمیم و اضافہ کرکے سید ظہیر الدین مدنی نے کتابی شکل میں شائع کرایا ہے۔

"مقدمے" میں گوجر ورلیش، گجری ادب، اردو، صوفیہ اور ان کے ملفوظات کا تفصیلی بیان ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب: سیاسی و سماجی پس منظر ۱۴۰۰ء/۸۰۲ھ تا ۱۶۶۵ء/۱۰۹۰ھ

اس باب میں شاعروں کے حالات زندگی درج ہیں۔ نمونۂ کلام دیا گیا ہے اور آخر میں ادبی تبصرہ شامل ہے۔

مثلاً شیخ احمد کھٹو اور باجن کے کلام میں دوہے ملتے ہیں۔ اردو قواعد کے بعض اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔

دوسرا باب سیاسی سماجی پس منظر پیش کرتا ہے۔ اس کی مدت ۱۶۵۷ء تا ۱۷۰۰ء رکھی گئی ہے اس میں ولی، اشرف، رضی، ثنا، فراقی، راجارام، احمد، احمدی، اور صبائی کا تذکرہ ہے۔ نمونۂ کلام تبصرے میں ولی کی خصوصیات کلام کو پیش کیا گیا ہے۔ ولی کی زبان دہلوی گجری اور دکھنی شاخوں کی خصوصیات کا مجموعہ ہے۔

تیسرے باب میں سیاسی سماجی پس منظر ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک ملتا ہے۔ اس دور میں

جیس شاعروں کو قابلِ ذکر سمجھا گیا ہے عزلت، تجرد، فاضل، مضطر، اقدس، رحمت، محمود، بہادر، حامد، بخشش، کریم، محب، نصیری صاحب، ضاحک، الف، کمتر، عباس، شرفو، لطیف — تبصرے میں شمالی ہند کے معروف اساتذہ کا ذکر بھی ہے اس دور میں مثنویوں کی بڑی تعداد ملتی ہے۔

چوتھے باب میں سیاسی سماجی پس منظر کی مدت ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۰ء تک ملتی ہے۔ گجرات میں مغربی تعلیم تیزی سے پھیلی۔ ۱۸۲۰ء میں مشنریوں نے سورت میں چھاپا خانہ قائم کیا۔ انگریزی گجراتی لغت شائع کیا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اسکول کھولے گئے۔ ۱۸۵۷ء میں ٹریننگ کالج اور ۱۸۷۳ء میں آرٹس کالج قائم ہوا۔ اس باب میں تیس سے زیادہ شعرا کا تذکرہ ملتا ہے۔ حسبِ ترتیب نمونہ کلام اور تبصرہ شامل ہے۔ اخلاق، انگر، آزاد، شعلہ، کامل، شیدا وغیرہ وغیرہ شعرا کا تذکرہ ہے۔ نمونہ کلام اور تبصرہ بھی۔ مثنوی نگاری جاری رہی۔ غزل میں دہلی اور لکھنو کا اثر ہونے لگا تھا مگر زبان کی سجاوٹ زیادہ مرغوب تھی۔

فہرست ضمیمہ ۱ میں گجرات کے چند خاندانوں کا حال درج ہے۔ مثلاً سید جلال الدین اور دیگر علما کا خاندان، جوناگڑھ کا نوابی خاندان۔ بڑودہ، مانگرول کا نوابی خاندان وغیرہ۔ ضمیمہ ۲ میں گجرات میں اردو نثر نیز ضمیمہ ۳ میں شعرا کی فہرست شامل ہے۔

"سخنورانِ گجرات" کے مطالعے سے شاعری کے علاوہ اردو کی مختلف سطحوں اور منزلوں پر تبدیلی، پختگی اور قبولِ عام کی روداد معلوم ہوتی ہے۔

یہ کتاب محنت مطالعہ اور تحقیقی نظر کا نتیجہ ہے۔ کتاب عمدہ چھپی ہے (ڈاکٹر سیفی پریمی)

اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا

(۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۵ء)

تصنیف: ڈاکٹر ممتاز فاخرہ
ناشر: رونق پبلشنگ ہاؤس ۸۳۴۔ بلی ماران دہلی ۶
قیمت: پچاس روپے

ڈاکٹر ممتاز فاخرہ نے اپنے تحقیقی مقالے (پی۔ ایچ ڈی) "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا" کو شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے متوازن اور نتیجہ خیز مقدمہ سپردِ قلم کیا ہے چند سطور ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کے بارے میں پڑھنے سے ان کے کام کا اندازہ ہو سکے گا۔

"انھوں نے بڑی محنت سے تقریباً ایک صدی کے وسعتوں میں پھیلے ہوئے سوانح عمریوں کے اس رشتہ در رشتہ سلسلے کا مطالعہ کیا ہے اور بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی قابلِ ذکر سوانح عمری ان کے تبصرے یا حوالے سے رہ گئی ہو۔ ان کا یہ مطالعہ مختلف ادوار کی مزاج شناسی اور تہذیبی و تنقیدی سطح پر سوانح عمریوں کی عیارگری میں بہت معاون ہو سکتا ہے۔"

اس کتاب میں چند در چند موضوعات پر ابواب مرتب کیے گئے ہیں۔

۱۔ سوانح نگاری کا فن ۲۔ پس منظر۔ اردو ادب میں سوانح عمری کی روایت، حالی شبلی اور ان کے معاصرین کا دور — ابتدا سے ۱۹۱۴ء تک ۳۔ اردو میں سوانح نگاری — ۱۹۱۴ء

سے ۱۹۴۷ء تک۔ ۴۔ اردو سوانح نگاری ـــــ ۱۹۴۷ء تا حال
۵ ـــ خود نوشت سوانح عمریاں
۶ ـــ قلمی خاکے، سوانحی مجموعے، سوانحی تراجم اور نیم سوانحی مجموعے۔
۷ ـــ کتابیات ـــ

شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے ہے:

"اردو میں اعلا درجے کی سوانح عمریوں اور خود نوشت سوانح کی کثرت کے باوجود کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو سوانح نگاری کے فن سے بحث کرتی ہو اور چھوٹی بڑی سوانح عمریوں کا نسبتاً مفصل مطالعہ پیش کرتی ہو۔ اس کمی کے پیشِ نظر ممتاز فاخرہ کی یہ کتاب نعمتِ غیر مترقبہ کا حکم رکھتی ہے۔

پروفیسر حامدی کشمیری کا بیان ہے:

"سوانح نگاری کے فن، روایت اور جدیدیت کے بارے میں جامع اور مستند معلومات فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر فاخرہ کا انداز معروضی ہے۔ ان کی نظر دور رس ہے۔ ان کے اندازِ تحریر کی سادگی اور استدلالیت ان کے محققانہ ذہن کا پتا دیتی ہے۔"

۱۸۴۷ء تک اس باب میں مواد کی فراہمی چنداں دشوار نہ تھی مگر اس کے بعد عصرِ حاضر تک نقوش کی تلاش کارے دارد۔ میرے نزدیک باب چہارم، پنجم اور ششم ڈاکٹر فاخرہ کی لگن، محنت مطالعہ اور تنقیدی شعور کی واضح اور خصوصی علامت ہیں۔ خاکے، نیم سوانحی مجموعے اور سوانحی مجموعے پر مختصر اظہارِ خیال اور نمبر شماری و تعداد کو صفحۂ قرطاس پر لانا بھی نہ صرف قارئین بلکہ مضمون نگار حضرات کے لیے بھی کرن کا کام دے گا۔ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کو اس تحقیقی و تنقیدی کارنامہ پر مبارک باد ملنی چاہیے۔ کتاب عمدہ چھپی ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

زندہ کتبے

مصنف و ناشر: عروج زیدی
قیمت: بیس روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶-۱۱۰۰۰

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے جزوی مالی تعاون سے عروج زیدی کی تصنیف "زندہ کتبے" منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس میں درج ذیل شعرا کی زندگی اور فن پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

۱۔ شاد عارفی ـ شخصیت اور فن
ایک ستارہ اور ٹوٹا
شاد عارفی کا آخری سفر
۲ ـ جگر مرادآبادی ـــ اردو ادب کا ایک اہم کردار کچھ یادیں کچھ باتیں
۳ ـ نوح ناروی ـــ شخصیت و شاعری
۴ ـ راز یزدانی ـــ زندگی و فنی سفر

جائزے

۵ ۔ شفیق جون پوری ۔۔۔ حیات و شعری کارنامے

۶ ۔ ماہر القادری ۔۔۔ شخص و شاعر

ڈاکٹر انتخار احمد نے تصنیف کے بارے میں رائے دی ہے :

"میں سمجھتا ہوں کہ "زندہ کتبے" کے مضامین کو نہ صرف بہ نظر استحسان دیکھا جائے گا بلکہ اس ادبی خدمت کو اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ بھی تصور کیا جائے گا"

ڈاکٹر محمد رضوان علوی کا بیان ہے :

"جن شخصیتوں پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے عموماً اتنی تفصیل اور اتنے قرینے سے ان کے حالات یک جائی طور پر کہیں اور شاذونادر ہی دست یاب ہو سکیں گے"

ڈاکٹر عابد رضا بیدار رقم طراز ہیں :

"شعرا اور شخصیات کے اس جائزے میں انھوں نے ناقد اور خاکہ نگار دونوں کا قلم استعمال کیا ہے اگرچہ مقصد اصلی خاکہ نگاری نہیں شعر کی تحسین ہے"

ان آرا کی روشنی میں عروج زیدی کے مواد و موضوع کی حیثیت و کیت اور اسلوب کے مثمر ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض شعرا سے مصنف کے ذاتی تعلقات رہے ہیں۔ عینی شاہد کی حیثیت سے کیفیات کا بیان سندِ اعتبار قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ذاتی تجربے دوسروں کے مقابلے میں نئے اور متعلقہ شعرا کے حالاتِ زندگی میں اضافہ کہے جائیں گے۔ ایک اور چیز کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ ہر شاعر کے سلسلے میں حوالہ کے اشعار کی تعداد اتنی ہے کہ بادی النظر میں اسے طوالت پسندی پر محمول کیا جائے گا لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ یہ تمام اشعار شاعر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی اساس بھی ہیں اور آثار و دلیل بھی۔ نفسِ رسائی کا عنصر مستزاد۔ اس لیے کہ ان شعرا کے شعری مجموعے دسترس سے باہر ہونے کی صورت میں "زندہ کتبے" سے ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔

عروج زیدی کی اس تصنیف میں جگر مرادآبادی سے متعلق مضمون بے حد تاثراتی ہے۔ اصغر گونڈوی کا جہان رامش و رنگ بھی ان کی نظر سے اوجھل رہا ہے۔ جگر کی محبت ارضی تھی۔ فاطمہ، وحیدن، شبیرازن، شبابہ، نسیم وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ صنم کدۂ مجاز ۔۔۔ میخانۂ معرفت کا زینہ تھا؟ انجمن کہلا بھوپال میں موسم کی کتنی راتیں گلابی اور رمی کے سہارے سپیدہ سحری سے گلے ملتی رہی ہیں۔ "گوری گوری کلائیاں توبہ"! اور اس کی مشک و نغما کو جانے دیجیے۔ لیکن :

سامنے آتے ہی آتے وہ تنفس تیز تیز   سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لیے

تخلیقی عمل میں سینۂ شفاف اور زیر و زبر کہاں سے وارد ہوتے ہیں؟ ۔۔۔ اصل میں جگر کو مشاہدات، تجربات، سانحات اور محسوسات نے بڑا آرٹسٹ بنایا اور بہتر انسان بھی!

ڈاکٹر ابن فرید کی رائے ہے :

"جہاں کہیں بھی انھوں نے کلامِ شاعری پر محاکمہ کیا ہے اپنی ژرف بینی اور فنِ شاعری سے استادانہ واقفیت کا ثبوت بھی دیا ہے"

کتاب میں عروج زیدی، شاد عارفی، جگر مراد آبادی، نوح ناروی، شفیق جون پوری اور نوٹو گروپ میں ماہر القادری کی تصویر موجود ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

مصنف: سید احتشام حسین

ناشر: ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸، آر کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

قیمت: چودہ روپے پچھتر پیسے

"تذکرے" لکھنے کا رواج قدیم سے ہے۔ اس کی بڑی اہمیت ہے۔ تذکروں کو محفوظ رکھنے اور اور قارئین کو فیض یاب کرنے کے لیے نیاز فتح پوری نے اپنے ماہ نامہ "نگار" کا سال نامہ "تذکروں کا تذکرہ" پاکستان سے شائع کیا تھا۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ پر بھی توجہ کی گئی۔ معتبر اہل قلم نے کافی محنت اور تلاش سے اس کام کو انجام دیا۔ لیکن تذکرۂ شعرا نیز تاریخ زبان و ادب کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ یہ ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ کسی دبستانِ ادب یا شخصیت کو اس جانب پھر توجہ کرنا چاہیے۔

اردو کی تنقید کا معیار مسلّم! اس موضوع پر لائق تحسین کتابیں چھپ رہی ہیں۔ لیکن پروفیسر احتشام حسین نے ضمن میں ایک نئے زاویے کی تلاش کی اور ایک دشوار گزار پورا کام کر دیا۔ یہ کام وہی کر سکتے تھے۔ انھوں نے اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" مرتب کی اور ترقی اردو بیورو مبارک باد کا مستحق ہے کہ ایسی مفید اور ضروری کتاب کی اشاعت کا اہتمام نہایت شان دار طریقے سے کر دیا۔ سہولت یہ کہ قیمت بھی مناسب رکھی گئی۔

"اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" میں زبان و ادب کی تاریخ کا شامل ہونا ضروری تھا۔ اس کو دو آتشہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں درج موضوعات پر سیر حاصل تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ اردو ادب اور زبان کی ابتدا۔ اردو دکن میں۔ دلی اٹھارویں صدی میں۔ اردو نثر کی ابتدا اور تشکیل۔ اودھ کی دنیائے شاعری نظیر اکبر آبادی کی اور ایک خاص روایت کا ارتقا۔ قدیم دلی کی آخری بہار۔ اردو نثر: فورٹ ولیم اور اس کے بعد۔ نئے دور سے پہلے: نظم و نثر نیا شعور اور نیا نثری ادب۔ نشاۃ ثانیہ کی اردو شاعری۔ نظم میں نئی سمتیں۔ نثر کے نئے روپ۔ موجودہ ادبی صورتِ حال۔

اس کتاب کو ادبی و تنقیدی انسائیکلو پیڈیا کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان و ادب کی ابتدا سے لے کر آج تک کے تمام قابل ذکر شعرا، ادبا، ناقدین، افسانہ نگار، ناولسٹ، ڈراما نگار، مرثیہ گو، مزاح نگار وغیرہ پر لکھا گیا ہے۔ تاریخیں اور نمونے درج ہیں۔ تمام اصناف سخن پر گفتگو ملتی ہے۔ اب تک کی تمام اردو تحریکوں کا جامع بیان ہے۔ تنقید کی روشنی ہر ضروری مقام پر جگمگاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک ہو یا جدیدیت۔ دونوں کے بیان میں توازن پایا جاتا ہے۔ منطقی اور فلسفیانہ بنیاد ملتی ہے۔

قاری کو محسوس ہوگا کہ ص ۵۹ تا نمبر ۲۹۳ پر بعض شعرا کے نام اور تخلیقات کا محض اندراج

ہے۔ مصنف نے جگہ کی کمی کا عذر بھی پیش کر دیا ہے مگر ان میں سب نہیں تو چند کا مختصر ذکر ضروری تھا۔ مثلاً اسمٰعیل میرٹھی، جوش ملسیانی، منور لکھنوی، نیاز حیدر اور نریش کمار شاد۔ آخری دو نام تو ہماری اردو شاعری میں بڑے اہم ہیں۔

چودھواں باب اردو ادب کی تاریخ تنقید کا خلاصہ ہے۔ جاگیردارانہ عہد سے دورِ حاضر تک اردو ادب نے انسانی اقدار عوامی مطالبات سماجی انصاف اور وطن پرستی کا پرچار کیا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے یہ کتاب مرتب کر کے ایک ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے۔ اردو ادب پر ان کا احسان ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

بدایوں کے چند ادبا و شعرا

مصنف: مبشر علی صدیقی
پبلشر: سلیم مبشر اردو سوسائٹی، محلہ سوتھہ۔ بدایوں (یوپی)
قیمت: دس روپے

مبشر علی صدیقی بدایونی بڑے ضبط و نظم کے مصنف ہیں۔ زندگی کے معمولات میں بھی مستعد اور کار بند اور ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے میں اپنا جواب آپ۔ اس پر مستزاد ان کے قلم کی جولانی "بدایوں کے چند ادبا و شعرا" کا دوسرا اڈیشن چھاپ دیا۔ غالباً اب مصنف کی سترہ تصانیف قارئین تک پہنچ گئی ہیں۔

اس اڈیشن میں ترمیم شدہ مواد ہے اور بعض اضافے بھی مثلاً "قمر بدایونی"۔ یہ فانی کے ہم عصر تھے۔ فانی نے بدایوں چھوڑ کر اٹاوہ، حیدرآباد وغیرہ شہروں میں اپنی زندگی گزار دی قمر بدایونی نے شہر میں عظیم مشاعروں کا اہتمام کیا۔ ان کی شخصیت دل آویز اور ترنم دل نشیں تھا۔ شاگردوں کی ایک فوج اکٹھی رہتی تھی۔ ہندستان کے اہم مشاعروں میں ان کی شرکت ناگزیر تھی۔ ان کے ساتھ ان کے صاحب زادے ارشدی بھی ہوتے تھے۔ ان کا رنگ خوب جمتا تھا۔ علی گڑھ میگزین میں قمر بدایونی کی غزلیں اہتمام سے چھپتی تھیں۔ "قافیہ کی بحث" پر ایک مضمون بالاقساط شائع ہوا نہایت معلوماتی اور مستند قسم کا مضمون تھا۔ زیر نظر کتاب میں قمر بدایونی پر اتنا مواد ہے اور معتبر جو کہیں نہیں مل سکتا۔ مصنف نے شاعر کے صاحبزادے ارشدی (کراچی) سے معلومات فراہم کی ہیں۔ قمر بدایونی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نثری نوادر کے بارے میں جان کر خوشی ہوتی ہے۔ چند شعر سنیے:

بیکار تھے شکوے غیروں کے بے سود ہمارا رونا تھا
ہم تم سے گئے تم ہم سے گئے آخر وہ ہوا جو ہونا تھا
کچھ عمر گزاری غفلت میں کچھ سنگدلوں کی الفت میں
افسوس ہماری قسمت میں یا سونا تھا یا رونا تھا
یہ بات تو کہنے کو نہ رہی قاتل کی خوشی کی قدر نہ کی
جاں آج نہیں تو کل جاتی یہ دن تو آخر ہونا تھا

فانی بدایونی پر ریسرچ کرنے کے لیے مصنف کی زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ ضروری ہے مجتہد الدین حبش، یعقوب حسین، ضیاء القادری اور مظفر علی برق کے حالات جاننا ضروری ہیں۔ مولانا ابراحسنی گنوری پر مختصر مضمون ہے مگر اس سے مولانا کے علمِ عروض و بیان اور فیضِ اصلاحِ سخن پر روشنی پڑتی ہے۔ قاری کو علی حاتم بدایونی مزاح نگار، ابرار حسین قادری، لکشمی نرائن جوہر ظہیر دہلوی کے ایک شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی، پروفیسر آلِ احمد سرور، سید محفوظ علی بدایونی، شکیل بدایونی اور دلاور فگار بدایونی کے متعلق صحیح معلومات ملیں گی۔

سچ یہ ہے کہ مصنف کا دم غنیمت ہے اور وہ بڑی پامردی اور بلند حوصلگی سے اردو ادب کے گم شدہ اور نایاب اوراق کو جمع کر کے قارئین کو فیض پہنچا رہے ہیں۔

کتاب عمدہ چھپی ہے۔ اردو کے پرستاروں کو تعاون کی ضرورت ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

جہانِ ادب
(تذکرۂ شعراء)

مرتب و ناشر: منزل لوہاٹھیری
ملنے کا پتا: منزل دارالادب بدایوں
قیمت: دس روپے

آج کل ہندستان اور پاکستان کے نامور اہلِ قلم عالمی سطح کے منصوبوں کی تکمیل میں مصروف رہنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں اور دوراندیشی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس لیے اردو ادب کے بعض موضوعات کی طرف ایسے افراد کو توجہ کرنا پڑتی ہے جن سے وقت اس قسم کا مطالبہ نہیں کرتا۔ ہمارے سامنے اس کی ایک مثال تذکرہ نویسی ہے۔ مختلف علاقوں سے تذکرے شائع ہو رہے ہیں۔ اس سے اردو ادب میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔

منزل لوہاٹھیری نے ضلع بدایوں کے شعرا کا تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس ضلع میں پانچ تحصیلیں ہیں۔ (بدایوں، گنور، سہسوان، بسولی، داتاگنج)

چناں چہ مرتب نے تمام تحصیلوں اور ان سے متعلق بعض مواضعات کے شعرا کو شامل کر لیا ہے۔

اس تذکرے میں تقریباً دو سو شاعروں اور نثر نگاروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

مرتب نے کوئی اصولِ ترتیب قائم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ بعض معروف شعراء کے اشعار غلط درج ہیں۔ بعض شعرا کی ولدیت اور تصانیف کا اندراج غلط ہے۔ کتابت میں غیر یکسانیت ہے۔

مرتب کی محنت اور صرفِ زر کا تصور کر کے افسوس ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جہانِ ادب (تذکرۂ شعرا) کا مسودہ اگر عبداللہ ولی بخش قادری، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی میں سے کسی ایک کی نظر سے گزر جاتا "تو کچھ اور چیز ہوتا"۔ توقع ہے کہ دوسرے اڈیشن میں موضوع کے ساتھ انصاف برتا جائے گا۔

جہاں تک منزل لوہاٹھیری کی نیک نیتی، حوصلے اور مالی ایثار کا سوال ہے ان کے جذبے، کاوش اور کوشش کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اس لحاظ سے بھی کہ انھوں نے

اپنے ضلع کے نئے لکھنے والوں کو فراموش نہیں کیا ہے اسی نسل کے بعض افراد مستقبل میں نامور اہلِ قلم کا مرتبہ حاصل کر سکیں گے۔

لائبریری اور مقالہ نگار حضرات کو "جہانِ ادب" سے استفادہ کرنا چاہیے (ڈاکٹر سیفی پریمی)

مقالاتِ یومِ جوہر

مرتب و ناشر: اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ۔
قیمت: چھ روپے

اردو اکاڈمی اترپردیش نے لکھنؤ میں ۷ر اور ۸ر جنوری ۱۹۸۳ء کو "مولانا محمد علی جوہرؒ پر سیمینار منعقد کیا تھا۔" مقالاتِ یومِ جوہر اسی کا حاصل ہے۔ اکاڈمی نے چند مقالات اور توقیت جوہر کو شائع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے پیش لفظ لکھا ہے۔ مقالات کی نوعیت یہ ہے:

۱۔ مولانا محمد علی اور تحریکِ خلافت (مفتی محمد رضا انصاری)
۲۔ جذباتی راہ نما (رشید حسن خاں)
۳۔ دیوانۂ آزادی (صباح الدین عمر)
۴۔ مولانا محمد علی جوہر اپنے خطوط کے آئینے میں (صباح الدین عبدالرحمان)
۵۔ مولانا محمد علی جوہر کی صحافت نگاری (عبداللطیف اعظمی)
۶۔ محمد علی بہ حیثیت صحافی (ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی)

"توقیتِ جوہر" کارآمد چیز ہے اس سے بعض واقعات کے تاریخی تسامح کی صحت ہو جاتی ہے۔ نیز اہلِ قلم کو مولانا محمد علی پر مضامین لکھنے میں سہولت ملے گی۔ آخر میں اشاریہ درج ہے۔

توقیت کے مطابق مولانا محمد علی کی پیدائش محلہ لنگر خانہ رام پور میں ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء کو ہوئی اور ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء میں ہائڈ پارک ہوٹل لندن میں وفات پائی۔

اس کتاب کے موضوعات سے قطع نظر اس میں خلافت اور کانگرس تحریک کے اہم واقعات اور نامور شخصیات کے کارناموں کا ذکر ملتا ہے اور مضمون نگار کے ذہن اور معیار کے مطابق بعض مسائل کا تجزیہ بھی شامل ہے۔

کم قیمت ہونے کے ساتھ کتاب اچھی چھپی ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

نذرِ ودود

مرتب: عباس علوی
ناشر: بزمِ ودود، سیہور (ایم، پی)
قیمت: پانچ روپے

اہلِ قلم کو یاد رکھنا اور ان کی یادگار منانا نہ صرف اخلاقی فرض بلکہ ادبی اور تاریخی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود کی پیدائش جے گہاں ضلع جون پور (یوپی) میں ہوئی حمیدیہ کالج بھوپال اور وکرم یونی ورسٹی اجین میں تعلیم پائی۔ کئی کالجوں میں اردو ادب کا درس دیا آخر میں گورنمنٹ ڈگری کالج سیہور (ایم پی) میں صدر شعبۂ اردو تھے۔ معاشرے کی گراوٹ اور

نظم ونسق کی بدنظمی کے باعث ان کا رشتۂ حیات منقطع ہوگیا۔ ۴ر جنوری ۱۹۸۱ء کو ڈاکوؤں کی بے رحم گولی کا شکار ہوئے ۔ ان کے ہمدرد اور رفیقوں نے "بزم ودود" سیہور قائم کی ہے۔ ہر برس مقتول صاحبِ علم کی یاد منائی جاتی ہے۔ طرحی مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ ۱۹۸۳ء کی روداد کو عباس علوی نے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالودود کی حیات اور کرداری اوصاف پر صنعیہ ودود، ڈاکٹر مظفر حنفی، قمر جمالی، اقبال مسعود اور عباس علوی نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ۴ر جنوری ۱۹۸۲ء کو ڈاکٹر عبدالودود کی پہلی برسی کے موقع پر دو طرحی مصرعے دیے گئے تھے۔

۱۔ علم وفن کا تھا ستارہ ڈاکٹر عبدالودود

۲۔ ہر آئینے میں دیکھی ہے سیرت ودود کی

۴ر جنوری ۱۹۸۳ء کو دوسری برسی تھی۔ مشاعرہ حسبِ ذیل طرحی مصرع پر منعقد ہوا۔

ذرّے دل کو آفتاب بنایا ودود نے

"نذرِ ودود" میں تقریباً تیس شاعروں نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ سیہور کے علاوہ دیگر صوبوں کے شعرانے بھی شرکت کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود کی تصویر چھپی ہے۔

"نذرِ ودود" کی خریداری اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ اس رقم سے "بزم ودود" مرحوم کے تحقیقی مقالے "ادبِ لطیف" اور دیگر مضامین کی نشان وار اشاعت کر سکے گی جس سے خاندانِ ودود کو خوشی ملے گی

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

بالِ جبریل

(ایک مطالعہ)

مصنف: ڈاکٹر کاظم ہاشمی

ناشر: آزاد بک سینٹر، پٹنہ ۴

ملنے کا پتا: کتاب منزل۔ سبزی باغ، پٹنہ ۴

قیمت: دس روپے

غالب اور اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہنوز سلسلہ جاری ہے۔ اردو میں قاری اور طالبِ علم دونوں کی ضرورتیں باقی ہیں۔ بعض مقامات کی تشریح کی ہے۔ مثلاً فلسفۂ تعلیم، انسانِ کامل، خودی، عشق، فقر، مسجدِ قرطبہ، لینن، ذوق وشوق، دین وسیاست، جبریل وابلیس، ساقی نامہ اور شاہین وغیرہ۔ ان موضوعات پر اردو کے مستند اور اہلِ نظر حضرات نے اتنا لکھا ہے کہ "اقبالیات" کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر ان کی تصانیف سے عام طلبہ فیض نہیں پا سکتے ہیں اس لیے کہ وہ رموز واسرار اور فلسفیانہ مسائل ان کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہیں۔

ڈاکٹر کاظم ہاشمی نے مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولانا ابوالحسن ندوی اور سید نذار عظیم کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے اور مذکورہ مقامات کو صفائی، سادگی اور آسانی سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ باتیں ذہن نشین ہونے کے بعد کم استعداد قارئین اور عام طلبہ اقبال کے پیغام کو صحیح طور پر سمجھ سکیں گے۔ ان میں مزید

مطالعے کا شوق پیدا ہوگا اور وہ مشکل مقامات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔
سید بہاء الدین کلیم نے اس کتاب کا پیش لفظ تحریر فرمایا ہے ایک جملہ نقل کرنا کافی ہے۔
"ڈاکٹر کاظم ہاشمی نے "بال جبریل" کی نظموں کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے۔"
کتابت و طباعت پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ قیمت زیادہ ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

پردۂ غفلت
(ایک مطالعہ)

مصنف: نسیم اختر
ناشر: آزاد بک سینٹر، پٹنہ ۴۔
قیمت: چار روپے پچاس پیسے

"آزاد بک سینٹر پٹنہ" نے بعض اہم موضوعات پر چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کرنے کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک کتاب "پردہ غفلت" ڈراما ہے جو ڈاکٹر سید عابد حسین کی تصنیف ہے۔ یہ ڈراما بار بار چھپ رہا ہے۔ جامعہ ملیہ کے طلبہ نے اس کو اسٹیج پر کئی بار دکھایا ہے۔ یہ ڈراما نصابی اور غیر نصابی طور پر بھی کام آتا رہا ہے۔

نسیم اختر نے "پردہ غفلت" کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ملک کے نامور ناقدین کی رائے بھی پیش نظر رہی ہیں۔ اس مخصوص ڈرامے کے علاوہ ڈراما کی تاریخ، فن اور اردو ڈراموں کے مختلف مراحل کا ذکر کیا گیا ہے۔

"پردۂ غفلت" پہلی مرتبہ جرمنی میں برلن سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کے نزدیک اردو نثر میں لکھا ہوا یہ پہلا ڈراما ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کی رائے میں زمین دار طبقہ جس قسم کے بحران میں مبتلا تھا اور عقائد کی دنیا میں روایت اور درایت کے درمیان جو کش مکش جاری تھی۔ اس کا عکس اس ڈرامے میں ہمیں نظر آتا ہے۔

نسیم اختر نے اس ڈرامے کے پس منظر، پلاٹ، مکالمہ نگاری، کردار نگاری وغیرہ موضوعات پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اسی ضمن میں اردو کے دیگر ڈراموں کی بحث بھی شامل ہے۔ "پردۂ غفلت" کا خصوصی کردار احمد حسین کو قرار دیا ہے۔ ایک کردار شیخ ہے مگر وہ مکالموں میں کم ہے۔ ہر کردار پر تبصرہ کیا گیا ہے اور منی نقطۂ نظر سے اپنی رائے پیش کی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے عام قارئین اور طلبہ کو فن ڈراما اور خصوصاً "پردۂ غفلت" کے متعلق بہم معلومات پہنچتی ہیں۔
کتاب معقول طور پر چھپی ہے۔ قیمت بھی کم ہے (ڈاکٹر سیفی پریمی)

مضامین ڈاکٹر عبدالودود

مرتبہ: صفیہ ودود
پبلشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج دہلی ۲
قیمت: پچیس روپے

اتر پردیش اردو اکیڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہونے والی یہ کتاب ڈاکٹر عبدالودود

کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ادبی رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالودود اردو زبان کے ان خاموش خدمت گاروں میں سے تھے جنھوں نے ساری عمر مالی منفعت اور شہرت کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور مدھیہ پردیش میں ایک چھوٹے سے شہر سیہور کے ایک گم نام گوشے میں بیٹھے نہایت خلوص کے ساتھ زبان اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ ان کی شخصیت کا خمیر سادگی، خلوص اور صداقت سے تیار ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان سے ملنے کے بعد مسرت اور طمانیت کا احساس ہوتا۔ احباب کے لیے ان کی صاف ستھری زندگی قابلِ رشک تھی۔ تو شاگردوں کے لیے باعثِ فخر و محبت۔ ان کے مزاج کا پرتو ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ افسوس کہ چند برس پیشتر اردو کے اس روشن چراغ کو زمانے کی نظر لگ گئی اور ایک دردناک حادثہ ہوا کہ ہر شخص کو روتا بلکتا چھوڑ کر ودود صاحب دارِ فانی سے کنارہ کش ہو گئے۔

دنیائے ادب میں ان کی طبیعت کا میلان نثر کی جانب رہا۔ اردو میں ادب لطیف کے موضوع پر تحقیقی کام مکمل کرنے کے بعد ہندی کے وسیلے سے بھی اردو کو سمجھنے اور سمجھانے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ "اردو سے ہندی تک" ان کی دوسری کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اردو اور ہندی کی قومی شاعری پر ودود صاحب کی گہری نظر تھی۔ اس موضوع پر بہت سا کام بھی کیا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کام بھی راہ میں دم توڑ گیا۔

زیرِ نظر کتاب میں ان تمام موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے جن سے یا تو مصنف کا قلبی تعلق ہے یا نظریاتی اتفاق لیکن مضامین پڑھتے ہوئے کسی قسم کی جانب داری کا احساس نہیں ہوتا۔ قوم، قومیت اور قومی یک جہتی بھی ودود صاحب کے پسندیدہ موضوعات میں موصوف نے ان موضوعات پر بڑے مدلل انداز میں بحث کی ہے۔

شبلی، اقبال سہیل اور شاد عارفی کی شاعرانہ بصیرت اور فن کاری پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو رام دھاری سنگھ دنکر اور وشنیت کمار کو بھی فراموش نہیں کرتے یہ ان کی نظر اور مطالعہ دونوں کی وسعت کا ثبوت ہے۔

مضامین ودود کے موضوعات میں خیالات کا تنوع، نظر کی وسعت اور زبان میں شخصیت کی سادگی اور طہارت کا عکس ہے۔ الفاظ کے مزاج سے انھیں خاص دلچسپی تھی وہ ہر زبان کے شیریں الفاظ کے رسیا تھے۔ اردو زبان میں ہندی کے نرم و شیریں الفاظ' ان کے ایک مضمون کا عنوان ہے۔ عنوان ہی سے ان کی وسیع القلبی اور اپنی زبان سے دلچسپی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ہندستان کے دوسرے علاقوں کی طرح بھوپال بھی اپنی کچھ علاقائی خصوصیات سے متصف ہے اس کی زبان اور لب و لہجے کی انفرادیت کو مشہور مزاح نگار تخلص بھوپالی نے مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب خوب برتا ہے ودود صاحب نے پان دان والی خالہ کے خالق تخلص صاحب کے توسط سے دو مضامین میں بھوپال کی زبان کا تجزیہ کیا ہے۔

قدیم بھوپال کی تہذیب و ثقافت میں جن تین چیزوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان میں ایک

بڑا اثاثہ لائبریری ہے دوسری تاج المساجد اور تیسرا سیفیہ کالج اور اردو دنیا میں سیفیہ کالج شعبۂ اردو کے وسیلے سے پہچانا جاتا ہے۔ شعبۂ اردو پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا شاہکار ہے بہت سے دوسرے اردو ادب کے شیدائیوں کی طرح ودود صاحب بھی اس سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اس کے تحقیقی مقالات کا جائزہ لے کر اس کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

مضامین عبدالودود کا مطالعہ ادب کے ہر طالب علم کو موضوعات کی ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں اکتا دینے والی یکسانیت کا دور تک پتا نہیں۔ (خالد محمود)

یادِ فانی

مرتب: طارق سبزواری

ملنے کا پتا: کراچی لٹریری فورم۔ سی ۸۶ بلاک۔ اے شمالی ناظم آباد کراچی (پاکستان)

یادِ فانی کتابچہ جشن صدسالہ پیدائش فانی بدایونی کے موقعہ پر کراچی لائبریری فورم نے شائع کیا ہے۔ اسی لائبریری فورم نے ۱۳ ستمبر ۱۹۷۹ء کو کراچی میں جشن پیدائش منایا تھا اور یہ تاریخ فانی کی تاریخ پیدائش ہے۔ کتابچہ صرف ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت درج نہیں ہے۔ گیٹ اپ، کتابت و طباعت عمدہ ہے اور اس کو ریڈنگ روم کی میز پر مطالعہ کے لیے رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے مرتب طارق سبزواری ہیں جو چند سال قبل ہندستان کے مشاعروں میں ایک جانے پہچانے اور مقبول شاعر تھے۔

پہلا مضمون پروفیسر آل احمد سرور کا ہے جو علی گڑھ میگزین کے فانی نمبر سے اخذ کیا گیا ہے۔ فانی نمبر علی گڑھ میگزین کا غالباً ساجد علی خاں رازؔ کی ادارت میں ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ سرور کا یہ مضمون کافی پرانا اور کئی جگہ اس کو ماخوذ کیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ہے جو تین صفحات پر مشتمل ہے اور پہلے دو صفحات میں میر اور غالب کی شاعری سے بحث کی گئی ہے اور فانی کے حصے میں صرف ایک صفحہ آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس ایک صفحہ میں اس بات پر بحث کی ہے کہ فانی نے بدایوں کیوں چھوڑا۔ فانی کے اشعار سے مدد لے کر وہ اس سلسلہ میں کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن مکمل کر نہ کہہ سکے اور مضمون یکایک ان جملوں پر ختم کر دیا: "فانی پر کسی قدر تفصیل سے لکھنا مجھ پر قرض ہے۔ خدا کرے اس قرض کے بار کو اتارنے کا کوئی اور موقع مل سکے ورنہ یہاں بھی۔

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں

سب کچھ ہے۔ اور ایک بات کہ میں بھی شاید اسی قبیلہ کا ایک فرد ہوں۔ میر، غالب، فانی نہ سہی، ان کے سلسلے سے سہی۔" آپ نے دیکھا ڈاکٹر صاحب کس خوب صورتی سے مضمون لکھنے سے بھی بچ گئے اور اپنا سلسلہ میر، غالب اور فانی سے بھی ملا دیا۔ اس کے بعد نابش دہلوی، پروفیسر ممتاز حسین اور محمد ایوب قادری کے مضامین ہیں جن کو تنقیدی مضامین کے بجائے تاثراتی مضامین کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ پروفیسر ممتاز حسین نے البتہ فانی کے فن پر کچھ روشنی ڈالنے کی

کوشش کی ہے لیکن زیادہ تفصیل سے وہ بھی نہ لکھ سکے۔ مضمون صرف چار صفحات پر مشتمل ہے معلوم ہوتا ہے مضمون نگاروں کو ادارہ کی طرف سے مختصر مضامین لکھنے کی مختصر ہدایت دی گئی تھی۔ صفحہ ۲۷ سے ۴۶ تک مختلف ادبا و شعرا کے فانی اور اس کی شاعری کے متعلق تاثرات درج ہیں۔ اس باب کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یعنی عہد حاضر اور کاروانِ رفتہ ـــ عہد حاضر میں مجنوں گورکھ پوری، فراق گورکھ پوری، میکش اکبر آبادی، غلام مصطفیٰ خاں کرار حسین، احمد ندیم قاسمی، عبادت بریلوی، رئیس امروہوی، وزیر آغا، ابوالفضل صدیقی، محمد شمس الدین صدیقی، مجتبیٰ حسین، فرمان فتح پوری، ابوالخیر کشفی، جمیل جالبی اور سلیم احمد ہیں۔ اور کاروانِ رفتہ میں رشید احمد صدیقی، ضیا احمد بدایونی، جگر مراد آبادی، سیماب اکبر آبادی، احتشام حسین، ماہر القادری، حیرت بدایونی اور سبطین احمد بدایونی ہیں۔ یہ سب اصحاب کی رائے ان کے مضامین میں ہم سب سے پہلے پڑھ چکے ہیں لیکن یہاں ان کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ اس لیے قندِ مکرّر کا لطف آ گیا ہے۔ آخر میں اوج سبزواری کی فانی پر ایک نظم ہے۔ اور اس کے بعد فانی کی دو رباعیات اور کچھ منتخب اشعار درج ہیں۔ ہم ہندستان والے منتظر رہتے ہیں کہ کسی اردو شاعر یا ادیب پر پڑوسی ملک کے لکھنے والوں کی کوئی خبر شائع ہو اور ہم اسے آنکھوں کا سرمایہ بنائیں اور اسی جذبے کے ماتحت اس کتابچہ کے پڑھنے کی ناظرین سے سفارش کی جاتی ہے۔

(مبشر علی صدیقی)

اردو نثر کا دہلوی دبستان

مصنف: ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار
ملنے کا پتا: شعبہ اردو، ایس بی آر ایس بیجاپور (کرناٹک)
قیمت: بیس روپے

ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار استاد شعبۂ اردو، ایس، بی، آر، ایس، کالج بیجاپور (کرناٹک) کا یہ تحقیقی مقالہ ہے جو موصوف نے شیواجی یونی ورسٹی کی پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا اور جس پر آپ کو یہ ڈگری عطا کی گئی تھی۔ کتابی شکل میں اس کو ۱۹۷۵ء میں شائع کیا گیا ہے۔ موصوف اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "گو بات پرانی ہو چکی ہے اور جنوبی ہند کے رسائل و اخبارات میں اس پر تبصرے بھی ہو چکے ہیں، لیکن شمالی ہند کے اس پر مناسب تبصرے نہیں ہوتے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے آپ کو تبصرہ کی زحمت دی جاتی ہے"۔ مقالہ نگار مشہور دکنی شاعر نصرتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہوں نے آپ کے خاندان کو جاگیر عطا کی تھی، جس کے آج کل آپ امین ہیں اور اسی مناسبت سے اپنے نام کے آگے جاگیردار لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام عمر نے تعارف لکھا ہے اور پیش لفظ خود مصنّف کے قلم سے ہے۔ کتاب ۶۸۸ صفحات پر محیط ہے اور مصنّف سے ان کے کالج کے پتے سے مل سکتی ہے۔ قیمت بیس روپے ہے اور لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ کاغذ اور جلد اوسط درجے کے ہیں۔ مجھے اس کتاب کے پڑھنے میں دو تین مہینے لگ گئے جس کے لیے

مصنف سے معذرت خواہ ہوں۔ اس موضوع پر تین اور کتابیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں اور ان تینوں کا شمار اردو نثر کی معیاری تاریخوں میں ہوتا ہے۔ پہلی کتاب تو سیر المصنفین حصۂ اول اور دوم ہے جو محمد یحییٰ تنہا نے عرصہ ہوا تالیف کی تھی۔ کافی دنوں تک اردو نثر کی یہ پہلی تاریخ رہی جس طرح اردو نظم کی پہلی تاریخ محمد حسین آزاد کی "آب حیات" تھی۔ اس کا نیا اڈیشن مع ایک مبسوط مقدمہ کے ڈاکٹر امیر اللہ شاہین صدر شعبۂ اردو میرٹھ یونیورسٹی نے گزشتہ سال شائع کیا ہے۔ دوسری کتاب جناب حامد حسن قادری کی "داستان تاریخ نثر اردو" ہے جو سند کا درجہ رکھتی ہے اور جس میں تازہ ترین تحقیقی مواد کو سامنے رکھا گیا ہے اور آج کل ہندستان و پاکستان کی بیشتر جامعات میں ایم۔ اے (اردو) نصاب میں شامل ہے۔ تیسری کتاب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کا تحقیقی مقالہ "دہلی کا دبستان نثر" ہے۔ موصوف کو بھی اس مقالہ پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرحیم نے علاوہ اور تحقیقی مواد کے ان تینوں کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اور ان تینوں کتابوں کا نام آخر میں "کتابیات" کے تحت واضح طور پر لکھا ہے اور کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے ان تینوں کتابوں کے مواد کی اچھی طرح چھان بین بھی کی ہے۔ انھوں نے کتاب کی ترتیب جدید سائنٹفک اصولوں پر دی ہے۔ اور ہر موضوع پر کافی مواد پیش کیا ہے۔ حالاں کہ وہ اس سلسلے میں کوئی نئی ریسرچ پیش نہ کر سکے لیکن ان کا طرز بیان اتنا سلجھا ہوا ہے کہ ضخامت کے باوجود کتاب پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور پڑھنا شروع کر دیا تو ختم کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ آج کل حال یہ ہے کہ اردو نثر و نظم میں جدید تحقیقات کی روشنی میں کوئی نہ کوئی نئی چیز دوسرے تیسرے ماہ دیکھنے میں آجاتی ہے۔ تحقیق کا میدان اتنا وسیع ہے کہ یہاں معتبر سے معتبر محقق اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحیم جاگیردار نے اردو نثر کے ارتقا پر سلجھے ہوئے انداز میں کافی روشنی ڈالی ہے لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ اردو نثر کی پہلی کتاب کون سی ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین یا ملا وجہی کی "سب رس" یا کوئی اور کتاب؟ کتابت کی غلطیوں کا بار بار اعادہ کرنا بھی وقت ضائع کرنا ہے۔ کیوں کہ اس قسم کی غلطیاں لیتھو میں چھپی کتابوں کا مقدر بن چکی ہیں۔ اس سات سو صفحات کی کتاب میں کتابت کی غلطیاں ہیں" اور جو دوسرے اڈیشن میں درست کی جا سکتی ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ یونی ورسٹی کی طلبہ اور عام ناظرین اس سے رہنمائی کا کام لیں اور یقیناً یہ کتاب ایک اچھے رہنما و رفیق کا کام دے سکتی ہے۔ فاضل مصنف اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی جلد شائع کریں۔ جن میں اس صدی کے ساتویں اور آٹھویں دہے کے معیاری نثر نگاروں کا تفصیلی تذکرہ درج ہو۔

(مبشر علی صدیقی)

خواجہ غلام السیدین: حیات اور کارنامے

مصنف: ڈاکٹر سید فرحت حسین
ملنے کا پتا: سید ارشد حسین ۲/E ترکمان گیٹ، دہلی ۶
قیمت: ۴۵ روپے

"خواجہ غلام السیدین: حیات اور کارنامے" ڈاکٹر سید فرحت حسین کا تحقیقی مقالہ ہے جس

جائزے

اقبال کا نظامِ فن

مصنف: ڈاکٹر عبدالمغنی
ناشر: مکتبہ مریخ۔ پٹنہ
قیمت: تیس روپے

ڈاکٹر عبدالمغنی دورِ حاضر میں اردو ادب کے بالغ نظر اور منفرد نقاد ہیں۔ اردو کے مختلف نقادوں کی بھیڑ میں وہ اپنی تنقیدی انفرادیت کی بنا پر سبھوں سے الگ پہچانے جاتے ہیں اور یہی خصوصی پہچان دوسرے نقادوں کے مقابلے میں ان کو ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے طبع زاد تخلیقات سے قطع نظر تنقید کے میدان میں اپنے ذہنِ رسا کے وہ جوہر دکھلائے ہیں کہ بڑے بڑے مردِ میدان کے چھکے چھوٹ گئے۔ ان کے پیش کیے ہوئے تنقیدی آئینہ میں جب دوسرے نقادوں نے اپنے آپ کو دیکھا تو ان کو اپنی علمی صلاحیتوں اور تنقیدی حیثیتوں کا اندازہ ہوا، اور ان حضرات نے خود اپنی قدآور شخصیت کو بونے قد میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔

ڈاکٹر عبدالمغنی تنقید میں لگی لپٹی بات کہنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنے خیالات کو چھپا چھپا کر اور باتوں کو چبا چبا کر بیان کرنے کے عادی نہیں۔ بلکہ اپنے مقرر کردہ موقف کے پیش نظر صاف صاف بے لاگ اور دو ٹوک باتیں کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں تو موصوف نے اپنی مختلف تصنیفات میں "ترقی پسندی اور اشتراکیت کے خلاف ٹکر لی ہے اور اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی روشنی میں "جدیدیت" کی ادبی گمراہیوں کے خلاف بھی جھنڈا بلند کیا ہے۔ مگر سب سے اہم کام انھوں نے جو کیا ہے وہ یہ کہ اقبال شکن طاقتوں کے مقابلے میں وہ سینہ سپر ہو گئے۔ اقبال کے ضمن میں انھوں نے جو تصنیفی معرکے سر کیے ہیں، ان میں سب سے اہم معرکہ وہ تصنیف ہے جو ۱۹۸۲ء میں "اقبال اور عالمی ادب" کے نام سے منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ دراصل یہ کتاب، کلیم الدین احمد صاحب کی لکھی ہوئی کتاب "اقبال ایک مطالعہ" کے رد میں لکھی گئی اور حقیقت یہ ہے کہ کلیم صاحب نے اپنی مغرب زدگی کے پیش نظر اقبال کے خلاف جو زہر افشانیاں کی ہیں۔ یہ کتاب تریاق کا کام کرتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب "اقبال کا نظامِ فن"، ڈاکٹر عبدالمغنی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ اس کتاب میں ان کی علمی وسعت اور تنقیدی بصیرت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ عام طور پر اقبال کے سلسلے میں زیادہ تر بحثیں ان کے مخصوص تصورات سے متعلق ہوتی رہی ہیں۔ حالاں کہ اقبال کی فنکارانہ انفرادیت فن کے برتاؤ میں مضمر ہے، یعنی وہ مواد کو فنی اعتبار سے شاعرانہ حسن کا منفرد پیکر عطا کرتے ہیں۔ مواد کو شاعری بنانے کے سلسلے میں تخلیق کے جن اجزائے ترکیبی سے کام لیتے ہیں، اس سے ان کی فنکارانہ چابک دستی اور شاعرانہ ہنرمندی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس نکتے کو ڈاکٹر عبدالمغنی نے بھی سمجھا ہے اور سمجھ کر اقبال کی فکرِ بلند کے ساتھ ساتھ ان کی فنی حیثیتوں پر دانشورانہ نظر ڈالی ہے۔ اقبال کے ساتھ ایک ستم یہ بھی ہوتا آیا ہے کہ نظموں کے مقابلے میں ان کی غزلوں، رباعیات و قطعات پر لوگوں نے کم توجہ دی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالمغنی نے قاری کو اقبال کی غزلوں کے علاوہ رباعیات و قطعات کی طرف بھی متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے اور خاص طور سے ان کی غزلوں کی معنوی نزاکتوں اور فنی لطافتوں کو اس حسن و خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے کہ ان کی علمی

فراست کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ 'بانگ درا'، 'بال جبریل'، 'ضرب کلیم' اور 'ارمغان حجاز' میں اقبال کا جتنا بھی مطبوعہ اردو کلام ملتا ہے، ان پر موصوف نے اپنے موقف کی روشنی میں سیر حاصل جائزہ پیش کیا ہے اور ان کی فن کارانہ خصوصیتوں کو نمایاں کر کے ایک اہم تنقیدی فریضہ کی ادائیگی کی ہے۔ بعض بلند اور نازک شاعرانہ مقامات ایسے ہیں جن کی حدوں کو چھو کر افہام و تفہیم کا بہترین ثبوت دیا ہے۔

اس کتاب میں "تصورِ فن" کے عنوان سے جو سطریں صفحہ ۱۸ سے صفحہ ۵۹ تک پھیلی ہوئی ہیں ان میں اقبال ہی کے اشعار سے ان کی ادبی اور تنقیدی نظریات کی جو وضاحت پیش کی ہے وہ بے حد کارآمد اور مفید ہے اور ان صفحات کے مطالعہ سے اقبال کے ادبی و فنی مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اقبال کی اردو نظموں سے متعلق تو کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے مگر اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالمغنی کے مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے کچھ خاص باتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اقبال کا کلام شاعری کی جن صنفوں میں بھی موجود ہے، ان تمام اصنافِ شاعری کے پیشِ نظر کلام کا جائزہ نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب متوازن و متناسب بھی ہے اور فکری تطہیر کا نمونہ بھی! المختصر اقبالیات کے سلسلے میں یہ کتاب ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مطالعہ یقیناً قاری کو اقبال سے قریب کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ (قیوم خضر)

پریم چند کا فنی و فکری مطالعہ

مصنف: سید محمد عصیم
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
قیمت: تیس روپے

پریم چند کا زمانہ ہندستان کی تاریخ کا ایک انتہائی بحرانی دور تھا۔ ہندستانی سماج میں حکمرانوں کی تبدیلی سے محض طرزِ حکومت ہی نہیں بدلا تھا بلکہ ایک نئے سماجی نظام نے بھی جنم لیا تھا۔ پریم چند نہ صرف اپنے عہد کے نبض شناس تھے بلکہ انھیں فن کی جمالیاتی قدروں کا بھی بھرپور ادراک تھا۔ اس لیے ان کی نگاہ سماجی تبدیلیوں کے اوپری سطح کے منظر میں الجھ کر نہیں رہ گئی بلکہ اس سطح کے نیچے خاموشی کے ساتھ جو ارتقائی عمل جاری تھا اسے انھوں نے اپنی تمام تر فن کارانہ شدتِ احساس کے ساتھ چھونے محسوس کرنے اور اس کے اظہار کی کوشش کی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی نگاہ شہر پر سے اچٹتی ہوئی دیہات پر جا کر مرکوز ہوتی ہے۔ پریم چند کو ہندستانی سماج کے تضادات دیہاتوں میں اپنی بھرپور اور انتہائی شکل میں نظر آتے ہیں اردو فکشن کی روایت پریم چند کے ساتھ پہلی مرتبہ نہ صرف دیہات کا رخ کرتی ہے بلکہ وہ یہیں ہندستان کے پیچیدہ انسانی مسائل پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

پریم چند کی تفہیم کے سلسلے میں سید محمد عصیم نے مجرد مباحث کے بجائے ان ابعاد تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جن سے پریم چند کا فکر و فن تشکیل پاتا ہے۔ پریم چند ان کی تحقیق کا موضوع رہا ہے۔ اور زیرِ نظر کتاب اس سلسلے کی کوششوں کا ایک خوب صورت نمونہ ہے۔ اس کتاب میں مختلف موضوعات پر آٹھ مضامین شامل ہیں اور ان تمام مضامین کے موضوعات پریم چند کے سلسلے میں خصوصی اہمیت

کے حامل ہیں دیہات اور ہریجن پریم چند کا خاص موضوع رہا ہے جن پر پہلی مرتبہ مصنف نے تفصیلی بحث کی ہے۔ کتاب کے ابتدائی دو مضمون بالترتیب ان ہی دو موضوعات پر ہیں۔ پریم چند کے ناولوں چوگان ہستی، میدان عمل اور گئودان میں تشدد اور عدم تشدد کی جو کشمکش ہمیں دکھائی دیتی ہے اس کی روشنی میں ہمیں ان کے اس ذہنی رویّے کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ ان کے ناولوں کے بین السطور میں جو کچھ ہے وہ بھی ہمارے سامنے آسکے۔ کتاب کے تیسرے مضمون میں پریم چند کی اس ذہنی کشمکش کو اس عہد کے سیاسی و سماجی تناظرات اور انسانی نفسیات کے پیش نظر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پریم چند سے قبل اردو ناول کا موضوع زیادہ تر مسلم معاشرہ تھا۔ پریم چند نے شہر سے نکل کر صرف دیہات کا ہی رخ نہیں کیا بلکہ اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے پورے ہندستانی معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔ دیہات میں ان کے گرد وپیش رہنے والا پچھڑا ہوا علاقہ کسان کھیت مزدور اور ہریجن ہے اس لیے ان کے یہاں ان لوگوں کے مسائل ہی زیادہ بیان کیے گئے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پریم چند کسی ایک فرقے یا جماعت کے مسائل سے بلند ہو کر پوری انسانیت کے مسائل کو اپنے دائرہ کار میں لاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے تخلیقی سفر کے کسی موڑ پر پریم چند کو محسوس ہوا کہ شاید صرف اردو میں ہی لکھنا ان کے لیے کافی نہیں بلکہ ان کو اگر اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانی ہے تو انھیں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھنا ہوگا۔ پریم چند کے بعض ناقدین اس بات کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ آریہ سماج تحریک سے متاثر تھے۔ یہ اور ایسے ہی بعض معاملات ایسے ہیں جن کی بنیاد پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا پریم چند فرقہ پرست تھے؟ سید محمد عصیم نے اپنے ایک مضمون میں اس سوال سے مدلل بحث کی ہے اور اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف پریم چند کی تخلیقات کے حوالوں پر اکتفا کیا ہے بلکہ اس عہد کے فرقہ وارانہ ماحول اور پریم چند کے شائع شدہ خطوط و مضامین کے حوالوں کے ذریعہ یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ فرقہ پرست نہیں تھے۔

گئودان پریم چند کا سب سے اہم ناول ہے موجودہ کتاب میں ایک مضمون گئودان پر تو ہے ہی اس کے علاوہ ایک دوسرے مضمون میں بھی جہاں ان کے بعض نمائندہ کرداروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تین کردار خود گئودان کے ہی ہیں یہ کردار ہیں ہوری دھنیا اور گوبر۔ کتاب کے آخری دو مضامین میں "زادِ راہ" کے افسانوں کا تفصیلی جائزہ ذہنی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

"پریم چند کا ذہنی و فکری مطالعہ" سید محمد عصیم کی ایک لائق تحسین کوشش ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ تفہیم پریم چند کے سلسلے میں یقیناً سود مند ہوگا

(ڈاکٹر اسلم پرویز)

شیخ ایاز (شخص اور شاعر)

مصنف: حمایت علی شاعر
ناشر: المصنفین (کراچی)
قیمت: پندرہ روپے

۱۱۲ صفحے کی ٹائپ میں چھپی ہوئی یہ چھوٹی سی کتاب "شیخ ایاز۔ شخص اور شاعر" اتفاقاً میرے

ہاتھ لگی تو ختم ہونے پر بھی میرے ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔ اکبر الہ آبادی کا مرید ہوں اس لیے ٹائپ کا حرف پڑھنے سے کتراتا تو نہیں گھبراتا ضرور ہوں لیکن یہ کتاب تو جیسے جان کو آ گئی۔

شیخ ایاز کا نام معلوم نہیں کب اور کہاں سنا تھا۔ کسی نے بتایا تھا سندھی زبان کا موجودہ دور کا سب سے بڑا شاعر شیخ ایاز ہے۔ ادھر ادھر کلام ڈھونڈا نہیں ملا تو پھر کسی سے پوچھنے کو جی نہیں چاہا اور سندھی شاعری کا شوق یوں جاتا رہا کہ چند سال پہلے سندھی کے ایک شاعر کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ دیا گیا تو بعد میں پتہ چلا کہ یہ ایوارڈ تو مالِ مسروقہ پر دیا گیا ہے۔ ایک ہی رسم الخط کی دو زبانوں کے اتحاد کا یہ واقعہ ذرا گراں گزرا۔ اس لیے نہیں کہ واردات سرقے کی تھی بلکہ اس لیے کہ میں نے اسے ساہتیہ اکاڈمی کے ایوارڈ کے ہائی جیک کی واردات جانا۔ لیکن اب یہ کتاب پڑھی تو سندھی زبان پر رشک آیا کہ کیا شاعر اسے ملا ہے اور یہ شیخ ایاز تو خود اردو کے بھی اچھے اور خوبرو شاعر نکلے۔ خوب رو میں نے اس لیے کہا کہ کیا کیا خوب صورت شعر انھوں نے کہے ہیں۔ حمایت علی شاعر کو میں شاعر کی حیثیت سے جانتا ہی تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ پچھلے سال میں اس شاعر نے نثر نگاری تحقیق اور ترجمے کی اتنی ساری منزلیں طے کر لی ہیں کہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ اورنگ آباد دکن کے اس شاعر نے حیدرآباد میں نام کمایا۔ لیکن حیدرآباد دکن میں نہیں بلکہ حیدرآباد سندھ میں۔ اس صدی کے چوتھے دہے میں حمایت علی شاعر اورنگ آباد دکن کے ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ تھے۔ اس وقت بھی شاعر تھے لیکن ہونہار اب وہ ایک مستند شاعر ہیں۔ کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں، دو اور زیر طبع ہیں۔ اس پر مستزاد نثر کی یہ کتاب جس کی دہری اہمیت ہے۔ کیوں کہ صرف شیخ ایاز کی شاعری کا تعارف نہیں اور سندھی اور اردو کے لسانی رشتے کی بولتی تصویر بھی ہے۔ اس کا انتساب یوں ہے" اردو سندھی ادیبوں اور شاعروں کے اتحاد کے نام"

آفاق صدیقی، صدر شعبہ اردو۔ گورنمنٹ کالج۔ میرپورخاص نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے" حمایت علی شاعر کا یہ مقالہ اپنی تحقیقی و تنقیدی اہمیت کے علاوہ اسلوب تحریر کے اعتبار سے بھی پرکشش ہے۔" پیش لفظ عام طور پر صحیح رہنمائی نہیں کرتے لیکن اس پیش لفظ کو قطب نما کہا جا سکتا ہے۔

حمایت علی شاعر نے لکھا ہے شیخ ایاز کو سننے کی آرزو ان کے دل میں اس وقت پیدا ہوئی جب ۱۹۴۹ء میں بھیمڑی کانفرنس میں پروفیسر رام پنجوانی کی زبانی انھوں نے شیخ کا شعر سنا تھا۔ شعر وہ سمجھے نہیں تھے لیکن شعر کی گھن گرج سے شاعر کے شعلہ نوا ہونے کی بات پکی تھی۔ حمایت شاعر کی یہ آرزو ۱۹۵۶ء میں پوری ہوئی۔ حمایت علی شاعر کو شاعر سے مصنف اور مترجم بنانے میں ان کی ذاتی قابلیت اور صلاحیت سے زیادہ میں سمجھتا ہوں، شیخ ایاز کی شخصیت اور شاعری کا دخل ہے۔ کتاب کے سرورق پر شاعر کی شبیہ دیکھ کر پہلے تو میں سمجھا۔ یہ شیخ محمد اقبال کے بھائی کی تصویر ہے۔ حالاتِ زندگی پڑھے تو پتا چلا کہ یہ شاعر تو سرکاری اسٹیٹس (Status) میں اقبال سے بھی آگے نکل گیا۔ اقبال چیف جسٹس نہیں ہو سکے تھے لیکن شیخ ایاز، سندھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے۔

شیخ ایاز کی شاعری کی عظمت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے کلام کے مترجمین میں الیاس عشقی، آفاق صدیقی، محسن بھوپالی، حمایت علی شاعر اور

فہمیدہ ریاض شامل ہیں اس کتاب کے ۹ مترجمین کے ترجمے موجود ہیں اور خود ارد و شاعری کے نہایت ہی لطیف نمونے۔ چوں کہ میں کتاب کے بارے میں لکھ رہا ہوں اس لیے شیخ ایاز کی شاعری کے بارے میں حمایت علی شاعر کی رائے نقل کرنی ہوگی۔

"ایاز کی شاعری کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ زندہ لفظوں میں بول رہی ہے۔ کوئی لمحہ کوئی قدر اور کوئی حقیقت وقت کی گرد میں دفن ہو کر فنا نہیں ہو گئی بلکہ ایک ابدی زندگی کے خواب کی طرح اس کے اشعار میں آنکھیں کھولے ہوئے ہے اور ایاز ان کو نئے لفظ نئے جسد اور نئے ادب میں آباد کرتا جا رہا ہے اور انھیں اپنے عہد کی آگہی دے رہا ہے"۔

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھی کا یہ مقبول اور مستند شاعر اردو زبان پر بھی کتنا عبور رکھتا ہے اور صرف شعر نہیں کہتا بلکہ سندھی شاعری کو اردو میں منتقل کرنے کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ شیخ ایاز نے شاہ عبداللطیف کے کلام کو اردو لباس عطا کیا ہے جو خود ایک کارنامہ ہے۔

یہ تو اندازہ تھا ہی کہ پاکستان میں بہت عمدہ شاعری ہو رہی ہے لیکن اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اچھی شاعری صرف اردو میں ہی نہیں، سندھی زبان میں بھی ہو رہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اردو شاعری سے بھی زیادہ وقیع ہو۔

لیکن شیخ ایاز سے آپ متاثر کیسے ہوں گے جب تک کہ اس کی سندھی اور اردو شاعری کے دو چار نمونے آپ نہ دیکھ لیں۔ یہ شاعر باغی بھی ہے رومانی بھی۔ ٹیڑھا بھی ہے اور ناک کی سیدھ میں چلنے والا عاشق بھی۔ دوہے، نظمیں، گیت، غزلیں، سب اس کی چٹکیوں میں بند ہیں۔ پہلے اردو کلام دیکھیے:

پھر کوئی سنگ بدست آتا ہے — خانۂ شیشہ گراں کی جانب
پھر کوئی نعرۂ مستانہ بڑھا — لرزش کوئے اماں کی جانب
پھر کوئی شبنم تخیل لیے — چہرۂ گل پہ مہکنے آیا
پھر کوئی فطرت قندیل لیے — صبح کاذب میں دمکنے آیا
پھر کوئی گردن مینا پہ جھکا — پھر لب جام کسی نے چومے
پھر نہاں خانۂ اصنام کھلا — پھر صنم زندہ ہوئے اور جھومے

ایک سندھی دوہا!

پو پھٹتے ہی اوس پڑی ہے کومٹی کھول کلال — پی لوں، میں بھی جی لوں، تو بھی جیے ہزاروں سال

سندھی نظموں کے نمونے تو کتنے ہی دیے جا سکتے ہیں لیکن اگر سارا مال میں ہی دکھا دوں تو پھر حمایت علی شاعر کی کتاب شاید آپ پڑھیں ہی نہ۔ اصل محنت تو ان کی ہے۔ حمایت علی شاعر کو مصنف اور مترجم کی حیثیت سے بھی تو جانیے:

(یوسف ناظم)

نئی غزل کے منفی رجحانات

مصنف: علی احمد جلیلی
پتا: حسامی بک ڈپو، چارکمان، حیدرآباد
قیمت: پندرہ روپے

علی احمد جلیلی مشہور استادِ فن فصاحت جنگ جلیل مانک پوری کے صاحب زادے ہیں اور بذاتِ خود ایک اچھے اور معروف شاعر ہیں۔ موصوف کا کلام تغزل کی چاشنی اور زبان کی صفائی کا مجموعہ کے ساتھ عصری حیثیت سے بھی مملو ہوتا ہے۔ پیشِ نظر کتاب ان کا شعری مجموعہ نہیں بلکہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جیسا کہ اس "مجموعۂ مضامین کے نام" "نئی غزل کے منفی رجحانات" سے ظاہر ہے اس کتاب میں علی احمد جلیلی کے دہ مقالات شریکِ اشاعت ہیں جن میں انھوں نے نئی غزل کی خامیوں اور کمزور پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ نئی نسل کے کچھ غزل گویوں نے زبان کی توڑ پھوڑ اور تجربے کے نام پر فنی اقدار سے کھلواڑ کا رویہ اختیار کیا ہے اس کی مذمت کرتے ہوئے راقم الحروف نے ایک شعر میں بہت پہلے کہا تھا:

خیر سے تجربے وہ بھی کرنے لگے
جن کا پہلا قدم فن کی ابجد پہ ہے

دراصل تجربے اور اجتہاد کا حق کسی فن کار کو طویل ریاضِ سخن اور استناد کے مرتبے پر فائز ہو جانے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے لیکن موجودہ زمانے کے سہل پسند لوگوں نے اسے اپنی لاعلمی اور عدم صلاحیت کو چھپانے کا وسیلہ بنا لیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی تین مضامین میں مقالہ نگار نے اسی روش کو ہدفِ ملامت بنایا ہے اور نئے شعرا کے کمزور اشعار کے حوالوں سے زبان پر ان کی گرفت اس کی لطافتوں اور نزاکتوں سے انحراف ٹکسالی محاورے کی خلاف ورزی، الفاظ کے انتخاب میں بدسلیقگی، انگریزی لفظوں کے غیر فن کارانہ استعمال اور ہندی کے بے جوڑ الفاظ اور ان کے بھونڈے برتاؤ پر صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ نئی غزل میں ابہام پسندی اور علامت نگاری کی آڑ میں جو اہمال اور بے معنویت در آئی ہے۔ جلیل صاحب نے اس پر بھی نئی نسل کو ٹوکا ہے۔ میں ان کے بیشتر خیالات سے متفق ہوں۔ البتہ اگر ایسے مضامین میں مثالیں صرف مستند اور معتبر شعرا کے کلام سے پیش کی جائیں تو دلیل زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں نئی غزل میں سب کچھ تو خام اور قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ ورنہ خود مضمون نگار اپنی غزلوں میں جدید رنگ و آہنگ کی شمولیت سے پرہیز کرتے۔ انھوں نے ایک آدھ جگہ دبے لفظوں میں چند خوبیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اگر ان صحت مند اور خوبصورت پہلوؤں پر مثالوں کے ساتھ کچھ صفحات کا کتاب میں اضافہ کر دیا ہوتا تو اس کی افادیت اور توازن کئی گنا بڑھ سکتا تھا۔ کتاب کے آخری مضمون "آزاد غزل۔ مکمل جائزہ" کی اس مجموعے میں شمولیت کا کوئی جواز نہ تھا کہ آزاد غزل کو معتبر جدید شاعروں میں سے کسی نے بھی تسلیم نہیں کیا ہے۔

(مظفر حنفی)

خدا بخش لائبریری جرنل

(شمارہ ۲۶/۲۷)

مدیر: عابد رضا بیدار
پتا: خدا بخش لائبریری پٹنہ
قیمت: ۳۰ روپے

آثارِ ماضی کو محفوظ کر کے عصری آگہی کے ساتھ مستقبل کے حوالے کر دینا انسانی تاریخ و تہذیب کی بہت بڑی خدمت ہے جو عموماً متمدن اقوام ملتوں اور با وسائل و حوصلہ مند خاندانوں کا مقدر ہوتا ہے لیکن تاریخ علوم و فنون میں شمالی بہار کے دو باپ و بیٹے محمد بخش و خدا بخش کا نام اس وجہ سے زریں حروف سے لکھا ہے کہ انھوں نے ۱۸۸۸ء میں اپنے ذاتی اثاثہ علمی سے جس پبلک کتب خانہ کی بنیاد رکھی تھی قدرت نے اسے شرفِ قبولیت عطا کی اور آج وہ اپنے بیدار مغز ناظم کے ہاتھوں ہر اعتبار سے بھارت کا مثالی منفعت بخش علمی ادارہ ہے جس کے مختلف شعبوں کی کارکردگی ہندستان میں قائم مستقل رئیس اکاڈمیوں سے کم نہیں ہے۔

اس لائبریری سے ۱۹۷۷ء میں قاضی عبدالودود صاحب کی صدارت اور عابد رضا بیدار صاحب کی نظامت میں ایک سہ ماہی مجلہ شائع ہونا شروع ہوا تھا جس کا تعارف کراتے ہوئے قاضی صاحب نے تحریر کیا تھا۔

"خدا بخش لائبریری کی طرف سے خدا بخش لائبریری جرنل نکالا گیا ہے اس میں فارسی، اردو اور انگریزی کے مضامین ہوں گے جن کا تعلق خدا بخش لائبریری سے ضرور ہوگا۔ خدا بخش لائبریری سے مضامین کے تعلق کی قید کو ٹائیٹل پر غیر ضروری طور پر شمارے میں دہرایا جا رہا ہے جب کہ ہمارے نزدیک اس قید سے علمی تنگ نظری اور تعصب کا اظہار ہوتا ہے اور اگر سچ پوچھو تو اب جرنل اس قید کا پابند بھی نہیں ہے۔

اب تک اس جرنل میں دیگر علمی مضامین کے علاوہ اردو کے معروف و غیر معروف مرحوم رسائل کا جو انتخاب شائع کیا ہے وہ بہت بڑی علمی خدمت ہے جس کی وجہ سے بہت سے گلہائے ادب کے ساتھ کچھ غنچے بھی حیاتِ نو حاصل کر چکے ہیں اور رسائل کا ایک سہ ماہی ادب کتابی شکل میں آ کر حیاتِ دوام پا چکا ہے۔

زیرِ تبصرہ شمارہ دراصل نیاز فتح پوری مرحوم کا رسالہ نگار مطبوعہ ۱۹۴۱ء کا جدید غزل گو شعراء نمبر کا نیا ترقی یافتہ ایڈیشن ہے جسے نیاز صاحب نے شعرا کے خود نوشت حالات، و اپنا پسندیدہ کلام کی حد تک رکھا تھا۔ بیدار صاحب نے اس میں ہر شاعر کی تحریر و تصویر اور چند شعرا کے حالات کا اضافہ کیا ہے۔ ۳۲ مرحوم شعرا کی تصاویر و تحریر کا حصول کافی سخت مرحلہ تھا جسے بیدار صاحب نے اوراقِ گل مطبوعہ ۱۹۴۴ء رام پور اور کچھ دوستوں کی مدد سے سر کر لیا۔ اس شمارے پر بیدار صاحب کا پیش گفتار اردو غزل پر کافی پر مغز مضمون ہے۔

اخیر میں بغیر نام کے فراق گورکھ پوری کا مقالہ اردو کا رنگ تغزل اور نیاز صاحب کا مضمون بزمِ نگار بے حد بصیرت افروز ہیں۔ فہرست مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ صفحہ ۲۹۷ پر ایک مضمون کچھ متغزلین کے بارے میں شامل ہے لیکن جب مذکورہ صفحات پر دیکھا تو ایک سادہ ورق پر صرف عنوان لکھا ہوا ہے۔

نیاز مرحوم نے اس نمبر کا تعارف کراتے ہوئے تحریر کیا تھا۔
آج قارئین نگار کے سامنے جو کچھ پیش کیا جارہا ہے وہ اردو ادب اور تذکروں کی دنیا میں بالکل پہلی چیز ہے۔
میں نے اس بزم میں شرکت کے لیے دو قسم کے غزل گو شعراء کو دعوت دی ہے ایک وہ جو اپنی کہنہ مشقی یا کسی وجہ سے غزل گوئی میں استادانہ حیثیت رکھتے ہیں عام اس سے کہ وہ میرے یا آپ کے نقطۂ نظر سے اچھے شاعر ہوں یا نہ ہوں اور دوسرے وہ شعرا ہیں جو واقعی اچھا کہنے والے ہیں۔
الغرض اردو شاعری اس وقت جس دور سے گزر رہی ہے اس کا مستقبل اس تیزی کے ساتھ اپنی جگہ الگ پیدا کر رہا ہے کہ ممکن ہے غریب حسن و عشق والی غزل گوئی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے اور یہی وہ تمام محرکات تھے جنھوں نے مجھے اس بات کی طرف مائل کیا کہ اس دور کے تمام بڑے بڑے غزل گو شاعروں کے کلام کا انتخاب اگر ان کی پسند کا ایک جگہ فراہم کر دیا جائے تاکہ کل کا تذکرہ نویس و تبصرہ نگار ان ہستیوں کو بھی یاد رکھنے پر مجبور ہو جو دورِ غزل گوئی کی آخری نشانیاں ہیں اور جس کے بعد شاید اس رنگ کو نباہنے والا کوئی نہ رہے گا۔
مندرجہ ذیل شعرا کے خود نوشت حالات انتخاب کلام اور تحریر و تصاویر اس شمارے میں شامل ہیں۔ آرزو، آسی، اثر، احسان، علی اختر، اختر شیرانی، امید، بیخود، تاجور، ثاقب، جلیل، جگر، جوش، حسرت، حفیظ، دل، دورشی، ساحر دہلوی، سیماب، فانی، فراق، کیفی، محروم، ملا، ناطق گلاؤٹھوی، ناطق لکھنوی، نوح ناروی، وحشت، یگانہ، آزاد انصاری، افسر میرٹھی، سائل دہلوی، صفی لکھنوی۔
اس شمارے کو نظر بد سے بچانے ہوئے بیدار صاحب نے کچھ غیر اہم اقتباس نما تبصرہ اور کچھ رسید نما مراسلات کو شامل کر دیا ہے تاکہ "رسالیت" باقی رہے۔
مجھے یقین ہے کہ اہل ذوق حضرات اس شمارے کی قدر کریں گے اور مختلف جامعات اردو کے پیپر میں اس شمارے کو داخل نصاب کریں گی۔ اردو غزل کی تاریخ لکھتے وقت یقیناً تذکرہ نگار بیدار صاحب کے پیش گفتار میں اٹھائے ہوئے نکات پر نظر رکھیں گے۔ قاضی عبدالودود صاحب کی وابستگی اور ان کی زندگی کے آخری شمارے ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ (حکیم محمد حسین خاں شفا)

صاعقۂ طور

مصنف: تاج پیامی
ناشر: اردو رائٹرس گلڈ۔ الٰہ آباد۔۳
قیمت: ۱۵ روپے

پچھلی کئی دہائیوں سے کلیم الدین احمد کی تخریبی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اردو ادب کے اس مطلق العنان سمجھے جانے والے اسپ شہ زور کے قدموں تلے جو بھی آئے، روند دیے گئے اور یہ وہ تھے جن پر بجا طور پر اردو شاعری، اردو غزل اور اردو ادب کو فخر تھا۔ جن کے

معنوی اور فنی کارناموں نے مغربی ادب کو بھی متاثر کیا تھا۔ مگر کلیم صاحب زندگی بھر ان کے بخیے ادھیڑنے کا کارنامہ انجام دیتے رہے۔ ان کے اس انتہا پسندانہ تنقیدی رنگ سے متاثر ہو کر کئی دوسرے اسپ شہ زور بھی اس میدان میں آدھمکے۔ عبدالمغنی صاحب کے علاوہ تاج پیامی صاحب کا نام بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ جیسا کہ مصنف نے کتاب کے شروع میں ہی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب کلیم صاحب کے باطل تنقیدی نظریات کی تنقیم ہے۔ بلاشبہ میں مصنف کے اس جذبے کا احترام کرتا ہوں جو اس کے لکھے جانے کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جس کا دفاعی مبسوط ردِّ عمل ضروری تھا۔ کیوں کہ کلیم صاحب کی غیر حکیمانہ تنقید، شخصی تاثرات اور ذاتی تعصبات کے میل سے ایسے باطل تنقیدی نظریات کو ہوا ملی جو ادب کو ایک لمبے عرصے تک (شاید آٹھویں دہائی کے آخر تک) مغرب زدگی کا شکار بنائے رہا۔ اب یہ طلسم ٹوٹ رہا ہے اور آہستہ آہستہ مشرق کی بازیافت کی کوشش بھی ادب میں خوب صورت انداز میں ہونے لگی ہے۔ اس حیثیت سے بھی تاج صاحب کا یہ کارنامہ انتہائی اہم سمجھا جائے گا کہ انھوں نے جا بجا اپنی تہذیب کے شان دار کارنامے اور مغرب کے قد آور شاعروں اور ادیبوں کا موازنہ ذاتی تعصب سے بلند ہو کر خالص حکیمانہ تنقید کے اصول اور معیار کا خیال کرتے ہوئے اردو کے عظیم شعراء اور نقاد کے ساتھ فن کارانہ طور پر قلم بند کیا ہے۔ یہ اردو شاعری پر کلیم صاحب کے اعتراضات کا Point-wise جواب ہے جسے پچھلی دہائیوں میں کلیم صاحب اردو شاعری کی حسین روایات سے فراموشی اختیار کر کے صرف اقلیدس کے خیالی نقطے اور معشوق کی موہوم کمر کی ہی تلاش کرتے رہے تھے۔ وہاں تاج صاحب نے اپنی باریک بینی اور کتب بینی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسے ایسے نکتوں کی کھوج کی ہے جسے بلاشبہ دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

یہاں کتاب کی سجاوٹ کا ذکر نہ کرنا مصنف کے معیارِ حسن کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ حرفِ اول اور حرفِ آخر کو مصنف نے "پیش گفتار" اور "پس گفتار" کے عنوانات کے ساتھ باندھے رکھا ہے۔ "پیش گفتار" کے تحت مصنف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ صاعقہ طور میں نے کلیم الدین احمد کی مخالفت میں نہیں لکھی ہے۔ وہیں "پس گفتار" میں وہ کلیم صاحب کے باطل تنقیدی نظریات کو Point-wise کاٹتے ہوئے ایک بار پھر اس شان دار تہذیب کا دامن انتہائی سلیقے سے تھام لیتے ہیں جو مشرقیت کی خاص پہچان رہی ہے۔ یہاں بھی وہ مغربیت کے شکار نہیں رہے بلکہ اپنے سابقہ اعلان کے پیش نظر اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت پیش کرنے کے بعد پس گفتار میں کہتے ہیں کہ یہ کتاب اردو زبان، اس کی شاعری اور اس کے ادباء و شعراء کی جائز حمایت میں لکھی گئی ہے۔ میرے خیال میں اب یہ بات پوری طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ یہ کتاب شخصی تعصبات سے پرے ہے اور اس کو ذاتی تنقید کی لالٹین کہنا کہنے والے کی سراسر حماقت ہے۔

یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں کلیم صاحب کے کسی نہ کسی گمراہ نظریے کو مد نظر رکھتے ہوئے مدلل جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ابواب ہیں۔ کلیم الدین احمد کی تنقید تخریبی ہے، اردو شاعری پر فارسی شاعری کی کورانہ تقلید کا الزام، سند، انسان اور ماحول،

ادب اور معاشرہ، شاعری یا قافیہ پیمائی، شاعرانہ خوبیاں، بزرگ شعرا، مسدس حالی اور شعرینؔ، اکبر اور جوش کردار کشی اور معنی میں تحریف، غزل پر غلط اعتراضات اور غزل پر ایک مہذب ترین صنف شاعری ہے۔ اس طرح ہر باب ایک مکمل مضمون بھی ہے اور کلیم صاحب کے بے جا اعتراضات کا پورا پورا جواب بھی۔ اس طرح یہ کتاب تاج صاحب کے گہرے مطالعے، ان کا اردو شاعری سے جنون تک کا عشق، اور ان کے تنقیدی توازن کا ایک ایسا آئینہ ہے جو اپنے مشمولات کے اعتبار سے ادب کے قاری کے لیے کم از کم ایک دستاویزی حیثیت تو رکھتا ہی ہے۔ ساتھ ہی باطل تنقید کی متوازن پہچان کے لیے جس کا مطالعہ ادب کے ہر قاری کے لیے ناگزیر ہے۔

یہ کتاب اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد سے شائع ہوئی ہے۔ کتابت کی غلطیاں افسوسناک حد تک ہیں جو گراں گزرتی ہیں۔ سرورق دیدہ زیب اور قیمت کچھ زیادہ ہے۔ (مشرف عالم ذوقی)

نثر اور انداز نثر

مصنف: ڈاکٹر حامد حسین
پتا: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔
قیمت: بارہ روپے

ڈاکٹر حامد حسین ہمارے معتبر اور صاحب نظر ناقدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ چوں کہ انگریزی زبان و ادب کی تدریس، ان کا پیشہ اور اردو میں تصنیف و تالیف ان کا شغف ہے اس لیے عام نقادوں کے برعکس ان کی تحریریں وسعت مطالعہ اور گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں بطور خاص اردو میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات" لائق ذکر ہے۔ اب فاضل مصنف کی تازہ تصنیف "نثر اور انداز نثر" لکھنؤ سے نسیم بک ڈپو نے شائع کی ہے۔ کتاب کے نام سے گمان گزرتا ہے کہ نثر کے مختلف اسالیب و اصناف سے متعلق مباحث پر کوئی مستقل تصنیف ہوگی لیکن دراصل یہ کتاب ڈاکٹر حامد حسین کے ان متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو نثر، اصناف نثر، اردو نثر کی تاریخ اور بعض نثر نگاروں کے بارے میں لکھے گئے اور مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ بقول ڈاکٹر حامد حسین ــــ

"نثر ایک بت ہزار شیوہ ہے... گالی گفتار سے عارفانہ ملفوظات تک اور نہانے کی رپٹ سے شاہی فرمانوں تک ہر قسم کا اظہار نثر کا رہین منت ہے لیکن نثر کا مقدر تو ایک سپاہیانہ خاکساری کا رہا ہے... شبستان ادب کی ساری رنگینی و دلفریبی شاعری کے وجود زیبا پر منحصر ہے لیکن کارگہ عمل میں نثر کے بغیر ترسیل و اظہار کا سارا نظام معطل ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں۔"

اس مجموعے کے ابتدائی تین مضامین میرے خیال میں بے حد اہمیت و افادیت کے حامل ہیں جن میں نثر کی نوعیت و ماہیت، اردو نثر کے عروج و ارتقاء اور انگریزی ادب کے حوالے سے رمزیہ نگاری کے مفہوم و روایت پر بنیادی اور گہری باتیں کہی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب کے مختلف مضامین میں خاکہ نگاری، انشائیے، سوانح نگاری، طنزیہ صحافت، ادب لطیف اور علمی عام فہم نثر جیسے موضوعات پر مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں اور ان کے ضمن میں مولوی عبدالحق،

حالی، تخلص بھوپالی، مہدی افادی، نیاز فتح پوری اور فراق گورکھ پوری کے نثری اسالیب بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ مصنف کا اندازِ بیان مدلل اور نثر حالی کی طرح سادہ و پرکار ہے۔ کتاب اپنی تمام تر افادیت کے باوجود ایک تشنگی کا احساس دلاتی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ڈاکٹر حامد حسین اس موضوع پر کوئی مستقل اور جامع کتاب بھی تصنیف کریں گے کہ یہ انھیں کا حق ہے۔ (مظفر حنفی)

اردو شاعری میں اشاریت

مصنف : ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
پتا : موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲
قیمت : ۴۵ روپے

اردو تنقید میں سلیمان اطہر جاوید کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ جس محنت اور انہماک سے تنقید لکھتے ہیں اس کے روشن نقوش "رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن" "اسلوب اور انتقاد" "تنقید شعر" اور "ادب میں ابہام اور اس کے مسائل" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ایک اور کارنامہ "اردو شاعری میں اشاریت" کی صورت میں منظر عام پر آیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ہمارے غزل پسند ادبی مزاج کو رمزیت اور اشاریت مغرب کے مقابلے میں زیادہ راس آتی ہے۔ لیکن اس موضوع پر غور و فکر ناقدین مغرب نے زیادہ جم کر کیا ہے۔ دراصل اردو میں اشارے، تشبیہ، استعارے، کنایے اور تمثیل وغیرہ کو سرسری جائزے لینے والے ناقدین کرام نے اس طرح گڈ مڈ کر دیا ہے کہ ادب کے طالبِ علم کو اس غبار میں صحیح سمت نظر نہیں آ پاتی۔ غالباً اس موضوع پر سلیمان اطہر جاوید نے پہلی بار مبسوط اور مفصل انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب موضوع کے تعین اور تعریف کے لیے وقف ہے جس میں مشرق و مغرب کے مستند حوالوں اور مناسب حوالوں کے ذریعے صاف اور غیر مبہم انداز میں وضاحت کی گئی ہے کہ اشاریت کیا ہے۔ باب دوم میں اردو کے علاوہ فرانسیسی، امریکی، روسی، انگریزی، سنسکرت، عربی، فارسی، ہندی، تیلگو، تامل، ملیالم، کنڑی، بنگالی، آسامی، اڑیا، گجراتی اور مراٹھی زبانوں کے شعری ادب میں ایجاز و اختصار کے ساتھ اشاریت پسندی کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کا تیسرا باب اردو ادب کے ابتدا تا ۱۹۳۵ء کے شعری سرمائے میں اشاریت کی نشان دہی کرتا ہے۔ باب چہارم اس کے بعد سے لے کر ۱۹۶۰ء تک کی شاعری کا اشاریت پسندی کے زاویے سے جائزہ لیتا ہے اور جدید شاعری میں اشاریت کی کارفرمائی کا تجزیہ پانچویں باب میں کیا گیا ہے۔ آخری باب اختصار کے ساتھ شاعری میں اشاریت پسندی کے منفی اثرات کو اجاگر کرتا ہے۔ پوری کتاب میں مصنف کی وسعت نظر، وسعتِ مطالعہ، نکتہ رسی اور تنقیدی بصیرت کے ثبوت ملتے ہیں۔ تنقید لکھنے والے سے جس معروضیت موضوع سے گہری وابستگی جرأتِ اظہار اور خلوص نیت کا مطالبہ کرتی ہے۔ سلیمان اطہر جاوید اس سے کماحقہ عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ نئی تنقید میں عام طور پر جو ژولیدہ بیانی، تخلیقی نوع کی انشا پردازی غیر ضروری طوالت "قدیم و جدید پر اصرار اور علاقائی یا نظریاتی

گروپ بندی پائی جاتی ہے، مصنف نے کمال چابک دستی کے ساتھ خود کو اس سے محفوظ رکھا ہے۔ کتاب پر میرا واحد اعتراض یہ ہے کہ اس کا نام "اردو شاعری میں علامت پسندی" ہونا چاہیے تھا۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک ایسی تصنیف ہے جسے ہر اچھی لائبریری اور ہر صاحب نظر کے شیلف میں ہونا چاہیے۔ (ڈاکٹر مظفر حنفی)

مصنف: خواجہ عبدالغفور

طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ

پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی

قیمت: پچاس روپے

خواجہ عبدالغفور اب تک ایک مزاح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ موصوف کے مزاحیہ مضامین کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پیش نظر کتاب انھیں ایک محقق اور نقاد کی حیثیت سے متعارف کراتی ہے۔ یہ دراصل خواجہ عبدالغفور کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں بمبئی یونیورسٹی سے حال ہی میں ڈاکٹریٹ ملی۔ طنز و مزاح کے سلسلے میں اردو میں تخلیقی نوعیت کا کام تو بہت ہوا لیکن اس موضوع پر تحقیق اور تنقید کا حق صحیح معنوں میں ادا نہیں کیا گیا۔ لے دے کر رشید احمد صدیقی کی "طنزیات و مضحکات" فرقت کاکوروی کی "اردو ادب میں طنز و ظرافت" ڈاکٹر وزیر آغا کی "اردو ادب میں طنز و مزاح" جیسی گنتی کی چند کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ اس اعتبار سے خواجہ عبدالغفور ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک اہم موضوع کو تحقیقی کام کے لیے منتخب کیا۔

اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں تحقیق کے مروجہ اور سکہ بند اصولوں کو نظر انداز کرکے مصنف نے کھلا ہوا اور بے تکلف رویہ اختیار کیا ہے۔ تدریسی مزاج رکھنے والے محققین غالباً اس روش کو پسند نہ کریں لیکن مصنف نے غیر ضروری مباحث اور قدم قدم پر حوالوں کے جنجال سے بچتے ہوئے اپنے مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں، لفظی، لطیفہ، بذلہ سنجی، طنز تضحیک و تعریض اور ہجو وغیرہ کی تعریف میں ان کی ذیلی اقسام کی توضیحات اس صفائی سے بیان کی ہیں کہ عام قاری الجھن کا شکار ہوئے بغیر انھیں سمجھ سکتا ہے۔ اور ان میں فرق کر سکتا ہے۔ موقع بہ موقع مغربی ممالک خصوصاً برطانیہ، امریکہ اور فرانس وغیرہ مروج اسالیب مزاح کے امتیازات بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے آخری باب "متفرقات" کے تحت کچھ ایسے موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں جن کا تعلق طنز و مزاح سے براہ راست نہ ہو کر بالواسطہ ہے۔ مثلاً ادب میں جنسیات، امرد پرستی، لذتیت، عریانیت، جرکینیات فحش نگاری، کارٹون وغیرہ کی طنز و مزاح سے وابستگی کے زاویے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عام تحقیقی روایات کے برعکس کتاب کا تقریباً نصف سے زائد حصہ ان لطائف پر مشتمل ہے جو مصنف نے مختلف نکات کو واضح کرنے کے لیے بطور مثال پیش کیے۔ اس طرح مقالے کی علمی سنجیدگی تو مجروح ہوئی ہے لیکن شگفتگی اور عمومی دلچسپی

کا عنصر ابھر آیا ہے۔

اکثر مقامات پر طنز و مزاح نگاروں کے تذکرے میں ان کے ادوار کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اگر انھیں تاریخ وار درج کیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ کتاب موڈرن پبلشنگ ہاؤس کے اعلا معیاری گیٹ اپ کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے۔

(مظفر حنفی)

ادب کی پرکھ

مصنف: نریش
پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی
قیمت: تیس روپے

ڈاکٹر نریش انگریزی کے استاد اور اردو کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ بہ یک وقت اردو پنجابی انگریزی اور ہندی زبانوں سے واقفیت کی بنا پر ان کا ذہن وسیع اور ادبی وژن کا منظرنامہ کشادہ ہے۔ پیشِ نظر کتاب میں مصنف کے پندرہ ایسے تنقیدی مضامین شامل ہیں جو ریڈیو اور سیمیناروں کی ضرورت کے تحت لکھے گئے تھے۔ ان میں "اردو ادب اور قومی یک جہتی" "ہندستانیت اور اردو شاعری" "اردو شاعری میں نہرو کا ذکر" دراصل ان موضوعات پر سرسری جائزوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں" ادب کی پرکھ اور نقادی" میں مصنف نے تنقید کے بارے میں اپنے نظریات واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ "اردو کی تعلیم کا مسئلہ" ہندستان کی مختلف ریاستوں میں درپیش اردو کے مسائل کی جانب اشارے کرتا ہے۔ "پریم چند کے ناولوں میں دھرتی کی مہک" "سید انشاء اور ان کی شاعری" "گھر آنگن کا شاعر" "شیخ فرید کا فلسفہ" "ردی داس کے کلام کا پس منظر" "اقبال اور پنجاب" جیسے مضامین میں مختلف فن کاروں کے شخصی مطالعات یا ان کے فن کے خصوصی زاویوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ "ہندی بنام اردو" میں ان دونوں زبانوں کے باہمی رشتے اور ادبی سفر کے موازنے پیش کیے گئے ہیں۔ مجھے بطورِ خاص جو مضامین زیادہ کارآمد نظر آتے وہ ہیں "ہندی شاعری پر اردو کا اثر" اور "پنجابی غزل پر اردو کا اثر"۔ غالباً اس نوع کے مضامین ڈاکٹر نریش جیسے اصحاب ہی قلم بند کر سکتے ہیں۔ جن کی نگاہ بیک وقت کئی زبانوں کے ادب پر ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر نریش کو مستقبل کے ایک اچھے نقاد کی حیثیت سے روشناس کرانے میں کامیاب ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

گوپال متل: شخصیت اور فن

مرتب: کمار پاشی
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج نئی دہلی۔
قیمت: ۵۰ روپے۔ صفحات ۲۷۲

گوپال متل کی عمر ہنگاموں کے دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ طرح طرح کے ہنگاموں

کے وہ کبھی تماشائی رہے، کبھی جنم داتا، کبھی شریک رہے اور کبھی متحرک۔ پیش نظر کتاب کے ۲۷۲ صفحات میں حسنِ ترتیب کے ساتھ انھیں ہنگاموں کی روداد کو سمویا گیا ہے۔

کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں "حرفے چند" کے تحت آغازِ کلام کرتے ہوئے کمار پاشی (مرتب) نے گوپال متل سے اپنی پہلی ملاقات کے تاثرات، گوپال متل کی شخصیت اور کردار کے چند پہلوؤں اور ان کی شاعری کے نمایاں عناصر ترکیبی کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد جگن ناتھ آزاد، مخمور سعیدی، آمنہ حسن اور خود گوپال متل نے اس قد آور رنگا رنگ شخصیت کا خاکہ سجایا ہے۔ ان مضامین میں گوپال متل کے عکس کے علاوہ وہ گرمیِ محفل بھی جھلکتی ہے جو بیتے دنوں سے عبارت تھی۔

دوسرے حصے میں ڈاکٹر مظفر حنفی نے گوپال متل کی نثر اور اسلوب تحریر پر بحث کی ہے اس تعارفی ابتدا کے بعد گوپال متل کے، منتخب مضامین نشاط مطالعہ کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

تیسرے حصے میں گوپال متل کی شاعری پر بحث میں ڈاکٹر وزیر آغا، بلراج کومل، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر حامدی کشمیری اور باقی شریک ہوئے ہیں اور گوپال متل کی مقدار میں کم کیفیت میں صہبائے تند شاعری کی ماہیت اسلوب بیان اور جہان معانی کی سیر کے لیے نئے نئے دریچے وا کر گئے ہیں مشمول انتخاب کلام "متل شناسی" کے اس باب کی تکمیل کرتا ہے۔

چوتھا حصہ تاثرات پر مشتمل ہے۔ حیات اللہ انصاری، رشید حسن خاں، انور سدید، شن ساف نظام اور آزاد گلاٹی نے گوپال متل کی ذات اور فن کارانہ صفات کے بارے میں اپنے بے لاگ تاثرات نثر میں بیان کیے ہیں۔ بسمل سعیدی، کرشن موہن، مخمور سعیدی، کمار پاشی، امیر قزلباش، ضیا فتح آبادی، رضا نقوی اور عزیز تمنائی نے نظم میں۔

پانچویں اور آخری حصہ میں گوپال متل کے چند تبصرے اور ان کی تبصرہ نگاری پر پروفیسر نظیر صدیقی کا مبسوط مضمون شامل ہے۔ اس میدان میں بھی گوپال متل نے ایک امتیازی شان حاصل کر دکھائی ہے۔ انھوں نے رواداری میں کبھی کسی کتاب کے بارے میں اظہار رائے نہیں کیا۔ اس کے ساتھ بت شکنی برائے بت شکنی بھی ان کا شیوہ نہیں رہا تاہم کسی کوتاہی یا ادعائے بے جا کو وہ کسی طور برداشت نہیں کر سکتے تھے تیکھا طنز جو ان کی نثر میں ہی نہیں شاعری میں بھی جھلکتا ہے تبصرہ میں بھی نشتر چبھوتا نظر آتا ہے۔

موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے کتاب بڑے سلیقے سے اور صاف ستھری شائع کی ہے طباعت آفسٹ کی ہے اور سیاہی روشن ہے جسے دیکھتے ہوئے قیمت زیادہ محسوس نہیں ہوتی ہے

(جلیس عابدی)

شرارِ جستجو

مصنف: تنیسر ضحیٰ عالم
پتا: ناہید عالم، ہاکی بور بارڈ، رانچی
قیمت: تیس روپے

تنیسر ضحیٰ عالم رانچی کالج میں انگریزی کے استاد ہیں اور پیش نظر کتاب ان کے بارہ مضامین

کا مجموعہ، جو وقتاً فوقتاً اردو کے ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کتاب میں شامل چند مضامین زبان سے متعلق ہیں مثلاً اردو انگریزی ذولسانی آمیزش، مروجہ اور روزمرہ کے چند فقرے، انگریزی اخبارات میں دخیل ہندستانی الفاظ اور کچھ لسانیات سے متعلق اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان مضامین میں مصنف نے انگریزی میں اپنی مہارت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اس کی روشنی میں اردو زبان و ادب پر مرتسم ہونے والے اثرات کا خوبی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اسی طرز کا ایک مختصر سا مضمون کچھ دن قبل ڈاکٹر سید عبداللہ کے قلم سے کسی پاکستانی پرچے میں نکلا تھا لیکن وہاں شکایت کا پہلو نمایاں تھا جب کہ قیصر ضمیٰ نے نہایت معروضی انداز میں تجزیے پیش کیے ہیں۔ ادب اور اخلاقیات، جز دان وا بر مین، آرنلڈ کا مذہبی نقطۂ نظر اور جدید شاعری کے چند پہلو میں بھی انھوں نے انگریزی زبان و ادب پر گہری نگاہ ہونے کی وجہ سے نئے زاویوں سے غور و فکر کیا ہے۔ دو مضامین قرۃ العین حیدر کے فن سے متعلق اور ایک فراق گورکھپوری کے بارے میں ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اردو تنقید میں پچھلے دو تین برسوں میں شائع ہونے والی چند اچھی کتابوں میں "شرارِ جستجو" کو بھی شمار کیا جانا چاہیے۔

یہ مجموعہ مضامین بہار اردو اکاڈمی کی مالی معاونت سے شائع ہوا ہے اور خوبصورت چھپا ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

ظرافت اور تنقید

مصنف: احمد جمال پاشا
پتا: پاشا اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سیوانی (بہار)
قیمت: ۲۵ روپے

بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہونے والا ایک اور مجموعۂ مضامین جس کے مصنف مشہور مزاح نگار احمد جمال پاشا ہیں۔ یہ دراصل وہ مضامین ہیں جو مصنف نے پچھلے تیس برسوں میں طنز و مزاح نگاروں کے بارے میں قلم بند کیے ہیں ان میں جن طنز و مزاح نگاروں کے فن سے بحث کی گئی ہے ان میں ملا نصرالدین، سجاد حسین، شوکت تھانوی، انجم مان پوری، پطرس، مشتاق یوسفی، شوق بہرائچی، ظریف جبل پوری، شاد عارفی، راجہ مہدی علی خاں، ماچس لکھنوی اور عبدالستار ناصر وغیرہ شامل ہیں۔ احمد جمال پاشا اردو کے استاد بھی ہیں اور بذات خود ایک اچھے طنز و مزاح نگار بھی، سونے پر سہاگہ یہ کہ تمام مضامین ان کے میدان تخصیص سے متعلق ہیں چنانچہ ہر جگہ انھوں نے بنیادی اور پتے کی باتیں کہی ہیں اور اکثر اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اردو کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے کسی بھی جائزے میں ان تحریروں سے استفادہ ناگزیر ہوگا۔ بڑی بات یہ ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں صاحب مضمون جس طرح کے تعصبات اور معاصرانہ جانبداریوں کا شکار ہو جاتے ہیں، احمد جمال پاشا اس سے دامن بچائے گئے ہیں۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

اردو کا پہلا نثری ڈراما
اور کیپٹن گرین آدے

مصنف: ڈاکٹر محمد فضل الدین اقبال
پتا: علیم الدین محی الدین، حبیب نگر، حیدرآباد
قیمت: ۸۵ روپے

عمائد تحقیق نے اردو کا پہلا ڈرامہ ہونے کا تاج مختلف ڈراموں کے سر پر رکھا ہے۔ تفصیل اور بحث میں جاتے بغیر محض نام شماری پر اکتفا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کو لندن میں کسی سائمن ڈگبی کے پاس کسی ڈرامے کے مخطوطے کا پہلا سین ملا جو پانچ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے کے مصنف کا نہ نام معلوم ہے نہ سنہ تصنیف، لیکن یہ مخطوطہ رچرڈ اسٹریچی کی ملکیت رہ چکا ہے جو لکھنؤ میں ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۸ء تک ریزیڈنٹ تھا۔ یقین ہے کہ اسے اسی زمانے میں یہ اوراق ملے ہوں گے یعنی ان کی تصنیف کم از کم اس وقت تک ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر فاروقی نے اس کا تعارف اردو کا قدیم ترین ڈرامہ" مشمولہ اردوئے معلیٰ (قدیم اردو نمبر) میں کرایا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کو اس پر اعتراض ہے کہ کیا معلوم پورا ڈرامہ لکھا بھی گیا کہ نہیں شیکسپیر کے کچھ ڈراموں کے سین ڈاکٹر گلکرسٹ نے بھی ترجمے کیے تھے۔ تاریخی ترتیب سے اولیت کا دوسرا مدعی واجد علی شاہ کا ڈراما رادھا کنہیا کا قصہ ہے جسے مسعود حسن رضوی اردو کا پہلا ڈرامہ مانتے ہیں۔ اسے واجد علی شاہ نے اپنے زمانہ ولی عہدی میں ۴۳-۱۸۴۲ء میں لکھا یہ ۱۸۴۳ء میں کھیلا گیا۔ اور ان کی کتاب بنی میں ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوا۔ ظاہر ہے ڈرامہ کھیلے جانے سے پہلے اس کی اسکرپٹ ضرور لکھی گئی ہو گی۔ ڈاکٹر اقبال ان دونوں ڈراموں کو کیوں کر نظر انداز کر کے علی بابا کو پہلا نثری ڈراما کہتے ہیں۔ اس کے پہلے کہ دونوں ڈرامے بھی بنیادی طور پر نثری ہیں۔ علی بابا اردو کا تیسرا ڈرامہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ ۱۸۵۲ء میں مدراس میں شائع ہوا۔ اس طرح یہ اردو کا قدیم ترین شائع شدہ ڈراما ہے۔ نورالہٰی محمد عمر نے امانت کی اندر سبھا کو پہلا ڈرامہ قرار دیا۔ اندر سبھا شوال ۱۲۶۸ھ اگست ۱۸۵۲ء میں لکھی گئی اور ۱۲۷۰ھ جنوری ۱۸۵۴ء میں کھیلی گئی۔ اس طرح یہ اور علی بابا معاصر ہیں۔ لیکن بعض حضرات اندر سبھا کو ڈرامہ قرار دینے میں شامل ہیں۔ ۱۸۵۲ء کے بعد جن ڈراموں کو جن سرپرستوں نے اعزازِ اولیت سے نوازا ہے ڈاکٹر اقبال نے ان کے دعووں کو بھک سے اڑا دیا ہے یہی ان کی اہمیت ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی اور ڈاکٹر میمونہ دلوی کے مطابق راجہ گوپی چند اور جلیندھر پہلا ڈرامہ تھا جو ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ء کو بمبئی میں اسٹیج ہوا۔ دقت یہ ہے کہ اس کی اسکرپٹ موجود ہی نہیں۔ عشرت رحمانی نے ماسٹر احمد حسین وافر کے ڈرامے" بلبل بیمار" کو پہلا ڈرامہ کہا۔ عشرت نے اس کی تاریخ ۱۸۵۸ء لکھی۔ ڈاکٹر نامی نے ببلوگرافیا اردو ڈرامہ کی جلد اول میں اس کی تاریخ ۱۸۸۰ء اور جلد دوم میں ۱۸۷۰ء لکھی ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں رادھا کنہیا قصے کو پہلا ڈرامہ ماننے کے ساتھ ساتھ ڈرامہ خورشید کو اردو تھیٹر کا پہلا دستیاب ڈرامہ کہتے ہیں۔ اس ڈرامہ کی تاریخ ۱۸۷۱ء ہے۔ اسے سب سے پہلے امتیاز علی تاج نے شائع کیا۔ اور ان کے بعد ڈاکٹر مسیح الزماں نے پٹنہ کے ڈاکٹر سید حسن کے مطابق کیشور رام بھٹ کا ڈرامہ سبھا و سنبل اردو کا پہلا ڈراما ہے۔ یہ صرف ہندی میں چھپا ہے اور کئی بار چھپا ہے۔ گو اس کی زبان کا رجحان اردو کی جانب ہے۔

لیکن یہ لکھا گیا ہندی میں۔ ابراہیم یوسف نے سید ابوالفضل فیاض کے صولت عالم گیری (۱۲۹۲ھ ۱۸۷۵ء) کو پہلا ڈراما کہا۔ ڈاکٹر سید حسن کہتے ہیں کہ صرف طبع زاد ڈرامے ہی کو بنیاد بنایا جائے تو صولت عالم گیری کو اردو کا اولین ڈراما ماننا ہوگا۔ کیپٹن گرین آوے کے اس کتاب کا نام غیر معمولی ہے۔ کیوں کہ الف لیلا کی اس مشہور کہانی کا نام علی بابا اور انتساب ڈراما کا نام علی بابا چالیس چور ہے" ڈراما کا ماخذ معلوم نہیں مصنف ملابس بمبئی فوج سے وابستہ تھا۔ فورٹ سینٹ جارج کالج سے شمس الدین احمد کا الف لیلا کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے لیکن گرین آوے کے اپنے ڈرامے کے سرورق پر لکھا ہے ہندستانی میں ترجمہ اگر انھوں نے اردو سے لیا ہے تو ترجمہ نہ کہتے۔ اس وقت تک انگریزی میں الف لیلہ کے کئی ترجمے شائع ہو چکے تھے جن میں لیبین کا ۳ جلدوں کا ترجمہ (۱۸۳۹-۴۱ء) اہم ہے گرین آوے نے ان میں سے کسی کو اپنا ماخذ بنایا ہوگا۔ اس نے اپنے ڈرامے کے سین کو نوبت کہا ہے۔ ڈاکٹر اقبال لکھتے ہیں "کیپٹن گرین آوے کا ڈراما علی بابا دس ایکٹ پر مشتمل ہے (ص ۱۷) ص (۳۵) کے فٹ نوٹ میں وہ صراحت کرتے ہیں۔ ایکٹ سین کے لیے نوبت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایکٹ اور سین میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک ایکٹ میں کئی سین ہوتے ہیں۔ طویل ڈرامے عام طور سے پانچ ایکٹ کے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے جب یہ لکھا کہ یہ ڈراما دس ایکٹ پر مشتمل ہے تو میں چونکا کہ کوئی بہت ضخیم ڈراما ہوگا جس کا محض ایک جز انھوں نے شائع کیا ہے "ڈراما کی زبان اردو ہے جس کے بعض الفاظ کا تلفظ دکنی انداز کا ہے۔ جملوں کی ساخت یعنی کلام میں عام طور سے دکن کا اثر نہیں۔ یہ ڈراما اردو کا پہلا شائع شدہ ڈراما ہے" ڈاکٹر اقبال کو اس کا نام اس طرح لکھنا چاہیے تھا "علی بابا چالیس چور از کیپٹن گرین آوے اردو کا پہلا شائع شدہ ڈراما ہے۔ انھوں نے گوپی چند جلندھری "بلبل بیمار، خورشید سجاد سنبل اور صولت عالم گیری کو اردو کے پہلے ڈرامے کے مقابلے سے یک قلم خارج کر دیا غالباً اندر سبھا بھی اس زمرے سے خارج ہو جاتی ہے کیوں کہ علی بابا ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا" اندر سبھا اگست ۱۸۵۲ء میں لکھی گئی بہت ممکن ہے کہ علی بابا اشاعت سے کچھ پہلے ہی تصنیف ہو چکا ہوگا" اس طرح ڈاکٹر اقبال کی کتاب اردو ڈرامے کی تحقیق میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے (ڈاکٹر گیان چند جین)

تنقیدی نظریے

مصنف: ڈاکٹر ملک حسن اختر
ناشر: مکتبہ مری لائبریری۔ لاہور ۲
قیمت: چوبیس روپے

میں ڈاکٹر ملک حسن اختر کی اس کتاب سے بے حد متاثر ہوا۔ میرے لیے ان کا نام نیا تھا۔ حالاں کہ وہ آٹھ نو کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں جن میں ایک "تاریخ ادب اردو" ہے۔ "تنقیدی نظریے" جواب دوسری بار چھپی ہے اردو کی ان معدودے چند کتابوں میں ہے جو اصول تنقید پر لکھی گئی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی نوع کی واحد کتاب ہو۔ اس میں مصنف نے افلاطون سے لے کر آئی۔ اے رچرڈز اور ٹی ایس ایلیٹ تک اور ابن خلدون سے شبلی د

اقبال تک اصولِ تنقید کے ارتقا کو نہایت سلجھے اور نکھرے ہوئے اسلوب میں بیان کیا ہے۔ یہ اسلوب ایسا ہے جس کی ہمارے سب نقادوں کو جو اپنے مطلب کے اظہار کے لیے نہایت پیچیدہ۔ گنجلک لب و لہجہ استعمال کرنے کے عادی ہیں، پیروی کرنی چاہیے۔ اپنے حسنِ بیان کی وجہ سے اس کتاب کے مضامین ان پڑھنے والوں کے لیے بھی جو تنقید کو خشک موضوع سمجھتے ہیں دلچسپی کے حامل ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات سمجھ میں آتی ہے اور دل نشین ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کو تنقیدِ عالیہ میں جگہ ملے گی کیوں کہ یہ خالی خولی تنقیدی کتاب نہیں، ملکی اور غیر ملکی ادیبوں اور شاعروں اور نقادوں کی شاعری کے بارے میں مختلف تنقیدی نظریے فکر انگیز اور دلچسپ ہیں۔ اس کتاب کی خوبیوں پر تفصیلی لکھنا تو یہاں ممکن نہیں لیکن یہ جاننے کے لیے کہ یہ کس نوعیت کی کتاب ہے، شبلی نعمانی، کے مضمون میں شبلی کا نظریہ شعر سن لیجیے۔

"اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات سے واقف نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو صرف ایک دھندلا دھندلا سا نقش نظر آتا ہے۔ شاعری ان بےپردہ چیزوں کو پیش کرتی ہے۔ دھندلی چیزیں چمک اٹھتی ہیں۔ مٹا ہوا نقش اجاگر ہو جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آجاتی ہے۔ خود ہماری روحانی تصویر جو کسی آئینے کے ذریعہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔ شعر ہم کو دکھاتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کا انگریزی اور اردو ادب کا مطالعہ بے حد وسیع معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً وہ کتابوں کے کیڑے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ادب سے سچے لگاؤ کے بغیر ایسی کتاب کوئی لکھ بھی نہیں سکتا۔ میں نے اس کتاب سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہوں ـــــ

(محمد خالد اختر)

مرزا کلب حسین خاں بہادر نادرؔ
حیات اور ادبی خدمات

مصنف و ناشر: ڈاکٹر معز زحسین قیصر
پتا: نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ امین آباد لکھنؤ
قیمت: چالیس روپے

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومتِ اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہونے والی کتابوں میں ڈاکٹر معز ز قیصر کا تحقیقی مقالہ مرزا کلب علی خاں بہادر نادر، حیات اور ادبی خدمات خاصا وقیع کام ہے۔ مرزا نادر اردو ادب کا ایک غیر معروف نام ہے۔ نام کتنا بھی غیر معروف کیوں نہ ہو اگر ایک صاحبِ نظر محقق کسی اچھے تخلیق کار کی تخلیقات کو گمنامی کے پردے سے نکال کر صحیح طور پر ان کا تعارف کراتا ہے تو دھیرے دھیرے لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور اگر واقعی اس میں کچھ جان ہے تو دنیائے ادب میں اپنا لوہا منوا لیتا ہے۔ مرزا نادر کے سلسلے میں ڈاکٹر معز ز قیصر نے نہایت پر خلوص کاوش سے کام لیا ہے۔ ان کی تلاش اور محنت کی بہر حال داد دینی ہوگی کہ انھوں نے ایک ایسے شخص

پر کام کرنے کا بیڑا اٹھایا جس پر سب کچھ انھیں کو لکھنا لکھانا تھا۔

یہ کتاب آٹھ ابواب پر منقسم ہے پہلا باب نادر کے سوانحی حالات کے لیے وقف ہے۔ دوسرے باب میں ان کے عہد کے لکھنؤ کا سیاسی اور سماجی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ اگلے چار ابواب میں بالترتیب نادر کی غزل گوئی، مرثیہ گوئی اور دیگر شعری اصناف زیر بحث آئی ہیں۔ ساتویں باب میں ان کے تذکروں پر گفتگو کی گئی ہے اور آٹھویں باب میں بحیثیت نثر نگار نادر کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر ان کی ادبی حیثیت کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح انھیں اپنے عہد کا ممتاز شاعر اور نثر نگار ثابت کیا گیا ہے۔ (خالد محمود)

اقبال اور عالمی ادب

مصنف : عبد المغنی
ناشر: کریسنٹ سپلی کیشنز وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ گیا ۸۲۳۰۰۱
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶
قیمت :- ساٹھ روپے

ڈاکٹر عبد المغنی نے اپنی کتاب "اقبال اور عالمی ادب" شائع کرا دی ہے۔ ۶۷۵ صفحات کی یہ تصنیف اصل میں پروفیسر کلیم الدین احمد کی کتاب "اقبال — ایک مطالعہ" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔

ڈاکٹر عبد المغنی نے پچیس (۲۵) برس "اقبالیات" کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے ادب کے آفاقی مطالعے کے لیے ایک بہترین معیار بھی دریافت کیا ہے۔

ص ۵۹ پر۔ الف۔ اس تخلیق کا موضوع کیا ہے۔

ب۔ اس موضوع کو کس اسلوب سے ادا کیا گیا ہے؟

اسی معیار کے تحت مصنف نے یورپ اور ایران و ہندستان کے نامور اور مستند شعرا سے اقبال کا موازنہ کیا ہے۔

ص ۴۶ پر مصنف نے فرمایا ہے:

"کلام اقبال میں مواد و ہیئت کی عضویت کمال درجہ پر ہے"

تبصرہ نگار کے لیے مصنف نے سہولت بہم پہنچائی ہے۔

اس تصنیف کا آخری باب "عالمی ادب میں اقبال کا مقام" ہے۔

ص ۶۷۵ پر یہ عبارت رقم فرمائی ہے:

(اس مقالے کو ایک مستقل کتاب کا خلاصہ یا مقدمہ سمجھا جائے)

چنانچہ اس مقالے کے گراں قدر اقتباسات نذرِ قارئین ہیں۔

۱۔ ص ۵۱۵ "رومی کی مثنویات کا حجم جو بھی ہو۔ اقبال کی فارسی مثنویاں (اسرار و رموز وغیرہ) اور اردو مثنوی (ساقی نامہ) ملا کر بہ اعتبار وصف رومی کی شاعری پر ایک وسیع اضافہ ہیں۔"

۲— "زبور عجم اور بالِ جبریل کی غزلیں حافظ کی حدودِ تغزل سے بلاشبہ آگے نکلی ہوئی ہیں۔"

۳۔ص ۵۶۶ ''رباعیاتِ اقبال کے مسرت وبصیرت کے مرکب میں رباعیات خیام کے مسرت محض کے مفرد سے زیادہ زود اور اثر ہے۔''

۴۔ ''سعدی کا موازنہ شعر بہت میں اقبال کے ساتھ کرنا کوئی بہت موزوں کام نہیں ہے۔ اقبال کا تفوق اس معاملے میں ظاہر ہے۔''

۵۔ ''معانی کے تنوع اور تخیل کی وسعت میں تو اقبال کا موازنہ میر و غالب کے ساتھ کرنا ہی فضول ہے۔''

۶۔ ''سنسکرت کے کالی داس اور عربی کے امراء القیس کا اقبال کے ساتھ موازنہ ویسا ہی ہوگا جیسے کسی تجربے کے آغاز کا تقابل اس کی ہیئت عروج کے ساتھ کیا جائے۔''

۷۔ص ۵۶۷۔ ''ٹیگور کی شاعری اقبال کے مقابلے میں ٹھوس قدریں بہت کم رکھتی ہے۔''

۸۔ص ۵۶۹۔ ''دانتے کی شاعری اپنی جگہ عظیم ہوتے ہوئے بھی لطافت و نفاست کے اس درجۂ کمال پر نہیں کہ آفاقی معیار سے اس کا موازنہ پورے طور پر اقبال کی شاعری کے ساتھ کیا جاسکے۔ شاعری کے اعتبار سے ڈوائن کومیڈی ہی کی سطح پر ''جاوید نامہ'' ایک فائق تر تخلیق ہے۔''

۹۔ ''پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، بالِ جبریل اور ضرب کلیم کے اقبال کی شاعری شیکسپیر کی شاعری سے اس طرح ایک درجہ آگے ہے جس طرح ''پیر رومی'' کی شاعری سے۔''

۱۰۔ ''شخصیت کے لحاظ سے جو قد و قامت اقبال کا ہے، کیا گیٹے اس کے قریب بھی کہیں پھٹک سکتا ہے۔''

غالب کو اپنی فارسی شاعری پر بڑا ناز تھا۔ وہ ایرانی شعرا کی ہم سری چاہتے تھے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ ہندی کہ بے رنگ من است

ان کا یہ بھرم بری طرح ٹوٹا۔ آج معلوم ہوا کہ اس باب میں غالب کا مذاق و معیار بغایت پست تھا۔ وہ خواہ مخواہ ایرانی شعرا کو بلند تر تصور کرتے رہے۔

یہاں یہ نکتہ یاد رہے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی کی تصنیف ''اقبال اور عالمی ادب'' کا مطالعہ کرنے کے بعد ''اقبالیات'' پر جتنا سرمایہ اہلِ قلم نے فراہم کیا ہے اس پر نظر ثانی، ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہے۔

اس کتاب کے بقیہ موضوعات درج ذیل ہیں۔

اقبال ــ ایک مطالعہ
اقبال اور دانتے
اقبال کی لمبی اردو نظمیں
اقبال کی مختصر اردو نظمیں
اقبال اور ملٹن

اقبال کی فارسی نظمیں۔
اقبال کی اردو اور فارسی غزلیں۔
ظاہر ہے مصنف نے اردو، ہندی، سنسکرت، بنگالی، عربی، فارسی اور انگریزی وغیرہ ادب کا براہِ راست مطالعہ کیا ہوگا۔ یہ محنتِ مطالعہ اور اخذ نتائج قابلِ مبارک باد ہیں اور ناشر بھی قابلِ فراخ دلی اور اقبال پرستی کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔
اس کتاب سے عام قارئین، طلبہ، اساتذہ اور خصوصاً ناقدین کو فیض پہنچے گا۔
کتاب نہایت شان دار چھپی ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

مجیب صاحب، احوال و افکار

مرتبین: ضیاالحسن فاروقی، مشیر الحق، شہاب الدین انصاری
عبداللطیف اعظمی
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی صفحات ۴۲۸
قیمت: نوے روپے۔ اشاعت: اکتوبر ۱۹۸۴

یہ مجموعہ مضامین ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو مجیب صاحب کی خدمت میں ان کی ۸۲ ویں سال گرہ پر پیش کیا گیا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مجموعے کے دو حصے ہیں اوّل 'احوال' اور دوم 'افکار'۔ اس طور یہ مجموعہ دو آتشہ کہلانے کا مستحق ہوگیا ہے۔
پہلے حصے کا آغاز مرتبین کی پیش گفتار سے ہوتا ہے جس کے آخری چند جملے یہ ہیں۔

"ہم مجیب صاحب کے سب سے زیادہ ممنون ہیں کہ انھوں نے ہم پر بڑا احسان کیا کہ اپنی طبیعت کے خلاف یہ حقیر پیش کش جسے ہم ایک درویش کی خدمت میں درویش کا برگِ سبز ہی کہہ سکتے ہیں، قبول کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔"

یوں یہ نذرانۂ عقیدت پیش ہوا ہے جو کہ مرتبین کی طرف سے محض 'احوالِ واقعی' کی حیثیت ہی نہیں رکھتا ہے بلکہ ان سب کے دل کی آواز بھی ہے جنھیں مجیب صاحب کے ساتھ رفاقت کی مسرت اور عقیدت کی سعادت حاصل رہی ہے۔ مجیب صاحب نے لگاتار ۴۴ سال جامعہ کی بے لوث خدمت کی ہے۔ ان کا ایثار اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے اپنے علم و فضل سے جامعہ کو وقار بخشا اور اپنی ذات سے سادگی و شائستگی کا ایک دل کش نمونہ پیش کیا۔ اس حصہ اول میں دس مضامین ملتے ہیں۔ ان میں مجیب صاحب کی دلآویز شخصیت کے چند اہم گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جو کہ ان کے مذہبی عرفان، جمالیاتی فکر، تہذیبی، تاریخ نگاری، اسلوب اور تعلیمی خدمت سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب مضامین اپنے موضوع کی اہمیت سے قطع نظر، ذاتی واقفیت کی صحت اور قربت کی لذت بھی رکھتے ہیں۔ ان کے اندر جھانکیے تو مجیب صاحب کی مرصّع زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جو شناسا نظروں کو تائید مسرت بخشتی ہیں اور ناآشنا نگاہوں کو کھولتی ہیں۔ لیکن ان مضامین میں تنوع کی کمی نظر آتی ہے اور مجیب صاحب کی زندگی کے کئی پہلو بیان ہونے سے رہ گئے ہیں۔ نیز دو مضمون نگاروں کے دو دو مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مجیب صاحب کا حلقۂ ارادت وسیع بھی ہے اور وقیع بھی۔ اس لیے اس کوزہ گری سے

مرتبین پر تن آسانی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ ان مضامین سے قبل خود مجیب صاحب کا ایک مضمون" میری دنیا" میرا دین" پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اپنی معنویت کے اعتبار سے خصوصیت کا حامل ہے اور یہاں غالباً اسی احساس کے تحت رکھا گیا ہے کہ اس سے مجیب صاحب کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ آخر میں "مجیب صاحب ایک نظر میں" عنوان کے تحت ان کی زندگی سے متعلق اہم تاریخیں اور واقعات درج کیے گئے ہیں۔

حصہ دوم' افکار' میں مجیب صاحب کی نگارشات کے ۱۹ نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ مجیب صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے اور مختلف موضوعات پر لکھا ہے۔ ان منتخب مضامین میں ان کی انشا پردازی، تاریخ دانی، ادب دوستی، انسان شناسی، دینی بصیرت، علمی نظر، اقدار پروری سب ہی کی نمایش ہوجاتی ہے۔ ان کے یہاں ندرتِ خیال، وقعتِ فکر اور لطافتِ زبان سب کا مزہ موجود ہے وہ صاحبِ طرز بھی ہیں اور دانشور بھی۔ اس انتخاب سے ان کی علمی و ادبی کاوش کا تعارف ہوجاتا ہے اور ان کا تعاقب بس 'نکہ پرکس' کی بات رہ جاتی ہے۔ ان انتخابات میں بیشتر کے ساتھ تاریخ اشاعت دے دی گئی ہے۔ ایک عام قاری کے لیے ان کی حیثیت اور واضح ہوجاتی اگر ہر ایک سے متعلق ایک مختصر نوٹ بھی دے دیا جاتا۔ سب سے آخر میں 'کتابیاتِ مجیب' کا اندراج ملتا ہے جو جامعہ کی ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کے تین کارکنان کی دیدہ ریزی کا ثمر ہے۔

اس نذرانۂ عقیدت کو ہم تک پہنچانے کا سہرا' مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں کے سر ہے جسے انھوں نے مکتبے کی روایات کے مطابق پورے حسنِ سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اچھا ہو اگر ایک "عوامی اشاعت" کا بھی وہ اہتمام کریں۔ اگرچہ مرتبین کا کہنا ہے کہ حق ادا نہ ہوا' اور مجیب صاحب کے جملہ نیازمند بھی اس بات سے پوری طرح اتفاق کریں گے، پھر بھی یہ ایک ایسا تحفہ تیار ہوگیا ہے جس سے دل کو حرارت اور نظر کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اشاعت کے مصداق حافظ شیرازی کا ایک شعر درج کیا گیا ہے۔ یہی شعر ہم سب عقیدت مندوں کے جذبات کا بھی ترجمان ہے:

"تا زے میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود
سر ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

(عبداللہ ولی بخش قادری)

شاد عارفی : شخصیت اور فن

مصنف: ڈاکٹر مظفر حنفی
پبلشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵
قیمت: ۲۴ روپے

فن کار کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تخلیق کسی کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتی اور صرف نقاد ہی نہیں "تنقید کے غرور کو بھی چکنا چور کردیتی ہے" تا آنکہ تنقید کو اپنے اصولوں پر نظر ثانی کرکے اس میں ترمیم و تنسیخ کرنی لازمی ہوجاتی ہے۔ ناقد اپنی جھوٹی انا کو برقرار رکھنے کے لیے ان کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے تو خود اس کا وزن دوقار ڈانواڈول ہوجاتا ہے۔ اسی قسم کے تخلیق کاروں میں شاد عارفی کا

نام لیا جا سکتا ہے۔ شاد عارفی کہنے کو تو ایک نام ہے لیکن عناصرِ اربعہ سے بنے اس انسان نے اپنے قلم رو میں ہزار جہان "تازہ پیدا کیے ہیں۔ اس کے کمالات تخلیقی کا ایک بڑا وصف ہر عظیم فن کار کی طرح اس کی انفرادیت ہے جو کہیں بھی ہو اپنی پیشانی پر چمکیلی پہچان لگائے رکھتی ہے۔ غزل ہو کہ نظم، مکتوب ہو کہ تنقید شاد اپنے لہجے کے تیور سے فوراً پہچان لیے جاتے ہیں۔

میر کے بعد زیادہ خلوص کا احساس شاد عارفی کے کلام میں ہوتا ہے میر و شاد دونوں کی زندگی غموں سے عبارت ہے۔ اگرچہ دونوں میں موضوعات سے لے کر شیوۂ گفتار تک بعد المشرقین ہے لیکن اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو جس دیانت داری کے ساتھ میر نے اشعار میں ڈھالا ہے اسی طرح شاد نے بھی کوئی خیانت نہیں کی۔ میر نے اپنی ذات کو نشانہ بنایا۔ شاد نے ہر ذات کو سنجیدہ اور گہرا طنز شاد کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اردو میں خالص طنز کی روایت عام نہیں اس کی جانب سے نثر و نظم دونوں میں شعوری کوشش کا فقدان رہا ہے۔ بدقسمتی سے اردو میں طنز کو مزاح سے الگ کرکے دیکھنے کی سنجیدہ تنقیدی یا تخلیقی کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ چنانچہ طنزیہ شاعری مستقلاً مزاحیہ انداز بیان کے دائرہ اختیار میں رہنے کی وجہ سے دوسرے درجے کی شاعری ہوکر رہ گئی اس کے برعکس انگریزی میں خالص طنز کی روایت مستحکم تھی اس وجہ سے اس کو وہی مقام حاصل ہوا جو معیاری ادب کے شایانِ شان تھا۔ اردو میں شاد عارفی وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے سنجیدہ اور خالص طنز کو اپنا فن بنایا اور اتنے خلوص سے اس پر محنت کی کہ غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیا۔

یہ محض اتفاق نہیں کہ دلوں میں اتر جانے والے اشعار میں سے ۷۵ فی صد وہ ہیں جن میں طنز کا کوئی نہ کوئی پہلو مضمر ہو۔ طنز موثر شاعری کا ایک ایسا وصف ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

غالب کی طرح شاد کو بھی اپنے "عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ" ہونے کا احساس اور ہم عصروں سے شکایتیں رہیں۔ غالب اور شاد میں قدرِ مشترک یہ حسین اتفاق بھی ہے کہ غالب کو غالب کرنے کی پہلی باقاعدہ کوشش ان کے شاگرد مولانا حالی نے کی تھی اور شاد عارفی کا مخلصانہ تعارف ان کے شاگرد ڈاکٹر مظفر حنفی کے ذریعہ ہوا۔

زیرِ نظر کتاب "شاد عارفی۔ شخصیت اور فن" مظفر حنفی کی اسی کوشش کا لازمی نتیجہ ہے اس سے پہلے بھی مظفر حنفی نے شاد پر لکھے گئے مختلف مضامین کو ترتیب دے کر "ایک تنہا شاعر" میں جمع کر دیا تھا لیکن اس سے ان کی تسکین کا سامان فراہم نہ ہو سکا تو شاد پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی راہ سے باقاعدہ تحقیقی کاوش کا آغاز کیا۔ یہ کاوش دوسرے تحقیقی کاموں کی طرح برائے ڈگری نہ تھی بلکہ اس میں شاد کی شخصیت اور فن کو ایک سچے محقق اور غیر جانب دار نقاد کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ادبی دنیا میں خود بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور بحیثیت شاعر شاد کے لب و لہجے کے سچے امین تسلیم کیے جا چکے ہیں۔ اپنے استاد سے حاصل شدہ طنز کے ورثہ کو مظفر حنفی نے نہ صرف سنبھال کر رکھا بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ میر کے والد نے اگر میر کو عشق کی تلقین کی تھی تو شاد عارفی نے مظفر حنفی کو طنز کی ہدایت کی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"زیادہ سے زیادہ طنز کو اپناؤ۔ گہرے زخم سماج اور سماجی بند ھنوں کے دلوں میں لگاؤ۔

رستے ہوئے زخموں کو اور رساؤ! بات بنتی جائے گی صرف سنجیدہ شاعری محض وقت ضائع کر سکتی ہے، مفید نہیں اور ادب میں افادیت بڑی چیز ہے۔"

کتابت کے پیش لفظ میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے شاد عارفی کی شخصیت پر اپنے مخصوص جامع انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے ایک مقام پر مظفر حنفی کے کام کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میرا خیال ہے اس مقالے کی اشاعت کے بعد اہلِ نقد و نظر دیکھیں گے کہ ابھی چند دہے قبل ہمارے درمیان سے جو سخنور خاموشی سے اٹھ گیا ہے۔ اس کی شخصیت اور فن کس قدر تہ دار تھے جو تمام عمر" دارالسرور" میں منتظر رہا لیکن اس کے نصیب میں لذت سرور کبھی نہ آئی اس کی زندگی مسلسل دیوانے کا خواب رہی وہ ہمیشہ مرکر جیا کیا لیکن اپنی فن کارانہ انفرادیت کا سودا نہ کیا۔ نامساعد حالات کے پیش کو اس نے فن کے ذریعہ گوارا بنا لیا۔ اس کی غیور اور خوددار انفرادیت نے کبھی ان سے پیار کیا کبھی ان پر تلوار بن کر ٹوٹ پڑا۔ لیکن ہار نہ مانی اور مانی تو اس طرح کہ اس کی شکست کی آواز گلبانگ شعر بن گئی۔"

زیرِ نظر کتاب نو ابواب کو محیط ہے۔ اولین دو باب سماجی اور ادبی پس منظر" نیز سوانح حیات اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں جس میں شاد عارفی پروان چڑھے اور ان کی شخصیت کی تعمیر و ارتقا ہوا انھوں نے ادب کی مختلف اصناف سخن میں بر اعتبار مقدار و معیار جو اضافہ کیا ہے اس کا تجزیہ بعد کے پانچ ابواب میں ہے۔ نیز سابقہ مباحث سے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں شاد عارفی کے ادبی مقام کے تعین کی سعی کی گئی ہے۔ آخر میں فہرست تلامذۂ شاد، ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کی فہرست اور ان کتب و رسائل کے اشارے بھی شامل کر دیے گئے ہیں جن سے اس مقالے کی تکمیل میں استفادہ کیا گیا ہے۔

کم و بیش ۴۰۰ صفحات پر مشتمل معیاری جائزے کی یہ کتاب اردو تحقیق کی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، جاذبِ نظر سرورق، صاف ستھری کتابت، دلکش طباعت اور نفیس کاغذ ہی پیرایۂ حسن کتاب کے وہ اوصاف ہیں جس کے پیش نظر چوبیس روپے اس کتاب کی بہت کم قیمت معلوم ہوتی ہے جسے ہر صاحبِ نظر مکتبہ جامعہ کی کسی بھی شاخ سے خرید سکتا ہے۔ (خالد محمود)

تقریر و تعبیر

مصنف: محمد ہدایت اللہ
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۲۵
قیمت: پندرہ روپے

کتاب زیرِ تبصرہ جناب ہدایت اللہ صاحب نائب صدر جمہوریہ کی تقاریر اور چند مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کاغذ سفید اور دبیز لگایا گیا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے۔ پیش لفظ ضیاء الحسن فاروقی کے قلم کا رہینِ منت ہے جس میں مصنف ان کے خاندانی اور تعلیمی حالات تحریر کیے گئے ہیں۔ اور شخصیت کے اکثر گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف کے والد محترم مشہور شاعر تھے اور طنز و مزاح کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے ان کا ایک مجموعہ جس میں طنز و مزاح کے مضامین ہیں سوز و گداز کے نام سے بمبئی کے ایک ناشر نے شائع کیا ہے۔ کلام میں ناصحانہ انداز نمایاں ہے۔ ہدایت اللہ صاحب کی تعلیم کیمبرج یونی ورسٹی میں ہوئی

دورانِ تعلیم میں انھوں نے یورپی ممالک کا سفر کیا ہے اور تجربات سفر سے دل و دماغ کو روشن کیا ہے۔ نگاہ میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ شعور میں مشاہدات کا خزانہ جمع ہوا ہے۔ شروع میں ہدایت اللہ صاحب چند سال ناگپور یونیورسٹی کے لا کالج میں پروفیسر رہے ہیں۔ پھر سینٹرل پروونسز میں حکومت کے پلیڈر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں ایڈوکیٹ جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پھر اسی حکومت میں ناگپور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا ممتاز عہدہ حاصل کیا اور جبل پور ہائی کورٹ کے جج نیز چیف جسٹس رہے۔ اصل میں ان کو قانون پر پورا عبور تھا ان عہدوں پر متعین ہونا ان کی قانونی قابلیت کا واضح ثبوت ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی وفات کے بعد ہدایت اللہ صاحب نائب صدر جمہوریہ اور قائم مقام صدر جمہوریہ کے جلیل القدر منصب پر متعین ہوئے ان کی شخصیت علوم کا مجموعہ تھی۔ اس حیثیت سے انھیں نابغہ (جینیس) کہنا بالکل صحیح ہے۔ فارسی انگریزی فرانسیسی اور سنسکرت نیز ہندی زبان میں بھی مہارت تھی۔ انھوں نے تلسی داس کی راماین سنسکرت اور ہندی دونوں زبانوں میں پڑھی۔ اردو اپنے ذاتی شوق سے پڑھی۔ اس زبان کی تاریخ ادب سے بھی واقفیت حاصل کی ان کی وہ تقریر جو مہاراشٹر کالج بمبئی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں کی گئی تھی۔ وسعتِ نظر اور اردو دوستی کی بہت اعلیٰ مثال ہے۔ اسی طرح اردو کے ماضی وحال پر اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اردو کے متعلق بڑی فراخ دلی اور عالی ظرفی کے ساتھ بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے علاوہ ادبیاتِ اردو، روایات اور خدمات غالب کا مرتبہ، غالب کی عظمت کے چند پہلو، منشی پریم چند، حسرت موہانی، شری گرونانک، بہادر شاہ ظفر، اردو شاعری کی عظمتِ رفتہ پر ان کے بیانات، وسعت نگاہ اور عمیق مطالعہ کے غماز ہیں وہ شعر فہمی کا عمدہ مذاق رکھتے ہیں۔ قدرت نے انھیں مزاج کا صاف ستھرا اور بلند سلیقہ بھی دیا ہے۔ وہ انگریزی میں لکھتے رہے ہیں۔ یہ اردو کی ہمہ گیری اور مقبولیت کا بیّن ثبوت ہے۔ کہ زیر تبصرہ کتاب انھوں نے اردو میں لکھی ہے۔ اس کو اردو میں ان کی پہلی تصنیف سمجھنا چاہیے جس کو زبان کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ صفحہ ۱۱۶ پر درج ہے۔

نسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

استاد ذوق سے منسوب کر دیا گیا ہے اصل میں شعر مذکورہ بالا میرے ہم وطن شاعر استاذ الاساتذہ قائم چاندپوری کی تراوشِ فکر کا نتیجۂ حسین ہے۔ یہ امر میرے لیے موجب فخر ومسرت ہے کہ ہدایت اللہ صاحب کا خاندانی تعلق میرے وطنِ ثانی بھوپال کے مشہور شہر سیہور سے ہے جہاں انگریزی حکومت کے دور میں ایجنٹ رہا کرتا تھا۔ اب وہاں ناظم یعنی کلکٹر رہتا ہے۔ (کوثر چاندپوری)

حیاتِ حافظ

مصنف: مولانا محمد اسلم جیراجپوری
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
قیمت: پندرہ روپے

مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم، جامعہ کے دورِ اوّل کے ان استادوں اور دانشوروں میں سے ہیں جنھیں علمی وادبی دنیا میں ممتاز اور منفرد مقام حاصل تھا۔ ۲۸ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو ۷۳ سال

کی عمر میں ان کا انتقال ہوا تو انھوں نے دو درجن سے زیادہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، جن میں سے بعض بڑے پایے کی ہیں، انھیں میں سے ایک پیشِ نظر کتاب بھی ہے، جو اگرچہ مرحوم کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے اور اس کی تصنیف پر پون صدی کی طویل مدت گزر چکی ہے، مگر اب بھی اس موضوع پر اردو میں اس کے مقابلے میں کوئی اور کتاب نہیں ہے۔ خود مولانا اپنی ابتدائی تصنیفات اور اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

"لکھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہے۔ جب میری عمر ۱۲ سال کی تھی، اس وقت فارسی قواعد میں ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں: "قواعد اسلمیہ" کے نام سے لکھ کر بھوپال کے سرکاری مطبع سے شائع کرایا تھا، لیکن میری تصنیفی زندگی دراصل علی گڑھ کالج سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے میں نے ۱۳۲۵ھ [۰۸-۱۹۰۷ء] میں "تاریخ القرآن" لکھی جو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نیز علی گڑھ کالج میں دینیات کے نصاب میں داخل کی گئی اور عرصے تک رہی۔ ۱۹۰۸ء میں خواجہ حافظ شیرازی کی لائف: "حیاتِ حافظ" لکھ کر علی گڑھ کالج سے شائع کی۔ یہ کتاب اس وقت بہت مقبول ہوئی، صوبہ متحدہ آگرہ واودھ کی ایڈمنسٹریشن ۱۰-۱۹۰۹ء میں یہ اس سال کی جملہ اردو میں شائع شدہ کتابوں میں چوٹی کی کتاب تسلیم کی گئی"

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ عرصہ ہوا، اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے تھے اور کافی مدت سے نایاب تھی، اب جون ۱۹۸۳ء میں، عام مطالبوں کے پیشِ نظر مکتبہ جامعہ نے اس کا چوتھا ایڈیشن آفسٹ میں شائع کیا ہے جو کتابت، طباعت، کاغذ غرض ہر لحاظ سے بہت خوب صورت ہے۔

اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود خواجہ حافظ شیرازی کے بارے میں تمام ضروری باتیں صاف اور سادہ زبان اور دلکش انداز میں بیان کی گئی ہیں، مثلاً نام و نسب اور تعلیم، شاعری کی ابتدا، امرا و سلاطین کا دربار، خواجہ کی شہرت، خواجہ کا تقدس، ذاتی حالات، تصنیفات، خواجہ کے کلام پر ایک نظر، تصوف، حافظ اور سعدی، کلام کی نسبت رائیں وغیرہ، غرض جو شخص خواجہ حافظ کے حالاتِ زندگی جاننا چاہتا ہے اور ان کے کلام کی خوبیوں کو سمجھنا چاہتا ہے، اس کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

علامہ اقبال نے "اسرارِ خودی" میں خواجہ حافظ پر سخت اعتراضات کیے تھے مگر لوگوں کے شدید ردِ عمل پر اس کے دوسرے ایڈیشن میں اس حصے کو خارج کر دیا۔ اس سلسلے میں مولانا اسلم مرحوم نے بعض بڑی اہم باتیں لکھی ہیں۔ اگر مناسب طور پر مرتب کر کے اس کو بھی اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہوتا تو میرے خیال میں اس کی افادیت میں اور اضافہ ہو جاتا۔

بہر حال اپنے موضوع اور مباحث کے لحاظ سے اردو میں اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ہے۔ امید ہے یہ چوتھا ایڈیشن بھی، جو پچھلے ایڈیشنوں کے مقابلے میں بہت خوب صورت ہے، قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور مقبول ہوگا

(عبداللطیف اعظمی)

شعور ادب
(انتخاب نثر و نظم)

مرتب: ادارہ
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت: اٹھارہ روپے

ملک کے مختلف حصوں میں انٹر اور بی اے کی کلاسوں میں اردو کا ایک پرچہ لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مقامی اساتذہ اور اداروں کی ترتیب شدہ کتابیں داخلِ نصاب رہی ہیں مگر نثر و نظم کے ایک جامع انتخاب کی ضرورت برابر محسوس کی جاتی رہی ہے۔ مکتبہ جامعہ جیسے مستند اور مرکزی ادارے کے ذریعہ شائع شدہ کتاب "شعور ادب" اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔

یہ کتاب میرامن سے لے کر آل احمد سرور تک کی نثری تحریروں کا احاطہ کرتی ہے۔ حصہ نظم میں میر سے لے کر ناصر کاظمی تک اردو شاعری کے ارتقائی سفر کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک انتخاب ہے، اردو نثر نگاری یا شاعری کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس لیے کچھ ایسے شعراء یا نثر نگار جو مقامی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اگر اس مجموعے میں جگہ نہ پا سکے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ لیکن کلیم الدین احمد، اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی، راسخ عظیم آبادی اور پرویز شاہدی کی تخلیقات کا انتخاب نہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ یہاں بھی ہم نے صرف ایک ریاست سے متعلق ادبا و شعراء کا ذکر کیا ہے۔ بعض دوسری ریاستوں کے چند اہم نثر نگار اور شاعر جو ہند و پاک کی ادبی دنیا میں ایک مقام رکھتے ہیں، اس انتخاب میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ امید ہے آئندہ ایڈیشن میں یہ کمی پوری ہو جائے گی۔

اس معمولی بھول چوک سے قطع نظر دیکھا جائے تو "شعور ادب" طلبہ میں اردو ادب کا حقیقی شعور پیدا کرنے اور انھیں اپنے ادب کی مختلف جہتوں اور کیفیتوں سے روشناس کرانے میں یقیناً کامیاب ہوگی۔ تخلیقات کے انتخاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ متعلقہ نثر نگار یا شاعر کا انفرادی رنگ و آہنگ نمایاں طور پر سامنے آ سکے۔ اردو ادب کے عہد بہ عہد ارتقا سے بھی پڑھنے والوں کو واقف کرایا جا سکے۔ مضامین کے آخر میں بعض تصویریں بھی شامل کر دی گئی ہیں جو طلبہ کے لیے مزید دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی سطح پر اردو کے تعلیمی معیار میں یکسانیت پیدا کرنے کی تجویز ایک عرصے سے زیرِ غور ہے۔ بہار اردو اکاڈمی نے اس سلسلے میں بعض مثبت اقدامات کیے تھے مگر پھر یہ معاملہ معرضِ التوا میں پڑ گیا۔ "شعور ادب" کو اس تجویز کی عملی شکل کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے اور ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں اسے داخلِ نصاب کر کے طلبہ اور ناشر دونوں کی بھلائی کرنی چاہیے۔ صوبہ بہار میں انٹر اور بی اے کی سطح پر اردو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اس لیے وہاں مختلف تعلیمی اداروں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں مقامی مفادات اور وقتی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے ہم اردو زبان کی اہم خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ کتابت و طباعت بہت اچھی اور قیمت بے حد مناسب ہے۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

الفاظ کا مزاج

مصنف: غلام ربّانی
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
قیمت: ستائیس روپے

مولوی سیّد غلام ربّانی کو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ تقریباً ۲۵ سال کام کرنے کا موقع ملا۔ آپ نے اس دوران سیکڑوں ادبی و علمی مضامین لکھے جو ہندستان اور پاکستان کے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔

زیر بحث کتاب "الفاظ کا مزاج" غلام ربّانی صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے جو زبان و ادب کے تعلق سے لکھے گئے ہیں کوئی شک نہیں کہ یہ موضوع بہت وسیع ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور لکھا جا رہا ہے۔ لیکن آپ نے بعض ایسے اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، جس پر آج تک بالکل نہیں لکھا گیا ہے۔ مثلاً کتبات اور شاعری، اردو افعال، شاعری اور جغرافیہ وغیرہ لیکن اس کے باوجود کچھ ایسے موضوعات بھی آپ نے انتخاب فرمائے جن پر بارہا لکھا جا چکا ہے۔ مثلاً محاورے یا کہاوتیں، اردو شاعری میں تشبیہیں اور استعارے اور الفاظ کا مزاج وغیرہ مضامین، آپ کے سوچنے اور لکھنے کے انداز سے بہت انوکھے اور اچھوتے بن گئے ہیں، ان میں نیاپن، نرالا انداز آ گیا ہے۔ جن کو پڑھ کر بہت سے طلسم ٹوٹ جاتے ہیں اور اردو زبان کی حقیقت سامنے آتی ہے اردو جو خالص ہندستانی زبان ہے پھر بھی نہ جانے کیوں لوگوں نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اس کا رشتہ فارسی سے جوڑ دیا۔ جس کا فائدہ اٹھا کر آج کے سیاست داں زبان کو بدنام کر رہے ہیں — یہ کتاب "الفاظ کا مزاج" ایسے حضرات کے قائم کردہ طلسم کو توڑتی ہے اور بتاتی ہے کہ جہاں اس زبان نے کچھ چیزیں، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں سے حاصل کیں ہیں، وہاں ہندستان کی علاقائی زبانوں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور مٹی کی بو اور رسم و رواج جیسی چیزوں کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ بقول عبدالماجد دریا بادی۔

> "ہماری یہ زبان جس کو اردو کہیں، ہندی کہیں، ہندستانی کہیں اس سمجھوتے اور مفاہمت پر مبنی ہے کہ اس کی بناوٹ میں ہر قوم کی زبان اور ادب کا کچھ نہ کچھ حصّہ شامل رہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہندستان جیسے ملک کے لیے اس سے بہتر ادبی سمجھوتہ ممکن نہیں"

بہت ممکن ہے کہ بہت سے حضرات کو یہ اعتراض ہو کہ بہت سے موضوعات اور مسائل جو اس کتاب میں اٹھائے گئے ہیں۔ پڑھے لکھوں کو معلوم ہیں۔ مگر پھر بھی جس انداز سے انھیں پیش کیا گیا ہے اور جس محنت و کاوش سے مثالیں پورے ادب میں سے تلاش کر کے مصنف نے پیش کی ہیں یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، بلکہ اس چیز نے مضامین میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔

کتاب کی زبان سادہ اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ مدلّل بھی ہے اور مصنف نے اپنے تمام مضامین میں موضوعات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے، کہیں بھی کسی قسم کی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ہے کیوں کہ ہر بات کے لیے ٹھوس دلائل پیش کیے گئے ہیں جس کے سبب صحیح نتائج سامنے آئے

ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ جناب مرحوم غلام ربانی صاحب کو مسائل کو علمی طور پر پیش کرنے کا فن آتا تھا۔ آپ منطقی ذہن کے مالک تھے اس لیے جابجا متوازن تنقیدی صلاحیتوں کا ثبوت اس کتاب میں ملتا ہے۔

غلام ربانی صاحب بڑی رواں دواں شستہ نثر لکھتے تھے، جو کچھ ان کے ذہن میں ہوتا تھا، جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے اس کے لیے بے تکلف برجستہ اظہار پر ان کے قلم کو پوری قدرت حاصل تھی۔ ہمارے بہت کم لکھنے والوں کو یہ قدرت یا مہارت حاصل ہے۔

میں اس کتاب کے مطالعے کی سفارش اس لیے کروں گا کہ اس سے تعلیمی طبقات میں مروج بہت غلط فہمیاں دور ہوں گی۔ بلکہ اردو کے صحیح مزاج کو بھی سمجھنے میں مدد ملے گی۔ غلام ربانی صاحب نے یہ چند مضامین لکھ کر وقت کی اہم ادبی و سماجی ضرورت کو پورا کیا تھا۔ لیکن اب مکتبہ جامعہ نے انھیں یکجا شائع کر کے اردو ادب پر ایک بڑا احسان کیا ہے کیوں کہ یہ اب ایک نیا پیغام دے رہے ہیں۔ کتابت وطباعت نہایت خوب صورت، صاف ستھری اور مکتبہ جامعہ کے عین معیار کے مطابق ہے۔

مجھے یہ کتاب "الفاظ کا مزاج" بہت پسند آئی ہے، جہاں یہ دلچسپ ہے تو وہاں اس کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے حوالوں کی غرض سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

(ڈاکٹر ہارون ایوب)

معاصر ادب کے پیش رو

مصنف: ڈاکٹر محمد حسن
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت: تیس روپے

پروفیسر محمد حسن کا شمار دور جدید کے اہم ناقدوں میں ہوتا ہے اور ان کا نظریہ تنقید بھی خاصا معروف ہے۔ مختلف علمی وادبی مسائل کے علاوہ عرفِ عام میں ترقی پسند کہے جانے والے ادیبوں اور شاعروں سے متعلق ان کے مضامین معیاری ادبی رسالوں میں برابر شائع ہو رہے ہیں۔ پیش نظر کتاب کا موضوع بھی بیشتر وہی ادیب و شاعر ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے انھیں "معاصر ادب کے پیش رو" کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر انشاء کی شاعری، ادب میں نظریے کی اہمیت اور مقدمہ انارکلی تین ایسے مضامین بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو بقول مصنف براہِ راست اس موضوع سے متعلق تو نہیں ہیں مگر پس منظر کے طور پر مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس کتاب میں عہدِ حاضر کے اہم اردو شاعروں مثلاً جوش، فراق، فیض، مجاز، جذبی، مخدوم، سردار جعفری، جاں نثار اختر، مجروح، کیفی، اور ساحر پر تنقیدی مضامین شریک اشاعت ہیں۔ جوش اور فیض کی شاعرانہ خوبیوں اور خامیوں کا تفصیلی مطالعہ ملتا ہے۔ فراق پر مضمون مختصر ہے مگر ان کی ادبی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ بقیہ مضامین بھی اپنے اختصار کے باوجود بے حد کارآمد اور معلوماتی ہیں۔ مرزا رسوا، پریم چند، اور کرشن چندر کے فن کا بھی تین علاحدہ مضامین میں جائزہ

لیا گیا ہے۔ ان تمام مضامین کی وجہ تصنیف پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے ابتدا ہی میں "دیباچہ" کے تحت لکھا ہے۔

"چنانچہ مسئلہ یہ تھا کہ رومانیت کو کس حد تک عمرانی معنویت اور نئی حسیت دی جاسکتی ہے اور اسے حقیقت نگاری سے کس حد تک ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ تخیل اور جذبے کے رنگ محل حقیقت نگاری کے سنگین مرقعوں کے کس حد تک متحمل ہو سکتے ہیں اور حسیت کس حد تک زندہ شعری تجربے میں ڈھل سکتی ہے۔ اس سوال کے جواب کی تلاش نے ان شاعروں اور ادیبوں کی کاوشوں تک جو رہبری کی جو رومانیت کی ہلکی پھلکی لطافت کو عمرانی معنویت سے بوجھل کرکے اسے نیا جمالیاتی پیکر عطا کرنے کی مہم میں پیش پیش تھے۔ زیر نظر مضامین ان ہی ادیبوں اور شاعروں کی کاوشوں کا جائزہ ہے۔"

پیش نظر کتاب کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مرزا رسوا پر مضمون غالباً سرسری طور پر لکھا گیا ہے۔ بقیہ تمام مضامین کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ موضوع بحث سے ایک نوع کی قربت اور وابستگی کے باوجود مصنف کا انداز بیان جذباتی نہیں، استدلالی ہے۔ پھر یہ کہ یہاں تنقید کی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ تخلیق کی لطافت اور شگفتگی بھی موجود ہے کیوں کہ ڈاکٹر محمد حسن ایک دلکش اسلوب کے مالک ہیں۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ جذبی کے بارے میں کہتے ہیں :۔

"جذبی کے ہاں حسن کو نئی دردمندی ملی ہے۔ اس کی آنکھیں نم ہیں اور زلفیں بکھری ہوتی ہیں....." جذبی کا آئینہ خانہ کافوری شمعوں کی اداس روشنیوں سے جگمگاتی ہے اور اس طرف وہ پری رخ محبوب کی پیار کرنے والی یادوں ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔"

مجموعی طور پر اس کتاب میں شامل تمام مضامین (ادب میں نظریے کی اہمیت کے علاوہ) ایسے فن کاروں پر لکھے گئے ہیں جو ہندو پاک کی مختلف درس گاہوں میں داخل نصاب ہیں اور طالب علم خاص طور پر ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔ ان کا آزادانہ مطالعہ کرنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان شخصیتوں کا ڈاکٹر محمد حسن نے ایک مخصوص نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ اردو دنیا میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

کتاب بہت صاف ستھری چھپی ہے۔ کاغذ عمدہ اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ بس کتابت کی بعض غلطیاں گراں گزرتی ہیں۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

کہانی کے پانچ رنگ

مصنف : شمیم حنفی
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵
قیمت : ۴۲ روپے

ابھی چند دن پہلے شمیم حنفی صاحب کی معرکہ آرا کتاب "کہانی کے پانچ رنگ" پڑھی اس کی تازگی، فکر اور انداز بیان سے بہت متاثر ہوا۔ اس کتاب کو پڑھ کر میرے ذہن کے دریچے کھل گئے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اپنے انوکھے وژن کے لحاظ سے افسانوی ادب میں یہ ایک اہم کتاب ہے۔ اور جسے ہر دانش ور کو جو خاص طور پر افسانوی ادب سے دلچسپی رکھتا ہے۔ تعصب کی

عینک اتار کر پڑھنا چاہیے۔

شمیم حنفی صاحب کو اردو ادب پر خاصی دست رس حاصل ہے وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں، اس کے ساتھ پورا انصاف کرتے ہیں کیوں کہ ان کا مطالعہ گوناگوں اور وسیع ہے۔ ادب پر ان کی نظر گہری ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ قلم کے دھنی ہیں۔ اسی وجہ سے اپنے خیالات کو بڑی خوش اسلوبی سے جامہ پہناتے ہیں کہ قاری محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور کتاب اس کے ہاتھ سے اس وقت چھوٹتی ہے جب وہ ختم ہو جاتی ہے۔ پیش لفظ میں آپ نے خوب صورت بات کہی ہے "کہانی کے یہ پانچ رنگ، چھ، سات آٹھ، اور دس بھی ہو سکتے تھے۔" لیکن آپ نے کتاب کو ضخامت سے بچا لیا اور دوسرے بہترین افسانوی ادب کے مصنفین پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، جو ایک علمی کارنامہ ہے۔ آپ کا انداز مہذب، شائستہ اور فکر انگیز ہے۔ آپ ہوائی باتیں نہیں کرتے ہیں اور باتوں باتوں میں کچھ اس انداز سے قاری کو قائل کر لیتے ہیں کہ اسے پتا بھی نہیں چلتا ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں پانچ بہترین افسانہ نگاروں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ وہ ہیں پریم چند۔ یلدرم۔ منٹو، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین۔ اس طرح یہ پانچ مضامین ہیں جن میں ہر ایک مضمون سیر حاصل ہے اور بیان یا وضاحت کی بنا پر ہر ایک مضمون اپنی جگہ ایک مکمل کتابچہ ہے۔

پریم چند کو پہلا اور اہم افسانہ نگار مانتے ہوئے آپ صاف گوئی سے یہ کہتے ہوئے بھی نہیں جھجکتے ہیں کہ ان کے تجربے کی صداقت اور انسانی روح کے تئیں ان کی دردمندی بجائے خود ایک بہت بڑی قوت تھی مگر حقیقت نگاری کے محدود تصور کی وجہ سے فن کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ بات جہاں پریم چند پر صادق آتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے ان تمام لوگوں پر بھی صادق آتی ہے جو حقیقت پسندی کے ترجمان ہیں۔ تخلیقی ادب میں پریم چند کا ایک نمایاں مقام ہے۔ لیکن "یہ روشنی بہت دور تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔"

یلدرم کی رومانیت پر بحث کرتے ہوئے آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انھوں نے اردو کے داستانوی ادب سے آگے بڑھ کر حقیقی زندگی کے مناسبات کی روشنی میں تخیل کی ترتیب کے واسطے سے انسانی عینیت کے ذوقی اور وجدانی عنصر کی حفاظت پر زور دیا۔ افسانہ تو خیر افسانہ ہے انھوں نے سفرنامے اور تاریخ کے بیان میں اسی رومان پرور اخلاقیات کے تقاضوں کا لحاظ قائم رکھا۔ اور افسانے میں اسرار کے عنصر کی قیمت سے آگاہ کیا۔

منٹو کے افسانوں پر مختلف انداز سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں شمیم حنفی صاحب اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ "منٹو کا معاملہ یکسر مختلف ہے بقول عسکری "ہر آدمی کا تجربہ اس کے لیے اتنا ہی قابلِ قدر تھا جتنا خود اس کا۔ وہ کسی کو قبول کرنے سے پہلے شرطیں عائد نہیں کرتا تھا۔ منٹو کی محبت بھی شدید ہوتی تھی اور نفرت بھی لیکن حقارت کا جذبہ اس کے اندر نہیں تھا۔" غرض وہ اپنی ذہانت کے وسیلے سے اپنے احساسات کے حقیقی اور واقعی اسلوب کی پہچان قائم کرتا تھا۔ اس کے افسانوں میں احساس کی وہ طہارت، سچائی، اور برجستگی ملتی ہے جو تجربے کے سچے براہ

راست اور فطری ادراک سے پیدا ہوتی ہے۔

"ہر شہر میں بدروئیں اور موریاں موجود ہیں جو شہر کی گندگی باہر لے جاتی ہیں۔ اگر ہم اپنے مرمریں غسل خانوں کی بات کر سکتے ہیں۔ اگر ہم صابن اور لیونڈر کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان موریوں اور بدروؤں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جو ہمارے بدن کا میل بنتی ہیں۔" (منٹو۔ کالی شلوار) الغرض منٹو سے متعلق مضمون بہت دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔

قرۃ العین حیدر کے فن پر بحث کرنے کے لیے آپ نے ان کی کہانی "نظارہ درمیاں ہے" کو مرکزی حیثیت سے برتا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی کہانیوں میں ابھرنے والے مسائل اخلاقی ملال اور اقدار کی بحث کے بغیر نامکمل رہتے ہیں۔

کتاب کا پانچواں رنگ پاکستانی افسانہ نگار انتظار حسین ہیں آپ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "انتظار حسین کا تخلیقی سفر چھوٹی بڑی ہزارہا تبدیلیوں سے رہائی کی ایک مکمل جستجو کا سفر ہے"

الغرض شمیم حنفی صاحب کی یہ کتاب ایک اہم اور ناقابل فراموش دستاویز ہے کیوں کہ افسانوی ادب میں اس کی حیثیت ایک حوالاتی کتاب کی ہے اور اس سے استفادہ حاصل کیے بغیر پریم چند بلدرم، منٹو، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین پر مطالعہ یا کوئی تحقیقی کام مکمل نہ ہوگا ـــ افسانوی ادب پر اتنے شستہ اور مدلل مضامین صرف شمیم حنفی صاحب ہی لکھ سکتے تھے ـ یہ کتاب روایتی انداز سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں پریم چند، بلدرم، منٹو، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے افسانوں کے موضوعات، کردار، پلاٹ، جنسی پہلو اور افسانوی ادب کے مختلف اسالیب اور مسائل پر بحث کرکے مضامین کو ایک نئی بصیرت عطا کی ہے جو ان کے اپنے من پسند افسانہ نگار رہیں۔

کتابت اور طباعت بہت صاف ستھری ہے اور قاری کو مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔ قیمت مناسب ہے۔ گٹ اپ جاذب نظر ہے۔ (ڈاکٹر ہارون ایوب)

۱۔ ادبی سماجیات
مصنف: ڈاکٹر محمد حسن

۲۔ شعر چیزے دیگر است
مصنف: عتیق حنفی۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵

قیمت: پندرہ روپے / ستائیس روپے

برصغیر کے اشاعتی اداروں میں مکتبہ جامعہ سب سے زیادہ معروف اور معتبر رہے۔ خاص طور پر ادبی کتابوں کی اشاعت اس کی اپنی تخصیص ہے۔ شروع ہی سے اردو ادب کے تخلیقی اور تنقیدی فن پاروں کو کتابت وطباعت کے پورے اہتمام سے مکتبہ شائع کرتا ہے۔ ادھر چند سالوں سے اس نے اپنے معیار اور معاملات کو زیادہ بہتر بنایا ہے۔ ابھی حال میں ہی کچھ اچھی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ ان میں پروفیسر محمد حسن کی "ادبی سماجیات" قابل ذکر ہے۔

ارسطو سے لے کر اب تک فنون لطیفہ کے افہام وتفہیم کے لیے بہت سے اصول اور ضابطے وضع کیے گئے ہیں اور تقریباً ہر دور میں مشرق و مغرب میں فن کی پرکھ کے اصولوں پر بحث بھی ہوتی رہی۔ مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آتے رہے ہیں جس سے فکر انسانی کا کارواں آگے

بڑھتا رہا۔ نقد و انتقاد کی مختلف النوع راہیں کھلتی رہیں۔ فن کی جانچ کے لیے بہت سے پیمانے سامنے آتے رہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ابھی تک ایک بھی جامع اصول مرتب نہ ہو سکا۔ اہلِ نظر کی تمام کاوشیں ادھوری ہی رہی۔ فن اور تخلیقِ فن کی پراسرار کیفیات ہماری گرفت و گیر میں نہ آ سکیں۔ ہاں مختلف نظریات کی مدد سے ہم فن کے رمز کو سمجھنے میں ایک حد تک کامیاب ہو سکے ہیں۔ شعر و ادب کی تحسین کے لیے ہمارے دور میں بڑی کوشش ہوئی۔ جمالیاتی، نفسیاتی اور سماجیاتی اصولوں نے کسی حد تک ہماری رسائی آسان کر دی ہے۔

قدیم طرزِ تنقید میں انتقاد کا مفہوم "نقد شناسیدن و کاہ از دانہ جدا کردن" تھا۔ مگر اب ہم اس پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ فن اور فن کے تمام متعلقات کا احاطہ کرتے ہیں۔ جس میں اس کا مزاج، ماحول، روایات اور ذہنی و فکری تغیرات سبھی شامل ہیں۔ ادب کا سماجی مطالعہ اس دور میں خاص طور پر بہت مقبول ہوا کیوں کہ اس سے فن کو پرکھنے کا ایک نیا زاویۂ نظر ملا۔ فن کی تخلیق کا سرچشمہ سماج کے گرد و پیش کے حالات قرار پائے۔ ضروری سمجھا گیا کہ شعر و ادب کے سماجی رشتوں کو زیرِ بحث لایا جائے۔ اس اصول کی فلسفیانہ اساس مارکسی تنقید پر قائم ہے۔

پروفیسر محمد حسن کی یہ کوشش ایک مستحسن قدم ہے۔ جس سے ادب و فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ادبی تخلیق کی تحسین اور تفہیم کے لیے ہم فن کار کی زندگی اور اس کے کوائف کو سماجی متعلقات میں پرکھتے ہیں۔ انتقادی ادب میں یہ ایک نیا موضوع ہے اور نئی کوشش بھی۔ ادبی فن پارے کا ایک سماجیات ہوتی ہے۔ جس میں ادب کو سماج کے رشتوں سے اور سماج کو ادب کے وسیلے سے مطالعے کی کوشش ہوتی ہے۔ تخلیق کے ساتھ فن کار کا بھی مطالعہ اسی سیاق و سباق میں کیا جاتا ہے۔ فن کار کے سرپرستوں کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ اور ان کے تعلق سے ادب کا رشتہ و پیوند دیکھا جاتا ہے۔ اسی تعلق سے پروفیسر محمد حسن نے کتاب کے دوسرے باب میں اردو ادب کے شاعر و ادیب کا گہرا اور دلچسپ تجزیہ پیش کیا ہے جس میں قدیم شعرا اور ان کے سماجی رشتے اجاگر کیے گئے ہیں۔ عصری دور کے شعرا، افسانہ نگار، ناقد اور محققین کا بھی سماجیاتی تجزیہ دل چسپ ہے اور ادبی ترسیل و ابلاغ کے لیے ایک نئی جہت فراہم کرتا ہے۔ خاص طور پر ان کے پیشے کی تفصیلات نے ایک تقابلی مطالعے کے لیے نیا عنوان دیا ہے۔ یہ حصہ اس کتاب کا بہت ہی دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ اس سے ہمارے دور کے قلم کاروں کے مسائل بھی بہت اچھی طرح سمجھے جا سکتے ہیں۔ جن کا تعلق سماجیات سے ہے۔

یہ کتاب مختصر ہے اور چھیانوے صفحات پر مشتمل ہے جس میں چھ ابواب ہیں۔ ابتدائی دو ابواب کے علاوہ اردو افسانہ، شاعری، غزل اور ڈراما کی سماجیات کا مطالعہ دیگر ابواب میں کیا گیا ہے۔ ادب اور فن کے طالبِ علم کے لیے یہ کتاب اہم ہے۔ کیوں کہ فن پارے کو سمجھنے کے لیے ایک نیا زاویہ سامنے لایا گیا ہے اور فن کے تخلیقی پس منظر کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے اصولوں کی طرح یہ بھی کوئی جامع و مانع کلیہ نہیں۔ اس طرزِ تنقید میں بھی خامیاں ہیں مگر یہ نیا طرزِ فکر اردو تنقید میں ایک مبارک قدم ہے۔ پروفیسر محمد حسن نئے موضوعات اور نئے پہلوؤں پر سوچتے رہتے ہیں چاہے وہ روحانی تحریک ہو یا فکری و تہذیبی پس منظر۔ یہی تازگی، فکر ان کی

شخصیت اور تصانیف میں نظر آتی ہے اور ہمیں سوچنے اور سمجھنے کے لیے مواقع فراہم کرتی ہے۔

ادبی سماجیات کے ساتھ مکتبہ جامعہ نے ایک اور اہم کتاب "شعر چیزے دیگر است" شائع کی ہے۔ جو اردو کے ایک خوش فکر شاعر عمیق حنفی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں شعر کی افہام و تفہیم اور اس کے اقدار پر خیال افروز گفتگو کی گئی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شعر کو پرکھنے کا کوئی ایک پیمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا اور نہ کسی اصول کو حرفِ آخر کہا جا سکتا ہے۔ سماجیاتی اصول ایک طریقہ ہے تو جمالیاتی اقدار کا مطالعہ دوسرا طرزِ فکر۔ ضرورت اس کی ہے کہ شعر کی رمزیت کو مختلف زاویۂ نظر کے ساتھ شے لطیف اور وجدان کو بھی خاطر میں لایا جائے۔ مشرقی اصولِ نقد میں اس کی اہمیت کا احساس موجود رہا ہے۔

اس کتاب میں دس ابواب ہیں۔ پہلا باب ابتدائی اور پُر مغز ہے۔ اس میں شعر اور تخلیقِ شعر پر گفتگو کی گئی ہے۔ مختلف ماخذ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ سنسکرت شعریات سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ قدیم ہندستان، یونان اور دوسری تہذیبوں میں موجود شاعری سے متعلق مواد کا، بالاختصار تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ قصہ قدیم و جدید کا بھی تذکرہ ہے۔ فن شعر کی فضیلتوں کا بھی ذکر ہے۔ شعر کی ماہیت اس کتاب کا دلچسپ باب ہے، اس موضوع پر حالی و شبلی سے لے کر اب تک اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے۔ عمیق حنفی کے نزدیک "شاعری کا تعلق منطق، خردمندی اور مروجہ فیشن سے نہیں جذبات، احساسات اور تاثراتِ قلبی سے ہے۔ شاعری کا رنگ روپ، مزاج انھیں عناصر سے ترکیب پاتا ہے۔" ان کا کہنا درست ہے کہ اس اہم نکتے کو نظر انداز کر کے ہم شعر فہمی کا ثبوت فراہم نہیں کر سکتے۔ ہمارے ناقدین کو بھی اپنے اصولوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

ان کے علاوہ "قدیم ہندستانی تصورِ شعر" "اصناف قدیم و جدید" اور اختتامیہ ابواب ہمارے مطالعے کے لیے سنجیدہ مواد فراہم کرتے ہیں۔ یہ کتاب ادب کے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے مفید ہے اور غور طلب بھی۔ عمیق حنفی اپنے شعر کی طرح نثر کی زبان کو بھی پر مغز بنا کے پیش کرتے ہیں جس سے تفہیم میں دقت اور اسلوب میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اس اہم کتاب میں موضوعات بہت ہی خیال افروز ہیں لیکن پیش کش کے اسالیب اور وسیلۂ اظہار میں مشکل پسندی نے راہ پالی ہے۔

چوں کہ یہ عنوانات مفید ہیں اور ہر طالبِ علم کو دلنشین کرانے کی ضرورت ہے اس لیے وسیلۂ اظہار میں بھی سادگی اور دل کشی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمیق حنفی ہمارے دور کے تخلیق کاروں میں نمایاں درجۂ امتیاز کے مالک ہیں کیوں کہ وہ تخلیق شعر کے ساتھ ایک سنجیدہ تنقیدی بصیرت کے بھی امین ہیں۔ (ڈاکٹر عبد الحق)

معنویت کی تلاش

مصنف: ڈاکٹر عنوان چشتی

پتا: رنگ محل پبلی کیشنز، انصاری روڈ، مظفر نگر

قیمت: تیس روپے

ایلیٹ کا یہ خیال بڑی حد تک درست ہے کہ شاعر کی سچی تنقید شاعر ہی لکھ سکتا ہے اردو

میں اس کی تصدیق میرؔ، محمد حسین آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، نیاز فتح پوری، خورشید الاسلام، آل احمد سرور، خلیل اعظمی، وزیر آغا، شمس الرحمان فاروقی وغیرہ کی تنقیدوں سے ہوتی ہے اور اب عنوان چشتی کے مجموعۂ مضامین ''معنویت کی تلاش'' سے اس کی تائید مزید ہوتی ہے۔ عنوان چشتی مزاج و انکار ہر دو اعتبار سے شاعر ہیں۔ ہر چند کہ تحقیق و تنقید پر ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ لیکن ان کے اندر کا تخلیق کار ہمیشہ اپنے اظہار کے لیے راستہ نکالتا رہا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ وہ سب سے پہلے شاعری کو ایک خالی پیکر تصور کر کے زبان و بیان اور اظہار کے وسائل کا فنی و عروضی جائزہ لیتے ہیں اور اس کے بعد معنوی ابعاد پر غور کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تنقید ڈھلے ڈھلائے رویوں کے برعکس خود فن پارے کے بطن سے برآمد ہو۔ پیش نظر کتاب میں انھوں نے اردو کے پندرہ شعرا کی کاوشوں کا جائزہ لے کر ہر شاعر کے کسی اچھوتے پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں بھی ان کے انتخاب کا دائرہ مروجہ حد بندیوں کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے چنانچہ قدما میں میرؔ، دردؔ، انیسؔ کے فن پر اظہار خیال ملتا ہے تو ترقی پسندوں میں سے فیضؔ اور جاں نثار اختر پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے اور ان سے سخت نظریاتی اختلاف رکھنے والے شاعر گوپال متل پر بھی مضمون موجود ہے۔ چھوٹے اور بڑے کی قید سے بھی عنوان چشتی نے خود کو آزاد رکھا ہے اور اکثر مضامین میں متعلقہ شاعر کے صحیح تخلیقی مزاج کی نشان دہی میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مسائل تصوف، عروضی نکات اور ہندی رس گیان پر اس کی مضبوط گرفت نے کتاب کی افادیت بڑھا دی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب ہر اچھی لائبریری میں رکھے جانے کے لائق ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

آتی جاتی لہریں

(تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

مصنف: مظہر امام
تقسیم کار: اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد (یوپی)
قیمت: ۴۰ روپے

مظہر امام کا نام اردو شاعری میں ایک معزز اور معتبر نام ہے۔ ادھر چند برسوں میں آزاد غزل کی پر زور وکالت کی وجہ سے وہ خاصے رسوا بھی ہوتے ہیں۔ اس رسوائی کی وجہ سے بھی انھیں شہرت ملی ہے اور ہماری تنقید کا ایوان جو دراصل ایک ہزار جھونپڑی سے بھی کم لحاظ ہے آزاد غزل پر ان کے خیالات سے گونج رہا ہے۔ کوئی اچھا تخلیقی فن کار جب بھی تنقید لکھتا ہے تو اسے میں توجہ اور دلچسپی سے پڑھتا ہوں کہ ایسی تنقید ہم پر معلومات کے نہیں بصیرت کے دروازے کھولتی ہے۔ اردو کی مشہور تنقید اپنی بے بصری، حساس کے کندین اور وجدان کے موتیا بند کی وجہ سے خاصی بے نقاب ہو چکی ہے اور ہمارے حقیقی تخلیقی فن کاروں کی نظر میں مشتبہ ہے۔ کمزور صلاحیتوں کے فن کار تنقید سے ہدایت نامے حاصل کرتے ہیں جب کہ تخلیقی توانائی سے بھرپور لکھنے والے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ تنقید کو اپنی پرکھ کے معیار تخلیق سے ہی حاصل کرنے چاہییں۔

آج جب کہ ہماری ادبی تنقید بحران کا شکار اور نقطۂ نظر اور طریقۂ کار کے سلسلے میں واحدیت Monism کے عذاب جھیل رہی ہے، اچھی ادبی تنقید کے نمونے تخلیقی فن کار ہی پیش کر رہے

ہیں۔ ایسے تخلیق کاروں میں مظہر امام بھی ہیں۔ وہ پیشہ ورانہ تنقید سے نا آسودہ ہیں اور بجا طور پر نا آسودہ ہیں اور اپنے زیر تبصرہ مضامین میں جگہ جگہ اس کی آمریت کو چیلنج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اپنی کتاب کے پیش لفظ میں انھوں نے ساری ذہنی بے باکی کے ساتھ صورتِ حال کا جائزہ لیا وہ لکھتے ہیں:

"لغاظ مغنیانِ تنقید ادب کے میدان میں دندناتے پھرتے ہیں اور بیچارہ تخلیق کار ایک کونے میں کھڑا اپنی بے باکی کا ماتم کرتا پھرتا ہے۔ گزشتہ پندرہ بیس سال کے دوران تخلیقی فن کاروں کو جتنا نقصان تنقید نگاروں سے پہنچا ہے اتنا نہ سماج سے پہنچا ہے نہ حکومت وقت سے اور نہ کسی تنظیم کے احتساب سے... فن کار اس کا پابند نہیں ہے کہ وہ کن جذبات یا تجربات کا انتخاب کرے اور انھیں کون سا پیرایۂ اظہار بخشے۔ اس کا تخلیقی عمل نقاد کے مشورے کا محتاج نہیں ہے۔ تنقید تخلیق کی دست نگر ہے۔ تخلیق کے بغیر تنقید کوئی معنی نہیں رکھتا" (پیش لفظ آتی جاتی لہریں)

اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تنقید جیسے دراصل بقول Allen Tate ہمارے ادبی ضمیر یعنی ذوق کا نگہبان و محافظ ہونا چاہیے، وہ ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ایڈورڈ ایلبی کے لفظوں میں برسوں سے قاری کو گمراہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ صورتِ حال بڑی سنگین ہے اور ایسی صورت میں تخلیقی فن کاروں کا تنقید کی نارسائیوں سے نا آسودہ ہو کر علمِ بغاوت بلند کرنا ایک فال نیک ہے۔

مظہر امام اپنے آپ کو باقاعدہ نقاد نہیں سمجھتے اور سمجھنا بھی نہیں چاہیے پھر بھی ایک اچھے تخلیق کار کی طرح ان کے تنقیدی تاثرات میں ایک تیز اور شائستہ تنقیدی بصیرت کی کار فرمائی ہے۔ "آتی جاتی لہریں" میں مضامین کی کل تعداد ستر ہے۔ پہلا مضمون ترقی پسندی کے جدیدیت تک" دراصل نوعیت کا ہے مگر اس میں بھی ان کی تخلیقی بصیرت سے ان کا تنقیدی شعور ہم رکاب ہے۔ اردو میں جدیدیت کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں کیا کچھ حقیقی تجربے پر مبنی ہے اور کیا کچھ نقلی ہے ان کی توجہ کا مرکز ہے۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ جلد ہی آج کی جدیدیت کل کی جدیدیت کے لیے جگہ خالی کر دے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے مغرب میں Modernism کی جگہ Post-modernism نے لے لی ہے۔ انھیں اس بات کا بجا طور پر شکوہ ہے کہ مغرب سے اردو تک پہنچتے پہنچتے مغرب کی بہت سی چیزیں پرانی ہو جاتی ہیں یا گل سڑ چکی ہوتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے نقاد ایلیٹ کی نظم 'خرابے' کے بارے میں کچھ اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں گویا یہ نظم ۱۹۲۲ء میں نہیں کل کسی رسالے میں چھپی ہو۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ مظہر امام کی باخبری کی سطح بہت سے پیشہ ور Criticasters یعنی نقادوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

ایک اچھے نقاد کی طرح مظہر امام نے بعض دوسرے درجے کے شعراء کے کلام میں انفرادیت کی تلاش کا کام بڑے سلیقے سے انجام دیا ہے۔ یہ کام کرنے کا ہوتا ہے کہ بڑے شاعروں کے مقابلے دوسرے درجے کے شاعر دوسرے شاعروں کو زیادہ معنی خیز طور پر متاثر کرتے ہیں۔ بڑے شاعر تو آنے والوں کے لیے بقول ایلیٹ دیوار چین بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے مظہر امام کے 'شاد عظیم آبادی'، پرویز شاہدی، سلام مچھلی شہری اور محمد علوی پر مضامین ان شعراء کی نو آبادکاری کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں اور ان

کی شناخت کے بعض اہم عناصر کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ ہماری نئی تنقید نظری سطح پر کسی حد تک خود اعتمادی سے باتیں کر لیتی ہے کہ ان امور میں مغربی تنقید میں امکار امپورٹ امگل کرنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آتی مگر جب معاملہ اطلاق کا آتا ہے تو بیکلانے لگتی ہے مگر اس خود فریبی میں مبتلا رہتی ہے کہ وہ بغیر محمد خاں گویا ہے۔ مظہر امام کی خوبی یہ ہے کہ وہ تنقیدی پرکھ کے معیار تخلیق سے ہی برآمد کرتے ہیں اور پھر ان کے اطلاق میں اس ذہنی ہمدردی کا ثبوت دیتے ہیں جس کا اردو کی نئی تنقید میں بڑی کمی ہے۔ آزاد غزل پر ان کا نوٹ مجھے کچھ اعتذاری سا محسوس ہوا جب کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ انھوں نے اجتہاد بھی کیا ہے تو اسے جم کر Defend کرنا چاہیے تھا اور مخالفت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ آزاد غزل کا جب انھوں نے نعرہ لگایا تھا تو انھیں اس بات کا احساس ضرور رہا ہوگا کہ غزل بڑی قلعہ صنف سخن ہے۔ اب جب انھوں نے اس قلعے پر دھاوا بول دیا تو انھیں اس کے محافظوں کی خشم کی سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔ اس کا تجربے کا دفاع صرف اعلا درجے کی تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ غالباً وہ یہ نکتہ جانتے ہیں کہ تخلیق خود آپ اپنا دفاع ہوتی ہے۔ میں آزاد غزل کے وجود سے انکار یوں نہیں کر سکتا کہ وہ خود مظہر امام کے ہاتھوں وجود میں آ چکی ہے، مجھے دلچسپی اس کے ان تخلیقی امکانات سے ہے، جنھیں ابھی بروئے کار آنا ہے۔

'آتی جاتی لہریں' ہر لحاظ سے ایک قابلِ توجہ دستاویز اس وجہ سے ہے کہ اس کے مصنف کم اہم تخلیقی فن کار نہیں ہے۔ ایلیٹ کے اس خیال سے مجھے سو فی صدی اتفاق ہے کہ صرف شاعر ہی شاعر کی تنقید کے مطالبات پورے کر سکتا ہے۔ (انور صدیقی)

شاعری اور شیوۂ پیغمبری

مصنف: صفدر
ملنے کا پتا: ایس۔ اے سید، عقب پنچایت سمیتی، وڈورڈ (امراوتی)
قیمت: پندرہ روپے

صفدر صاحب ایک نوجوان شاعر اور ادیب ہیں اور زیرِ تبصرہ کتاب ان کے بارہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو اردو کے معروف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں جہاں بزرگ مصنفوں اور دانش وروں کے بارے میں مضامین ہیں، جیسے: نقادِ حالی ایک مطالعہ اور شبلی کی تنقید نگاری، وہاں جدید شعراء اور ادیبوں کے بارے میں بھی ہیں۔ مثلاً: وزیر آغا کی تنقید نگاری، مجروح سلطان پوری کی شاعری اور پانچواں درویش۔ مظفر حنفی۔

آخر الذکر دونوں مضامین کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار ترقی پسند شعرا کی سکہ بند شاعری اور جدید دور کے بے چہرہ ادیبوں اور شاعروں سے سخت بیزار ہیں، چنانچہ جب مجروح کے ان اشعار پر جو ان کی نظر میں پارٹی کا نڈ لائن پر کہے گئے ہیں، انھوں نے سخت اور جارحانہ تنقید کی ہے مگر ساتھ ہی ان اشعار کی دل کھول کر تعریف بھی کی ہے جن میں تخلیقی فکر اور اثر آفرینی انھوں نے محسوس کی۔ مجروح کی شاعری کے بارے میں ان کی رائے ہے! "جب مجروح اشتراکی وفاداری محاذ آرائی، جوش و خروش اور انقلاب کی بات کہہ چکتے ہیں، یعنی پارٹی ممبر کی حیثیت سے اپنا فرض

منصبی پورا کر چکے ہوتے ہیں تو وہ اپنی جون میں واپس آتے ہیں، میرے خیال میں ایسے ہی لمحات مجروح کے اپنے اور مجروح کی شاعری کے ہیں، یہاں انھیں اپنا آپ نظر آتا ہے اور وہ اپنی نظر استعمال کرتے ہیں۔ (ص ۱۰۷) مزید لکھتے ہیں: "جس مقام پر مجروح اجتماعیات کے دھوکے سے آزاد ہوتے ہیں اور اپنی شاعرانہ انفرادیت کو بروئے کار لاتے ہیں، وہاں خالص تخلیقی وجود میں آتی ہے (صفحہ ۱۰۸)

ڈاکٹر مظفر حنفی فاضل مضمون نگار کے طنز و تعریض سے بالکل محفوظ تو نہیں رہے مگر مجروح کے مقابلے میں یقیناً وہ خوش قسمت ہیں۔ ان سے غالباً موصوف کو دو شکایتیں ہیں: ایک یہ کہ انھیں شاد عارفی سے جذباتی عقیدت ہے، اس حد تک کہ ان کے ذہن اور قلم پر وہی حاوی رہتے ہیں: طنزیہ شاعری بھی اصلاحی شاعری اور مقصدی شاعری کی طرح بڑی شاعری نہیں ہو سکتی۔" (صفحہ ۱۱۲) لیکن آگے چل کر موقف بدلتے ہیں اور لکھتے ہیں: "شاد عارفی کی جادوگری سے جب مظفر حنفی نکلتے ہیں تو انھیں اپنی ذات، اپنا لب و لہجہ اور اپنے رنگ کا احساس ہوتا ہے۔" (صفحہ ۱۱۳) اس کے بعد مظفر صاحب، بہ الفاظ صفدر صاحب: "یاس یگانہ چنگیزی کی روایت کو ایک نئی جہت عطا کر دیتے ہیں، وہ مردانہ پر اعتماد لہجہ، جو اردو غزل کو یگانہ کی دین ہے، مظفر حنفی کے یہاں ایک نئے فکری رچاؤ کے ساتھ ہندو پاک کی نئی غزل میں ایک منفرد آواز بن جاتا ہے" (صفحہ ۱۱۴) مزید فرماتے ہیں: "مظفر حنفی فلسفی نہیں بنتے کسی یوٹوپیا میں پناہ گزیں نہیں ہوتے، زندگی سے ٹھٹھا نہیں کرتے، وہ زندگی کے پانیوں [آگ میں کیوں نہیں؟ اعظمی) گلے گلے اتر جاتے ہیں۔ ہماہمی اور مسلسل پیکار ان کی شاعرانہ فکر کے محرک ہیں... دراک ذہن، بے باک لہجہ اور فنی آگہی کے امتزاج سے مظفر کی غزل عبارت ہے، اس راہ پر مظفر آپ ہی اپنے ہم سفر ہیں، جہاں آواز بہت بلند ہو جاتی ہے، وہ اس مقام سے ہٹ جاتے ہیں جو اردو غزل میں ان کی ذات سے مخصوص ہے۔" (صفحات: ۱۱۵ تا ۱۱۷)۔

"شبلی کی تنقید نگاری" مختصر ہونے کے باوجود خاصے کی چیز ہے، اگر شبلی کی تنقید نگاری کا موجود تنقیدی رجحانات و نظریات کی روشنی میں، مطالعہ کیا جاتا اور کسی حد تک دونوں ادوار کے خیالات و رجحانات کا موازنہ بھی کیا جاتا تو اس کی معنویت اور اہمیت میں بہت اضافہ ہو جاتا۔ مجھے ذاتی طور پر اس خیال سے اختلاف ہے کہ شبلی کی "مذہبیت نے انھیں علی گڑھ سے دور کر دیا اور وہ ندوہ کے رخ پلٹ کر نئی زندگی سے دور ہو گئے۔" (صفحہ ۲۷) جن لوگوں نے شبلی کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ سرسید مرحوم کی زندگی کے آخری زمانے میں، ان کے سیاسی خیالات اور سرگرمیوں سے شبلی کا اختلاف بہت بڑھ گیا تھا اور ان کی وفات کے بعد علی گڑھ کی زندگی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ شبلی تو خیر بہت بلند اور اعلا شخصیت کے مالک تھے، ایک معمولی شخص بھی، جسے اپنی رائے اور وقار کا ذرا بھی پاس ہو، وہاں نہیں رہ سکتا تھا۔

مختلف موضوعات پر بارہ مضامین کے علاوہ بالکل شروع میں "عرض مصنف" کے نام سے صفدر صاحب کے قلم سے ایک مختصر تحریر شامل ہے، اس کے بعد "ناگپور رہا ودیالیہ کے شعبۂ عربی کے پروفیسر اور صدر ڈاکٹر سید عبدالرحیم صاحب کے دو صفحے کا پیش لفظ ہے، جس میں موصوف نے صاحبِ مجموعہ کے لب و لہجہ اور زبان کے بارے میں لکھا ہے: "صفدر صاحب کی زبان تیکھی اور چٹ پٹی ہے جو مصنوعی

یا اختیار کی ہو گی معلوم نہیں ہوتی، خیال اور الفاظ کی ہم آہنگی نے زبان اور اسلوب کا روپ دھار لیا ہے۔ بظاہر ایسی زبان "تنقید نگاری کے لیے موزوں نہیں" لیکن محمد حسن عسکری اور وارث علوی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔" (صفحہ ۱۰۱) اگر موصوف کے نزدیک کوئی زبان یا اسلوب نامناسب ہے، تو محض مثال سے کیا ہوتا ہے۔ نامناسب تو نامناسب ہے۔

گو کتاب متفرق مضامین کا مجموعہ ہے اور مختصر بھی مگر پھر بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ امید کہ اردو کے حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ (عبداللطیف اعظمی)

شخص و عکس

مصنف: حمایت علی شاعر
پتا: المصنفین، الفلاح سوسائٹی، کراچی
قیمت: ساٹھ روپے

کتاب کا نام پروفیسر عنوان چشتی کے خاکوں کے مجموعے "عکس و شخص" کی یاد دلاتا ہے۔ خود راقم الحروف کی کئی کتابوں (پانی کی زبان، صریرِ خامہ، شوخیٔ تحریر، طلسمِ حرف وغیرہ) کے نام پاکستان میں خوب استعمال کیے گئے۔ موجودہ "عکس و شخص" دراصل مشہور ترقی پسند شاعر اور فلمی نغمہ نگار حمایت علی شاعر کے تاثراتی نوعیت کے مضامین (جن میں سے بیشتر رونمائی کی تقریبات کے لیے قلمبند کیے گئے تھے) بیش لفظوں، تبصروں اور تنقیدی کالموں میں چھپنے والے مراسلات کا مجموعہ ہے۔ حمایت علی شاعر کی نثر بھی اتنی ہی جاندار اور شگفتہ ہے جتنی کہ ان کی شاعری۔ مجھے بطورِ خاص اس کتاب کے آخری حصے "تزکیہ" کی تحریروں نے متاثر کیا جس میں شاعر کے وہ مدافعتی مضامین شامل ہیں۔ جو موصوف نے اپنے معترضین کے جواب میں لکھے تھے ان میں پینترے بدل بدل کر کاٹ کرنے، دار بچانے اور خوب ضرب کاری لگانے کا انداز خاصا دلچسپ ہے مختلف ادبی نکات پر اپنے مفید مطلب حوالے تلاش کرنے کے لیے انھیں جس وسیع مطالعے اور وقتِ نظر سے گزرنا پڑا وہ بھی قابلِ لحاظ ہے۔

یہ کتاب ایک بار پھر اس خیال کو مستحکم کرتی ہے کہ شاعری کی تنقید کا حق شاعر ہی ادا کر سکتا ہے۔

کتاب عام پاکستانی کتب کی طرح خوب صورت چھپی ہے۔ (ڈاکٹر مظفر حنفی)

میر کی شعری لسانیات

مصنف: قاضی افضال حسین
پتا: تقسیم کار مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
قیمت: ۴۰ روپے

میر، غالب، اقبال، پر ہم چند اردو تحقیق و تنقید کے میدان میں انڈسٹری بن چکے ہیں۔ ان سے متعلق کوئی اچھی کتاب سامنے آئے تو حیرت ہوتی ہے۔ قاضی افضال حسین صاحب کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد بھی ایک خوشگوار حیرت کا تجربہ ہوا، کچھ اس لیے بھی یہ کتاب میر پر ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ ڈاکٹریٹ کے عام کاروبار کے بارے میں کچھ نہ کہنا بہتر۔ زیرِ نظر کتاب پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالا

ہونے کے باوجود اپنی حرمت بچالے گئی۔ انفصال صاحب نے میر کے نظامِ شعر کا مطالعہ جس ذہانت اور بصیرت کے ساتھ کیا ہے۔ اس نے اس کتاب کو میریات میں ایک اضافے کی حیثیت بخشی ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ انفصال صاحب نے میر کی زبان، استعارات، تشبیہوں اور علامتوں کے واسطے سے ان کے پورے تخلیقی کردار کا احاطہ کیا ہے اور اس طرح کہ ہیئت اور مواد کی ثنویت کا خام تصور آپ ہی آپ منتشر ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب پڑھنے والے کے ذہن کو منور بھی کرتی ہے اور اس کے ذوق کی تربیت بھی۔ اس علمی کارنامے کی کما حقہ پذیرائی ہونی چاہیے۔

(شمیم حنفی)

آسان اردو
(ہندی کے ذریعے)

مصنف: شکیل اختر فاروقی
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،
قیمت: چھ روپے

زبان سکھانے والی ہر کتاب منطقی نظم و ترتیب اور اپنے سائنٹفک ہونے کا دعوا کرتی ہے۔ اس کی خامیوں کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب اسے باقاعدہ طور پر برتا جاتا ہے۔

شکیل اختر فاروقی صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مدرسۂ اساتذہ میں اردو زبان سکھانے کا ایک لمبا تجربہ رکھتے ہیں۔ اس تجربے کی روشنی میں یہ کتاب انھوں نے ترتیب دی ہے۔ بہت آسان، عام فہم اور دلچسپ انداز میں۔ اسباق کی درجہ بندی طالبِ علم کی مشقت اور اس کے ذہنی ارتقا کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ زبان اور رسم الخط کی ترتیب کا جو زاویہ اختیار کیا گیا ہے وہ بھی بہت باضابطہ ہے اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اردو سیکھنے والوں میں مقبول ہوگی۔

(شمیم حنفی)

۱۔ نقد ادبیات فارسی
۲۔ فارسی زبان و ادب، ایک ثقافتی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر سمیع الدین احمد
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
قیمت: چھتیس روپے

ڈاکٹر سمیع الدین احمد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں استاد ہیں۔ ہندستان کے فارسی ادب اور ایرانی ادبیات پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ اس سلسلے میں ان کے علمی مقالات انگریزی اور اردو کے ممتاز جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔

ان کی تحریروں کے یہ دو انتخابات یکے بعد دیگر سامنے آتے ہیں۔ نئے حقائق پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سمیع الدین احمد نے معروف موضوعات پر بحث میں بھی کئی نئے گوشے پیدا کیے ہیں۔ ان کا اندازِ نقد بنیادی طور پر علمی ہے اور علمی مطالعے کے مقاصد و مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ۔ فارسی زبان و ادب سے شغف رکھنے والوں کے لیے یہ کتابیں ہر لحاظ سے کارآمد ثابت ہوں گی۔

(شمیم حنفی)

رشید احمد صدیقی۔ آثار و اقدار

مرتب: اصغر عباس
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔
قیمت: ۴ روپے

مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا شعبۂ اردو کئی حیثیتوں سے ممتاز تھا۔ نامی گرامی اساتذہ اور سنجیدہ علمی و ادبی سرگرمیاں۔ رشید صاحب اس شعبہ کے منتخبات میں تھے۔ ان کے علمی، ادبی اور شخصی محاسن کا اعتراف پوری اردو دنیا میں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اصغر عباس کی یہ خدمت ہر حلقے میں پسند کی جائے گی کہ انھوں نے خود شعبۂ اردو کی طرف سے اس شعبے کے معمار اول کی زندگی اور کارناموں پر یہ کتاب مرتب کر ڈالی جیسا کہ اس نوع کی اکثر کتابوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں بھی کئی مضامین رسمی اور نیازمندانہ قسم کے ہیں لیکن ایسے مضامین کی تعداد بھی خاصی ہے جن کی مدد سے رشید صاحب کی شخصیت اور ان کے افکار و عطیات کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اصغر عباس صاحب کو علی گڑھ سے عشق ہے۔ چنانچہ سرسید کی صحافت کے موضوع پر ان کی ایک وقیع کتاب پہلے ہی سامنے آ چکی ہے۔ مولوی ذکاء اللہ اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مضامین کا انتخاب بھی انھوں نے اترپردیش اردو اکاڈمی کی طرف سے شائع کیا ہے۔ ترتیب و تدوین اور تحقیق و تجزیے کا ہر کام وہ سچی محنت اور لگن کے ساتھ کرتے ہیں۔ رشید صاحب پر ان کی زیر نظر کتاب علی گڑھ کے علمی و ادبی روایت کی پاسبانی بھی کرتی ہے اور اس کی توسیع بھی۔ (شمیم حنفی)

یادگارِ سلیمان

مرتبہ: پروفیسر عبدالقوی دسنوی
ناشر: بہار اردو اکیڈمی ۸/بی سری کرشنا پوری پٹنہ ۱
قیمت: ۲۵ روپے

علامہ سید سلیمان ندوی اردو زبان کے ان معدودے چند بلند قامت مصنفوں میں سے ایک ہیں جن سے علوم مشرقیہ اور اسلامیات کو زندۂ جاوید کتابیں ملی ہیں۔ وہ نومبر ۱۸۸۴ء میں دیسنہ (بہار) میں پیدا ہوئے اور نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ ان کی تصانیف میں سب سے اہم کام شبلی نعمانی کی شروع کی ہوئی کتاب سیرت النبی کی تکمیل ہے۔ شبلی مرحوم نے سیرۃ النبی کا ایک حصہ مکمل کیا تھا۔ دوسرا تکمیل طلب تھا اور پورا منصوبہ پانچ جلدوں میں مکمل ہونا تھا۔ سید سلیمان ندوی نے اس کو سات جلدوں میں اختتام تک پہنچایا جس کا ساتواں حصہ نامکمل رہ گیا۔ سیرت طیبہ کے موضوع پر مشرقی اور مغربی زبانوں میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن بعض خصوصیات کے اعتبار سے سیرۃ النبی آج بھی منفرد ہے۔ اس کے دوسری زبانوں میں بھی ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا دوسرا بے مثال کارنامہ سیرت ہی کے موضوع پر "خطبات مدراس" ہے اس سے زیادہ محققانہ اور عالمانہ خطبے اس موضوع پر شاید ہی کبھی دیے گئے ہوں۔ اسی طرح ان کی تصانیف ارض القرآن (دو حصے) سیرۃ عائشہ، حیات مالک، خیام، حیات شبلی، وغیرہ ہیں۔ خیام پر انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر آج تک ایک سطر کا اضافہ بھی نہیں کیا جا سکا۔

انھوں نے کامل تیس سال تک رسالہ معارف (اعظم گڑھ) کو بڑے سلیقے سے ایڈٹ کیا اور اسے اردو کا سب سے زیادہ باوقار علمی رسالہ بنا دیا تھا۔

۱۹۸۴ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کی ولادت کو سو سال پورے ہو رہے تھے۔ آج سے دو سال قبل میں نے اپنے محترم دوست پروفیسر عبدالقوی دسنوی (صدر شعبۂ اردو سیفیہ ڈگری کالج بھوپال) کو اس طرف متوجہ کیا تھا کہ سید صاحب کے صد سالہ یوم ولادت کی تقریبات ان کے علمی مرتبے کے شایانِ شان منائی جائیں۔ اور مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے یہ تجویز بدل و جان سے عمل کیا۔ ان کی کوشش سے بہار اردو اکیڈمی نے یکم دسمبر سے ۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء تک پٹنہ میں ایک کل ہند سیمینار کا اہتمام کیا جسے جناب سید شہاب الدین دسنوی نے ہر اعتبار سے کامیاب بنایا۔ عبدالقوی دسنوی صاحب علمی تحقیق کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں بنیادی ضروری کاموں کی اہمیت سے بے خبر نہیں ہیں۔ انھوں نے غالب، اقبال، ابوالکلام، میر انیس اور پریم چند وغیرہ کے اشاریے بھی اس لیے بڑی ہنرمندی سے مرتب کیے ہیں تاکہ علمی کام کرنے والوں کی مشکل آسان ہو۔ اس صدی تقریبات کے موقع انھوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کے متعلق بھی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کا ایک جامع اشاریہ یادگار سلیمان ندوی کے نام سے ترتیب دیا ہے جس میں بعض اہم نادر اور غیر مطبوعہ تحریریں اور تصویریں بھی شامل ہیں اس میں پنڈت موتی لال نہرو کا ایک اردو خط علامہ سید سلیمان ندوی کے نام خاصے کی چیز ہے۔ یادگار سلیمان کی کتابت و طباعت اعلا درجے کی ہے کاغذ بھی نفیس ہے۔ قیمت مناسب بلکہ اس کی اہمیت کے مقابلے میں نہ ہونے کی برابر ہے۔ عبدالقوی دسنوی صاحب کے اس کارنامے کی بدولت اب سید سلیمان ندوی پر علمی تحقیق کا کام کرنے والوں کو ادھر ادھر بھٹکنا نہیں پڑے گا اور سارے مواد کا اتا پتا ایک ہی کتاب میں مل جائے گا۔

اس علمی خدمت کے لیے جناب عبدالقوی دسنوی اور بہار اردو اکیڈمی دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ اسے نمونہ بنا کر دوسرے مصنفوں کے بارے میں بھی اس طرح کے اشاریے مرتب کیے جاتے رہیں گے۔ (نثار احمد فاروقی)

اقبال اور قرآن

مصنف: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

قیمت: ۹۰ روپے

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں پاکستان کے برگزیدہ عالم اور بزرگ مصنف ہیں۔ ان کے تبحر علمی کو دیکھ کر مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی اور مولانا حالی جیسی عظیم المرتبت ہستیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ موصوف عربی و فارسی کے زبردست عالم ہیں۔ مذہب اسلام اور قرآن کریم کے مطالعے سے انھیں گہرا شغف ہے۔ ڈاکٹر اقبال بھی قرآن شریف سے ایک جذباتی اور ذہنی تعلق رکھتے تھے۔ ذوق و شوق کی اسی یک جہتی نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور ڈاکٹر اقبال کو قریب کر دیا ہے "اقبال اور قرآن" اسی قربت کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں کی قلمی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ میدانِ ادب میں تحقیق وتنقید کے علاوہ تاریخ ولغات وغیرہ بھی ان کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ فارسی پر اردو کا اثر، فارسی کے قدیم شعراء، اردو سندھی لغت، ادبی جائزے، علمی نقوش، تحقیقی جائزے اور حالی کا ذہنی ارتقا ان کی چند منتخب تصنیفات ہیں۔ ان کے علاوہ مذہبیات کے موضوع پر وقیع کتابیں موجود ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کئی زبانوں پر قادر ہونے کے باوصف اردو سیدھی سادی سلیس اور صاف لکھتے ہیں۔ جو بات کہنی ہو۔ شائستہ متوازن اور سلجھے ہوئے پیرایے میں کہتے ہیں۔ بحث کا طریقہ سنجیدہ اور مدلل ہے۔ اخلاق ومتانت کا دامن کسی لمحہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ تحریر میں شائستگی، صداقت اور خلوص ان کی ذات وصفات کے آئینہ دار ہیں۔ موضوع کوئی بھی ہو۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ تحریر کسی مذہبی شخصیت کی نوکِ قلم کا عکس ہے۔

اقبال اور قرآن ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں کی بہترین کاوش ہے۔ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کو" ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے پروقار اور معیاری انداز میں اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے بارے میں ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انھیں قرآن کریم سے والہانہ عشق تھا اور کتاب الٰہی ہمیشہ ان کے مطالعے میں رہا کرتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ قرآن شریف پڑھتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ قرآن کریم کا یہی تاثر ان کے کلام میں اثر پذیری کے جوہر دکھاتا ہے۔

"اقبال اور قرآن" میں ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں نے ایک طویل مقالہ سپردِ قلم کیا ہے جس میں اقبال کا قرآن سے عشق اور قرآنی اسرار ورموز کو قالب شعر میں ڈھالنے کی خواہش پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد اقبال کے اشعار کا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اس طرح تجزیہ کیا ہے کہ قرآن کریم کی آیت بحوالہ سورت معہ ترجمہ نقل کی ہے۔ پھر اسی مفہوم میں اقبال کا شعر یا اشعار درج کیے گئے ہیں اس طرح یہ ثابت کیا ہے کہ کلام اقبال اپنی تمام تر شعری خصوصیات اور فنی لوازمات کی پاسداری کے ساتھ کلام اللہ کی تشریح وتفسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار خلوص، صداقت اور تاثیر کا سرچشمہ ہیں۔ تحقیق وتجزیہ کی یہ کاوش ادبیات اقبال میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس لحاظ سے ادب کے ہر طالب علم بالخصوص اقبال اور مذہب سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کے مطالعے میں رہنے کی مستحق ہے۔

(خالد محمود)

نوابِ صدیق حسن خاں

مصنف وناشر: ڈاکٹر رضیہ حامد،
قیمت: ۶۵ روپے ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی

اردو زبان کی خاموش خدمت کرنے والی خواتین میں ڈاکٹر رضیہ حامد کا نام اب زیادہ عرصے تک چھپایا نہیں جاسکے گا۔ پچھلے دنوں مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے ان کے افسانوں کا مجموعہ "خالی خالی دامن" شائع کیا۔ اسی کے ساتھ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اترپردیش کے مالی تعاون سے زیر نظر کتاب کی اشاعت عمل میں آئی اور اب "معاون حج" تیار ہے۔ تضاد کی حد تک مختلف موضوعات سے ان کے شوق اور مطالعہ کی ہمہ جہتی کا اندازہ ہوتا ہے لیکن ہمیں ان کی دوسری کتابوں سے اس تبصرہ میں کچھ نہیں لینا

فی الحال ہماری بحث کا موضوع نواب صدیق حسن خاں ہیں۔

نواب صدیق خاں ایک عالم بے بدل تھے۔ عربی ادب میں ان کی فتوحات لامحدود ہیں۔ عربی زبان کے بہت سے ممالک میں آج بھی ان کی تصنیفات جامعات کے درس میں شامل ہیں۔ اہل عرب ان کی ادبی صلاحیتوں اور علمی لیاقتوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپال کی علم دوست رئیسہ نواب شاہجہاں بیگم کی نظر انتخاب کی بدولت ان کے شوہر اور شوہر ہونے کی وجہ سے نواب کے لقب سے ملقب ہوتے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے جو خود بھی بھوپال کے ایک اعلا خانوادہ سے تعلق رکھتی ہیں نواب صدیق حسن خاں پر تحقیقی کام کیا ہے جس پر انھیں بھوپال یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی اس کے بعد یہ تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے جو ان کی عرق ریزی اور شب و روز کی مسلسل کاوش کا بہترین ثمرہ ہے۔ ایک تو کتاب کا نام بذاتِ خود طالبانِ علم کے لیے اپنے اندر بہت زیادہ کشش رکھتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس کا مقدمہ اتنی ہی زبردست شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے۔ اس طرح یہ کتاب دوآتشہ ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے اس کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب تاریخی پس منظر سے متعلق ہے۔ جس میں تحریک ولی اللہی سے تفصیلی بحث کی گئی ہے، دوسرے باب میں نواب صاحب کا سلسلہ نسب اور خاندان کا ذکر ہے۔ تیسرا حالات زندگی اور حلیہ و اخلاق کو محیط ہے۔ چوتھے باب میں نواب صدیق حسن خاں کے عہد سے قبل اور دوران قیام بھوپال کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں دینی و علمی ترجیحات پر مشتمل ہے۔ چھٹے باب میں نواب صاحب کی تصنیفات سے بحث کی گئی ہے جن کی تعداد رام بابو سکسینہ کے مطابق ڈیڑھ سو سے زائد ہے اور جو موضوعات کے اعتبار سے: تاریخ، سوانح، فیافہ کیمیا، سیاسیات، ریاضی، ہیئت، تاریخ العلوم، لغت اور علم بدیع وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی کتابیں شامل ہیں مگر اکثریت عربی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کی ہے۔ ساتواں باب علمی، ادبی اور سیاسی رجحانات کا احاطہ کرتا ہے۔ آٹھویں باب میں نواب صاحب کی سیاسی، سماجی اور علمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور نویں باب میں ان بلند پایہ اشخاص کا ذکر خیر ہے جو نواب صاحب سے تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔ آخر میں ضمیمہ کے طور پر نواب صاحب کا حسب نسب، کتابوں کی فہرست نوابین بھوپال کے شجرے اور کتابیات کی فہرست ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک ایسی تصنیف ہے جسے آئندہ نسلیں علمی کام کرتے وقت ضرور یاد رکھیں گی۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے بجا طور پر اس کتاب کو اپنے پہلے انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔

(خالد محمود)

وضاحتی کتابیات
(جلد دوم)

مرتبین: گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی
ناشر: ترقی اردو بیورو، آر کے پورم، نئی دہلی
قیمت: ۳۴ روپے

ترقی اردو بورڈ کے تعاون سے وضاحتی کتابیات کی پہلی جلد بہت پہلے سامنے آئی تھی جو ۱۹۷۶ء سے

متعلق تھی۔ اس دوسری جلد کا تعلق ۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۸ء کے دوران شائع ہونے والی کتابوں سے ہے کل ملا کر تقریباً ساڑھے گیارہ سو کتابوں کا احوال ۷ اشقوں میں موجود ہے۔

ایک ایسے علمی اور تعلیمی معاشرے میں، جہاں باضابطگی کے ساتھ کام کرنے کا چلن بہت عام نہ ہو۔ وضاحتی کتابیات کی اشاعت نہایت مستحسن ہے۔ کن موضوعات پر کن لکھنے والوں کی کتابیں، کہاں کہاں سے چھپیں۔ ان کا مختصر کیا ہے۔ یہ ساری اطلاعات ایک ساتھ ہمیں مل جاتی ہیں۔ مرتبین نے کتابوں اور مصنفین کے اشاریے۔ نیز مقدمے کے طور پر مجموعی صورتِ حال کے ایک جائزے کی شمولیت سے اس کتاب کو اور زیادہ کارآمد بنا دیا ہے۔

مرتبین کی محنت اور سلیقے کو سراہا جانا چاہیے۔ حوالے کی ایک کتاب کے طور پر وضاحتی کتابیات کی افادیت ہمیشہ قائم رہے گی۔ (شمیم حنفی)

نذیر احمد کی ناول نگاری

مصنف : اعجاز علی ارشد
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
قیمت : تیس روپے

اعجاز علی ارشد صاحب ایک طویل عرصے سے تحقیقی و تنقیدی کاموں میں مشغول ہیں اور ان کی کئی کتابیں اب تک منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ان کی تازہ ترین تنقیدی کاوش "نذیر احمد کی ناول نگاری" ہے جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں "پہلی بات" کے عنوان سے کتاب کی اہمیت اور نوعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور آخر میں "آخری بات" کے تحت کتاب میں پیش کردہ تمام امور کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

پہلا باب ناول کے فن اور اس کے ارتقا سے متعلق ہے۔ اس میں ناول کے مختلف عناصرِ ترکیبی اور ناول میں تکنیک کے تجربوں کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب میں ناول نگاری کی روایت کا بھی مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرا باب نذیر احمد کی شخصیت اور زندگی پر مشتمل ہے جس میں غیر معمولی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں جسے اس کتاب کا دل سمجھنا چاہیے۔ نذیر احمد کے تمام ناولوں کا تفصیلی فنی جائزہ لیا گیا ہے۔ ناول میں کردار نگاری، تعمیر ماجرا، مکالمہ نگاری اور مقصد کی پیش کش وغیرہ کے حوالے سے نذیر احمد کے ہر ناول کا الگ الگ مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہاں مصنف کا اندازِ بیان، منطقی اور استدلالی ہے اور نذیر احمد کے ناولوں کے سلسلے میں جو نیک و بد آرا اب تک سامنے آئی ہیں۔ ان سب سے بحث کرتے ہوئے بالآخر ایک نتیجے پر پہنچنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں نذیر احمد کے نقطۂ نظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے عہد اور ماحول کے رجحانات نے انھیں کس طرح متاثر کیا۔ اپنے زمانے کی مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی تحریکوں نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں کس طرح حصہ لیا اور شخصیت کے واسطے سے یہ اثرات ان کے فن پر کس طرح پڑے۔ یہ سارے امور بے حد مختصر مگر مدلل انداز میں زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔

پانچواں باب نذیر احمد کے اسلوب سے متعلق ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے انگریزی کے مشہور جملے "اسلوب ہی شخصیت ہے" کے حوالے سے نذیر احمد کے اسلوب پر ان کی منفرد اور ممتاز شخصیت کے اثرات تلاش کیے ہیں اور آخر کار یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نذیر احمد کا اسلوب ان کی شخصیت کا عکاس ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب نذیر احمد کی ناول نگاری کے بعض نئے گوشوں کو روشنی میں لاتی ہے اس کا انداز بیان ایسا ہے کہ طلبہ و طالبات بھی اس سے خاطر خواہ طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔ کتابت و طباعت بہت اچھی سرورق دیدہ زیب، کاغذ نفیس اور قیمت ضخامت کے اعتبار سے کم ہے۔ (اسمٰعیل حسنین نقوی)

زبان، اسلوب اور اسلوبیات

مصنف و ناشر: ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی ۲۵
قیمت: ۳۰ روپے

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کی قابلِ مطالعہ تصنیف "زبان، اسلوب اور اسلوبیات" علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مالی اشتراک سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

"لسانیات" جدید علم ہے۔ امریکی ماہر لسانیات لینارڈ بلوم فیلڈ نے ۱۹۳۳ء میں اپنی تصنیف شائع کی۔ اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ جدید ساختی لسانیات کا آغاز اسی سے وابستہ سمجھنا چاہیے۔

اسلوب اور اسلوبیات ایسی اصطلاحیں ہیں جن کی تعریف ادب اور لسانیات میں بڑی دلچسپ متنوع اور چیستانی انداز میں ملتی ہے۔ ظاہر ہے اس دور میں آرائشِ خم کاکل اور اندیشہ ہائے دور و دراز کا کس کو دماغ!

مرزا خلیل بیگ نے اسلوبیات کو اطلاقی لسانیات کی ایک شاخ بتایا ہے اور اس باب میں دو مضامین بھی رقم کیے ہیں۔

(۱) اختر انصاری کی طویل نظم "وقت کی بانہوں میں"
(ایک اسلوبیاتی مطالعہ)

(۲) فیض کی شعری اسلوبیات

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے "وقت کی بانہوں میں" دو طرح کے بند حوالے میں پیش کیے ہیں۔

(۱) وہ بند جن کے قوافی اور ردیفیں مصوتوں پر ختم ہوتے ہیں اور جن کے آخری ارکان آزاد یا کھلے ہوئے ہیں۔

(ب) ایسے بند جن کے قافیے اور ردیفیں مصمتوں پر مشتمل ہیں اور آخری ارکان پابند ہیں۔

تجزیہ کا حاصل یہ ہے کہ (۱) کے ذیل میں آنے والے بند محاسنِ شعری سے بھرپور ہیں اور (ب) کی صف کے بند نسبتاً کمزور ہیں۔ نظم میں ۴۷ بند ہیں۔ ۳۹ بند کے قوافی مصوتوں پر ختم ہوتے ہیں اور ۸ بند کے قوافی مصمتوں پر مشتمل ہیں۔

"فیض کی شعری اسلوبیات" کی پرکھ غزلوں کے اشعار سے کی گئی ہے۔ قواعدی ربط یعنی ضمیر

فعل، حرف وغیرہ کا ربط Linkage تلاش کیا ہے۔ لغوی ربط میں "تکرار" پر توجہ مبذول رہی ہے اس میں ضمیر، فعل، تمیز، حرف وغیرہ کی تکرار شامل ہے اس سے کلام میں زور، تاکید اور شدت اظہار کو نمایاں کیا گیا ہے۔ آخر میں نفسیاتی ساخت کی توضیح کی گئی ہے۔ ہاں معنی کے علاوہ معنوی رشتوں، نحوی ساخت اور جملوں میں معنی کے تعامل Inter-action سے بحث کی گئی ہے۔ نفسیاتی ربط کی کھوج بعض معنوی رشتوں کے ذریعہ کی گئی ہے۔ مثلاً تضاد، تناسب، تصریف واشتقاق وغیرہ۔

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کا بیان ہے کہ صنائع و بدائع کا تعلق شعر کی اندرونی تنظیم سے ہوتا ہے مگر شعر کے دونوں مصرعوں کے درمیان ارتباط باہمی کے پہلو اجاگر کرنے کا کام "علم لسانیات" کے اصول پر ہی ممکن ہے۔ "زبان، اسلوب اور اسلوبیات" قابلِ مطالعہ اور لائق مبارک باد تصنیف ہے (ڈاکٹر شفیقی پرکمی)

محمد اقبال

(ایک ادبی سوانح حیات)

مصنّف: جگن ناتھ آزاد
پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، نئی دہلی
قیمت: پچیس روپے

پچھلے چند برسوں میں اقبال اور ان کے فن پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی کم و بیش نو دس کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ان میں بچوں کا اقبال کو چھوڑ کر بقیہ تمام تصنیفات کا انداز اس تحقیقی نوعیت پر ہے۔ جس پر اقبالیات کے ماہرین اور اس خصوصی گوشے سے رغبت رکھنے والے اعلا تعلیم یافتہ اصحاب ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرف "بچوں کے اقبال" جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ نوعمر طلبہ کے لیے قلم بند کی گئی تھی۔ چنانچہ اقبال کے ایک عام اور اوسط قاری کے لیے تاحال ایسی کتاب کی ضرورت باقی تھی جس کے وسیلے سے اس عظیم المرتبت شاعر کی حیات اور کلام کے بارے میں سیدھی اور سچی معلومات حاصل ہو سکیں۔ جگن ناتھ آزاد کی پیشِ نظر تصنیف اس اہم ضرورت کو مکمل طور پر پورا کرتی ہے۔ گاڑھے تحقیقی مباحث سے گریز کرتے ہوئے پروفیسر آزاد نے کتاب کے پہلے حصے میں اقبال کے خاندان، ان کی ولادت، بچپن اور تعلیم و تربیت پر مختلف مراحل سے متعلق آگاہی فراہم کی ہے۔ دوسرے حصے میں ابتدائی دور میں اقبال کے قیام لاہور، وہاں گورنمنٹ کالج سے ان کی وابستگی، اور ایسے ہی دیگر امور کا بیان شامل ہے نیز "نالۂ یتیم" سے لے "التجائے مسافر" تک شاعر کی تخلیقات کے بارے میں عام فہم انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں علامہ اقبال کی زندگی کے تین برسوں کی مصروفیات اور علمی فتوحات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب وہ یورپ میں زیرِ تعلیم تھے۔ چوتھا حصہ اقبال کی مصروف زندگی کے ان بیس سالوں کا احاطہ کرتا ہے جو موصوف نے یورپ سے واپس آکر لاہور میں بسر کیے۔ اس اثنا میں ان کے تخلیقی سفر کے تمام نشیب و فراز بھی روشنی میں لائے گئے۔ کتاب کا پانچواں حصہ علامہ اقبال کے آخری آٹھ برسوں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ جب وہ سیاست کے میدان میں آچکے تھے۔ اسی باب میں ان کا سفر افغانستان نیز علالت اور انتقال کی تفصیلات بھی آگئی ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب ایک اوسط تعلیم یافتہ قاری کے لیے اقبال کے بارے میں زیادہ سے زیادہ ایسی معلومات فراہم کرتی ہے جس سے لاعلم رہ کر اقبال کی شاعری اور ان کے پیغام کو سمجھنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

(مظفر حنفی)

فن تاریخ گوئی

مصنف : رتن پنڈوروی

ناشر : دفتر ماہنامہ "شان ہند" نئی دہلی ۲۵

قیمت : پندرہ روپے

اس شک نہیں کہ فنِ تاریخ گوئی بڑا اہم فن ہے۔ لیکن تخرجہ و تعمیہ کا عمل اور ہمزہ کا ابجد ادریس میں اصلی مقام تعین کرنا دونوں توجہ طلب امور ہیں۔

"تاریخ گوئی" کا حسن اور صحت اسی میں ہے کہ مادّہ کو تخرجہ و تعمیہ کی دور از کار مشق سے بچایا جائے۔ دوسرے یہ کہ ہمزہ کو محض علامت سمجھا جائے۔ "فن تاریخ گوئی" کی قدیم کتابوں اور تاریخی قطعات میں قاری کو عجیب عجیب مثالیں ملیں گی۔ ان سب کو تسامحات کہ کر نظر انداز نہیں کر سکتے بلکہ ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است بڑھ کر خاموش رہنا چاہیے۔ لفظ "انفرادیت" غضب کی چیز ہے عجیب نشہ ہے۔ قدیم سے عہد حاضر تک اس کی کرشمہ سازیاں۔ معاذ اللہ!

خوشی اور فخر کی بات ہے کہ ایک صاحب نظر اٹھا اور اس نے "فن تاریخ گوئی" ایک بے نظیر، مستند اور جامع کتاب پیش کر دی۔ اس تصنیف سے رتن پنڈوروی کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ احترام سے درج ہوگا

اس تصنیف کی بعض خصوصیات ملاحظہ فرمائیے :

"ابجد" کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے۔ آٹھوں کلمات کے معنی مدار الافاضل اور رسالہ ضوابط عظیم سے اخذ کر کے درج کیے ہیں۔ تاریخ گوئی میں مکتوبی حروف کا اعتبار ہے۔ اسی لیے واو معدولہ سے بننے والے لفظ کے تمام حروف حساب ابجد میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ہمزہ کا مقام "حرف" نہیں۔ وہ علامت ہے۔ اس لیے بوئے گل، روئے یار میں ہمزہ ناقابل شمار رہے گا۔ اس ضمن میں ہمزہ کی تفصیلی بحث ہے اور ضروری مثالیں اور حوالے درج ہیں۔ صوری و معنوی تاریخ کی قسمیں، تعمیہ و تخرجہ میں کنایہ کی قسمیں۔ صنائع و بدائع کے سلسلے میں تقریباً بیس صفتوں کی تعریف اور مثالیں دی گئی ہیں۔ مثلاً صفت رعنا، صفت اوائل، صفت خالی، صفت زبر و بینات، صفت نادر اور صفت عجیب وغیرہ۔

رتن پنڈوروی مصنف "فن تاریخ گوئی" نے چالیس سے زیادہ تاریخی قطعات اپنے درج کیے ہیں۔ ہر تاریخ پورے مصرع سے نکلتی ہے۔ مہارت اور کمال کی داد ملنی چاہیے۔ فراق گورکھپوری، (اٹھ گیا اک شاہ اقلیم غزل ۱۹۸۲ء) مولانا ابر احسن گنوری (مرگیا جان ادب، شان سخن۔ ۱۳۹۳ ہجری) منور لکھنوی (حیف سونا ہوگیا باغ سخن)

رتن پنڈوروی اور سردر تونسوی دونوں حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی بدولت اردو کے ذخیرہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا۔ یہ کتاب کالج کے نصاب میں داخل کرنے کے لائق ہے۔ نہایت عمدہ چھپی ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

ذکر سیماب

مصنف : ضیا فتح آبادی
ناشر : سکریٹری "بزم سیماب" جے ۵/۱۴ راجوری گارڈن، نئی دہلی
قیمت : پندرہ روپے

"سیماب جشن صدی تقریبات کمیٹی" کی پیش کش "ذکر سیماب" ہے جس میں علامہ سیماب اکبرآبادی کا سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

اردو شاعری میں استادی شاگردی کی رسم بڑی پرانی ہے۔ اس میں عہد قدیم سے آج تک نتیجے کے اعتبار سے دو رنگ نمایاں رہے ہیں۔

۱۔ ذوقِ اکتساب اور جذبۂ احترام و عقیدت۔

۲۔ زعم خودسری اور سستی شہرت میں استاد سے بغاوت۔

ضیا فتح آبادی کو آپ پہلے رنگ میں تلاش کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد سیماب اکبرآبادی کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد وفاداری کا ثبوت دیا۔ علامہ کی اولاد کو بھائی کی طرح گلے لگایا۔ "ذکر سیماب" کی اشاعت میں وہی جذبہ کارفرما ہے۔

ضیا فتح آبادی نے پیش لفظ میں اپنے موقف کو واضح کر دیا ہے وہ متوازن ذہن کے مصنف ہیں۔ اس لیے اپنے استاد کے سوانحی خاکے میں غلو سے کام نہیں لیا ہے۔

سیماب اکبرآبادی نے اپنی خود نوشت شعر الحیات کلیم عجم میں درج کی ہے راز چاندپوری نے "داستانِ چند" میں صحت کے ساتھ واقعات بیان کیے ہیں بعض واقعات اور تاریخ کی صحت "روح مکاتیب" ہوتی ہے۔

ایک اہم بات مرزا داغ سے اصلاح لینے کی ہے۔ عموماً ۱۸۹۸ء مشہور ہے مگر دیگر ذرائع سے پتا چلا کہ چند برس یہ سلسلہ موقوف رہا اور مستقل طور پر اصلاح کا پروگرام ۱۹۰۱ء ۱۹۰۲ء سے شروع ہوا۔

سیماب بہ حیثیت نظم گو شاعر "کارِ امروز" کی اشاعت (۱۹۳۴ء) سے مشہور ہوئے دوسرے شعری مجموعے کلیم عجم ۱۹۳۶ء سازو آہنگ ۱۹۴۱ء عالم آشوب ۱۹۴۴ء صدر المنتہیٰ ۱۹۴۶ء شعر انقلاب ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آئے۔
ان کی تصانیف میں "رازِ عروض" ۱۹۲۳ء دستور الاصلاح ۱۹۴۰ء بڑی قابلِ قدر ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں قرآن کا منظوم ترجمہ مکمل کیا۔

اردو ادب کی ایک دلچسپ بات سنیے۔ مولوی فیروز الدین کی دعوت پر سیماب ۱۹۲۶ء میں اپنے تمام لشکر کے ساتھ لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ مثنوی مولانا روم کا اردو منظوم ترجمہ شروع کیا۔ پانچ دفتر کا ترجمہ مکمل کر دیا۔ ناشر مولوی فیروز الدین نے سیماب کو دو پیسے فی شعر معاوضہ دیا تھا۔ سیماب نے کام بند کر دیا چھٹے دفتر کا ترجمہ مولوی عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری نے کیا۔ مکمل ترجمہ پر نظر ثانی بھی کی اور پھر یہ ترجمہ "الہام منظوم" مولوی فیروز الدین کے نام سے شائع ہو گیا۔

۱۹۴۱ء میں سیماب اکبرآبادی نے ایک نظم "موحد اعظم" کہی تھی۔ ماہنامہ "شاعر" آگرہ میں شائع ہوئی۔ مفتی مہدی حسن (راندیر سورت) نے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ پھر کیا تھا ہر طرف شعلے۔ سیماب نے تیز و تند نظمیں اور کہیں۔ شائع کر دیں — رجعت پرستی کی گھن گرج ختم ہو گئی سیماب کے ۳۰۵ شاگردوں کی فہرست شامل ہے "یاد سیماب" کی خوبی یہ ہے کہ ضروری واقعات کے تاریخی حوالے درج ہیں ضیا فتح آبادی کا یہ کارنامہ توقیر کی چیز ہے
(ڈاکٹر سیفی پریمی)

شاعری

ذرّاتِ لہو

شاعر: نسیم میرٹھی
ناشر: بزمِ خلوص و ادب میرٹھ
قیمت: پندرہ روپے

نسیم میرٹھی کا پہلا شعری مجموعہ "ذرّاتِ لہو" شائع ہوا ہے۔ شاعر کو جمیل میرٹھی سے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ اسی لیے اپنے استاد کی تصویر آرٹ پیپر پر شائع کی ہے۔ ان کے چار شعر بھی تصویر کے ساتھ چھپے ہیں۔ جمیل میرٹھی ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے اور ۲۹ جون ۱۹۷۹ء کو وفات پائی۔ ان کے دو شعر سنیے:

اٹھا لیا جسے جب چاہا بزمِ دنیا سے　　　قضا تو واقفِ آدابِ انجمن بھی نہیں
فریب کھانے سے اتنا تو ہو گیا حاصل　　　کہ تجربے کی ضرورت ہے دوستی کے لیے

نسیم میرٹھی کی شاعری اور زندگی کے بارے میں ثروت میرٹھی، حفیظ میرٹھی، ایس ممنون علی جرنلسٹ ایم اے، الیف آر قریشی جرنلسٹ ایم اے، نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

حیران کاشمیری نے 'میری نظر میں نسیم' کے تحت میرٹھ کے نامور اہلِ قلم کے ناموں میں مولانا سراج، مولانا شوکت، مولانا اسمٰعیل، مولانا ندرت، مولانا نور ہشیار میرٹھی، حکیم احمد رشید زیبا، کوثر قریشی، عبدالواحد فیض کاشمیری، جمیل میرٹھی، حکیم احمد رشید زیبا حنفی حزیں کی فہرست پیش کی ہے نسیم میرٹھی کے بارے میں لکھا ہے "آپ لحن داودی میں پڑھتے ہیں۔ زبان میں بڑے تیکھے شعر فرماتے ہیں"

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین نے "میرٹھ۔ ایک دبستان" بڑی زوردار سرخی قائم کی ہے لیکن مطالعے کے بعد قاری کو اتنی ہی مایوسی ہو گی۔ میرٹھ کے اس دبستان میں صہبائی، شگفتہ، غلام سحر عشق آبادی کے نام شامل ہیں۔ موجودہ شعرا میں ثروت میرٹھی اور نسیم میرٹھی! ـــــ حیرت ہے کہ "دبستان میرٹھ" میں قلق میرٹھی، اسماعیل میرٹھی، انسر میرٹھی وغیرہ باریابی کے اہل نہیں رہے۔

سچ پوچھیے تو "ذراتِ لہو" میں نسیم میرٹھی کی شاعری کی پہچان صرف ڈاکٹر بشیر بدر کی تحریر میں ملتی ہے۔ چند سطور پیش ہیں:

ص ۶ "نسیم میرٹھی کی غزلیں حسنِ بیان، لطیف احساس اور بھرپور نغمگی کا نمونہ ہیں حسن و عشق کے ذاتی احساسات ہوں یا عصر حاضر کے اجتماعی تجربات۔ وہ ہر موضوع کو غزل بنا کر، سجا کر اور سنوار کر پیش کرتے ہیں"

اس شعری مجموعے میں نسیم میرٹھی کی کئی تصویریں مشاعروں میں کلام سنانے کے مواقع کی چھپی ہیں لیکن ص ۸۴ کے بعد جو تصویر شائع ہوئی ہے وہ شاعر کی شخصیت کو نمایاں کرتی ہے۔

"ذراتِ لہو" میں وقتی نظمیں اور تاثراتی قطعات بھی شامل ہیں۔ شاعر کا اصل سرمایہ غزل ہے اس میں زندگی اور رومان کے ہلکے پھلکے تجربے ہیں، سیاسی اشارات بھی ملتے ہیں۔ زبان اور اسلوب میں صفائی ہے۔ سادگی ہے۔

(سیفی پریمی)

پدمنی

شاعر: شرر فتح پوری
ناشر: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز ۶۔ کرشن نگر دہلی
قیمت: تیس روپے

اردو شاعری میں شرر فتح پوری ایک روشن اور مانوس نام ہے۔ اردو کے شعری سرمائے میں اس شاعر نے قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ 'پدمنی' کی تخلیق اصل میں تمثیل نگاری کی معیاری اور موثر چیز ہے۔ 'پدمنی' ہندستان کا ایک تاریخی اور بلند نسوانی کردار ہے اس کو بے مثال بلکہ زندۂ جاوید کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ اردو کے شعرا نے اس کردار سے ایثار کی حرارت، وفا کا رنگ اور پاک دامنی کی چمک دمک کے تاثرات اور جذبے پائے ہیں۔ نظموں میں ان محاسن کا اظہار کیا ہے خصوصاً چکبست نے خونِ جگر اور فن کے امتزاج سے "پدمنی" کو شاہکار کا مرتبہ عطا کر دیا ہے۔

یہ کتاب ہریانہ ساہتیہ اکاڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔ شرر فتح پوری نے دیباچے میں لکھا ہے:

"اس تمثیل کی ہیئت کی بنیاد جذبہ ہے۔ جذبات کے کیف و کم کے لحاظ سے بحروں کا تغیر و تبدل عمل میں لایا گیا ہے۔ ایک نئی کاوش اور نیا تجربہ ہے۔"

'پدمنی' کے پیش گفتار میں نامور شاعر اور ادیب نوبہار صابر نے بیان کیا ہے "عہد قدیم میں مثنوی کے لیے سات بحریں مخصوص تھیں اور عموماً مثنوی میں کوئی ایک بحر استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن شرر نے مطالب اور جذبات کی بوقلمونی اور گوناگونی کو مستحکم بنانے کے لیے قدم قدم پر نئی بحروں کا استعمال کیا ہے کئی جگہ تو ایک جھٹکے کے ساتھ دفعتاً بحر تبدیل ہو جاتی ہے"۔۔۔ نوبہار صابر نے اعلا جذبات نگاری، مکالمہ نگاری اور ڈرامائی عناصر کے لحاظ سے "پدمنی" کو جدید اردو کی ترقی یافتہ اور جلیل القدر ادبی دستاویز بتایا ہے۔

اس مثنوی میں چھ باب ہیں (کھنڈر، قلعہ، محل، محاصرہ، جنگ، جوہر)۔

باب دوم قلعہ (آواز)

یہ چتوڑ کی خاک لالہ کفن — لہو رخ، لہو تن، لہو پیرہن
لہو کی تب و تاب و سوز و گداز — لہو زندگی کے لیے برگ و ساز
لہو سبزۂ تر میں حسن نمود — لہو رونقِ خاکدانِ وجود
لہو کی ہر اک بوند موجِ حیات — لہو سے ہی رنگینیِ کائنات

باب سوم محل (راجا)

دودھیا رات اس بدن کی طرح — پھول کی سیج پر کرن کی طرح
رنگ رخسار و لب، قد و گیسو — لالہ و سرو و یاسمن کی طرح
اس کے جلووں کی بزم آرائی — خلوتِ دل میں انجمن کی طرح
ہر ادا اک ادائے محبوبی — عشوہ و ناز و بانکپن کی طرح

ڈاکٹر جاوید وششٹ نے تقریظ میں کئی نکتے پیش کیے ہیں۔ اس مثنوی میں ۹ بحروں کی نشان دہی کی ہے۔ سات بار بحر رمل کا استعمال ہوا ہے۔ ہر باب کے کردار کی وضاحت کی ہے۔ رائے ملاحظہ فرمائیے۔

"پدمنی ہمارے شعری سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ یہ لطیف و نازک مگر شدید جذبات واحساسات کا فن کارانہ اظہار ہے۔ غرض وطن دوستی اور قربانی ہی اس رزمیہ تمثیل کا Climax ہے"۔

کتاب عمدہ چھپی ہے۔ سرورق پر جوہر کا سماں ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

آئینۂ جذبات

شاعر: شاد قادری لکرالوی
ملنے کا پتا: شاد قادری لکرالوی، محلہ سوتھ بدایوں (یوپی)
قیمت: پچیس روپے

شاد قادری لکرالوی کا شعری مجموعہ "آئینۂ جذبات" فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی اشتراک سے شائع ہوا ہے۔

"آئینۂ جذبات" کا تعارف پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے رقم فرمایا۔ اس شعری مجموعے میں غزلیں، نظمیں، قطعات اور ایک رباعی درج ہے۔ 'پاسبان حرم' طویل نظم ہے اس میں پختگی، روانی اور عقیدت کی چمک دمک ہے۔ پنڈت نہرو سے متعلق نظم میں شخصیت کے متعدد پہلو اجاگر ہیں۔ وطن دوستی کا عنصر ہے۔ بعض دیگر نظموں میں بلند آہنگی ہے اور قدرت بیان کا پتا چلتا ہے عزم انقلاب، اسی قبیل کی نظم ہے مگر اس کے مطلع میں لفظ "انتظام" کا محلِ استعمال نظر ثانی چاہتا ہے:

ص ۲۰۲ دل کو قیدِ فکر سے آزاد کر سکتا ہوں میں انتظام جبر واستبداد کر سکتا ہوں میں

یہاں "انہدام" کا محل تھا۔ انتظام کے معنی بندوبست، اہتمام، ترتیب اور باضابطگی کے ہیں۔

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کی رائے نہایت صائب ہے:

"شاد صاحب کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جو سادگی اور پرکاری کے اوصاف سے متصف کیے جا سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ہمارے خیال میں شاد صاحب کو دوسری اصناف کے مقابلے میں غزل سے زیادہ مناسبت ہے۔"

شاعر نے ماہر عروض سحاب سخن مولانا ابرا حسنی گنوری سے فیض اصلاح سخن پایا ہے اس لیے کلام میں عروض وبیان کے معائب تقریباً مفقود ہیں۔ اشعار سے ریاض کا سراغ ملتا ہے۔ ہر چند شاعر کا کلام کلاسیکی انداز کا ہے تیر سے لے کر نالۂ شب گیر تک سب کچھ ملتا ہے۔ مگر شاعر نے خارجی زندگی اور کائنات کے بعض موضوعات کو بوجہ احسن نظم کیا ہے اور ترسیل کا حق ادا کیا ہے۔ لیکن رموز حسن وعشق کی ترجمانی میں رفعت ہے۔ نفسیاتی نکات سامنے آتے ہیں۔ ایسے اشعار کا اسلوب نہایت نکھرا ہوا ہے اور لفظی پیکر شاعر کے خیال، جذبے، حسیت اور فکر کے معنوی رشتہ

سے ہم آہنگ ہیں۔ رجائیت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے "آئینہ جذبات" کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے :

نیاز و ناز کے پردے پڑے رہے اے دوست — ترے قریب تک آنے کا راستہ نہ ملا

تم اپنے ساتھ لائے تھے اجالا — تمھارے ساتھ اجالا جا رہا ہے

تم نے دامن کیا کھینچا — اور بھی نکھرا رنگِ طلب

تم نہ آؤ تو دھڑکنیں دل کی — پاؤں کی آہٹوں کا کام کریں

دیکھیے جب اوراق پریشاں — سب میرے افسانے نکلے

قریب آ کر مرے تم کیا کرو گے — کہ تم سے درد کا رشتہ بہت ہے

ص ۱۰۳ — اہلِ کرم کا شیوہ اک رنگ دیکھنا — یعنی نظر وسیع تو دل تنگ دیکھنا

(ایک رنگ) کی جگہ "یک رنگ" ہونا چاہیے۔ اس سہو کو تصحیف کتابت بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر مصرع ثانی میں (نظر وسیع تو) تنافر لفظی کی حد میں داخل ہے۔

ص ۷۲ پردۂ ناز و نیاز اے شادؔ اٹھنا چاہیے — حسن میں اور عشق میں کوئی حدِ فاصل نہ ہو

"اور" یہاں حرفِ عطف کی صورت میں آیا ہے اس لیے حسن کے بعد (میں) حشوِ قبیح کا درجہ رکھتا ہے۔

شعری مجموعے کا 'پیش لفظ' طیب بخش قادری بدایونی اور 'دیباچہ' شمس بدایونی نے لکھا ہے عزیز وارثی نے دادِ تحسین دی ہے۔

شادؔ قادری گکرالوی کا شعری مجموعہ لطافت، سنجیدگی، خلوص اور فنی معیار کا نمونہ ہے۔ "آئینۂ جذبات" کے خالق کو مبارکباد ملنی چاہیے۔

کتاب عمدہ چھپی ہے۔ سرورق صوفیانہ اور پسندیدہ ہے۔

شاعر کی تصویر آرٹ پیپر پر آراستہ ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

نیم تراشیدہ صنم

شاعر: جاوید اکرم

ملنے کا پتا: می ناکشی پرکاش ۱۶۰/۱ سول لائنز فتح گڑھ (یوپی)

قیمت: پندرہ روپے

جاوید اکرم کا شعری مجموعہ "نیم تراشیدہ صنم" فخرالدین علی احمد میموریل اردو کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ اس میں غزلیں اور قطعے شامل ہیں۔

قطعات میں ہلکے پھلکے رومانی اور روزگار کے نقوش ہیں۔ ایک قطعہ :

مفلسی یوں بدن کو چاٹے ہے
جیسے دیمک نئی کتابوں کو
ایک شوہر کی عارضی سروس
جیسے دلھن کے کچے خوابوں کو

اس شعری مجموعے میں غزلیں زیادہ ہیں۔ شہریار، شفیع اللہ خاں راز اٹاوی، بیکل اتساہی، زبیر نجمی امروہوی، لطافت علی خاں نشاط بیلی بھیتی اور راجندر بہادر موج فتح گڑھی نے شاعر کی غزلیہ شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان تمام اہلِ قلم نے شاعر کی غزلوں کو "روایت اور جدیدیت" کا امتزاج بتایا ہے۔ معلوم نہیں روایت سے کیا مراد ہے؟ ہیئت، موضوعات، لفظیات، لوازم شعری یا عروض و بیان کی پابندی! ص ۸۲، ۸۳ پر ایک غزل ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ فاعل، مفعول، فعل وغیرہ کی ترتیب و دشواری کو (در) سے دور کر دیا گیا ہے۔ مثلاً

برق، آتش، بگولے چمن در چمن
عید، ہولی، دوالی گلشن در گلشن
باڑھ، سوکھا، گرانی صحن در صحن
سوز، ماتم، کراہیں بھجن در بھجن
چاند سورج ستارے گہن در گہن

مگر یہاں صحن، گہن کے محل استعمال کو روایت سے منسوب کیا جائے یا جدیدیت سے؟ ص ۱۰۶، ۱۰۷ کی غزل حروف جار سے تخلیق کی گئی ہے مگر سہو یا معذوری سے آخر شعر میں فعل داخل ہو گیا ہے سنیے:

سہما سہما سا ہے عالم رنگ و بو

یہاں 'اک بادہ لگا کر غزل کی فضا کو شاداب رکھا جا سکتا تھا۔ ص ۹۲، ۹۳ کی غزل کا مطلع پیش ہے ساری غزل مترنم ہے۔ الفاظ کے آئینوں سے غزل مزین ہے۔ صرف و نحو کے قواعد کی کہیں ضرورت نہیں پڑی۔

آنگن آنگن شعلہ شعلہ، شکلیں شکلیں شبنم شبنم
دامن دامن، شعلہ شعلہ آنکھیں آنکھیں شبنم شبنم

ص ۱۹۲، ۱۹۳ پر ایک غزل میں اس فن کا اعجاز دیکھیے:

زندگی دشمنی دوستی قہقہے
دکھ بھری باہمی عارضی مصنوعی

ہمارے نزدیک شاعر کی ذہانت، جدت، آواز اور لہجے کی نئی پہچان اکثر غزلوں میں ملتی ہے اور راجندر بہادر موج کے اس قول کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

"جاوید اکرم کے طرزِ نگارش میں پرخلوص رچاؤ ہے۔ ان کے خیالات میں وہ دھیمی آنچ ہے جو دلوں میں حرارت، دماغوں میں وسعت اور نگاہوں میں بصارت پیدا کرتی ہے۔"

اس قبیل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔ ان میں سیاسی فراست، نفسیاتی نکات اور حسیت کے نقوش ہیں رجائیت کے عناصر ہیں۔

جتنا گہرا تری راتوں کا اندھیرا ہوگا غم نہ کر اتنا ہی رنگین سویرا ہوگا

جب بنا ہوگا کہیں پیکر سبیس تیرا | حسنِ فطرت نے بہت رنگ بکھیرا ہوگا
ہم پتھروں کے دل سے اگے پھول کی طرح | پانی میں جب ملے تو سکر کی طرح ملے
اجنبی شہر تھا، اجنبی لوگ تھے | ہاں مگر راستے ساتھ چلتے رہے
پہلے بھی کہیں تم سے ملاقات ہوئی ہے | چہرہ بھی شناسا ہے اسرار انداز وہی ہے
تم جو ہوتے ہو ہم سفر میرے | دھوپ بھی چاندنی سی لگتی ہے
پھر ملوں گا تمھیں تاریخ کے اوراق میں کل | اب مجھے وقت کے شعلوں میں گذر جانے دو

ایسی شاعری سے صنفِ غزل میں تابناک اضافے کی توقع ہے۔ "نیم تراشیدہ صنم" مبارک باد اور توجہ کا مقتضی ہے۔ کتاب عمدہ۔ سرورق رنگین اور فنکارانہ ہے۔
(ڈاکٹر سیفی پریمی)

باقیاتِ شہباز

مرتب: ڈاکٹر سید صابر حسن
ملنے کا پتا: تاج بکڈپو مین روڈ، رانچی
قیمت: پچیس روپے

سید محمد عبدالغفور کی پیدائش ضلع نالندہ (صوبہ بہار) میں ۱۸۵۷ء کو ہوئی۔ وہ معروف شاعر اور مشہور ادیب تھے۔ اودھ پنچ لکھنؤ، مخزن لاہور، اپلنچ پٹنہ، مشیر قیصر لکھنؤ وغیرہ میں ان کی تخلیقات چھپتی تھیں۔ ان کی تخلیقات میں رباعیات شہباز، خیالات شہباز اور تفریح القلوب شامل ہیں۔ زندگانی بے نظیر میں انھوں نے نظیر اکبرآبادی کے کلام کو نہایت خلوص سے پیش کیا ہے اور اس کی قدر و قیمت واضح کی ہے۔

ڈاکٹر سید صابر حسن نے پروفیسر عبدالغفور شہباز کا غیر مطبوعہ کلام تلاش کر کے "باقیات شہباز" کے نام سے شائع کیا ہے۔ بہار اردو اکاڈمی نے جزوی مالی تعاون سے مرتب کو نوازا ہے۔

"باقیاتِ شہباز" کی ابتدا "حمد" سے ہوتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

وہ ہے اک آپ روپ آپ آنے والا | کروڑوں روپ بھر دکھلانے والا
جلاتا ہے وہی سورج کا دیپک | وہی ہے ہر دیا اکسانے والا
اسی سے سب گگن کے ہیں یہ تارے | وہی ہے بجلیاں تڑپانے والا
اسی سے ہے اندھیرا اور اجالا | وہی ہے دونوں کا جھمکانے والا

ان اشعار سے ثابت ہے کہ اس دور میں عربی فارسی تراکیب کا چلن سہی مگر ہندی کی بولی بھی مقبول تھی۔ اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ لسانی عصبیت نے اہل علم کے ذہنوں میں راہ نہیں پائی تھی۔

نظموں میں مناظرۂ دین و دنیا۔ قرآن السعدین۔ رائل اسکول پر پیر جوگی نامہ وغیرہ خوب ہیں۔

شاعر نے نظیر اکبرآبادی اور اکبر الہ آبادی کی پیروی میں بھی دادِ سخن دی ہے۔ زیادہ

حصّہ نظم اکبر کے اسلوب کا نمائندہ ہے۔ انگریزی الفاظ بکثرت مستعمل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے مزاج میں ظرافت کا عنصر غالب ہے۔ اس رنگ کی نظمیں "تہذیب فیس" اور معنوبر کی سانگ وغیرہ ہیں۔

کنگ ہر مسٹر ہے ہر لیڈی کوئن — کنگ ڈم چھوٹا سا ہے ہر ہاؤس ہولڈ
کہہ رہی ہے ہولڈر کی یوں زبان — مٹنگ پر ہر فرد کو لازم ہے بولڈ

بعض مقامات پر ظرافت کی جگہ سوقیانہ پن آگیا ہے۔

ص ۹۷ - پر ایک ہجو درج ہے۔ اس کو شامل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اب غزل کے چند اشعار پیش ہیں:

دل نہیں ہے پہلو میں، ڈھونڈا ذرا، پایا — خیر تم نے دِل پایا، ہم نے دل ربا پایا
راہیں ہیں زندگی کی کیا اپنچ پیچ رکھتی — زلفوں میں یار کی بھی اتنے تو خم نہ ہوں گے
سلوک ان ناز والوں کا خدائی سے نرالا ہے — محبت کم نہیں سکتے عداوت کر نہیں سکتے
کھینچنی ہے اگر اس زلف مسلسل کی شبیہ — بال حوروں سے قلم کے لیے مانی مانگے
جو چومے گا آکر لبوں کو تبسم — تو چھا ئے گی اس زلف سے رات گھری

وہاب اشرفی نے کلامِ شہباز کا تجزیہ کیا ہے اور صائب نتائج اخذ کیے ہیں۔

"ان کی نظموں میں تیکھا پن مفقود ہے... نظموں میں وہ ابہام اور پیچیدگی نہیں جو آج کی نظموں کا مزاج بناتی ہے... نہ ہی وہ رمزیت اور اشاریت ہے جو نئی نظموں کی روش ہے... ان کا کلام مزاحیہ سے زیادہ ظریفانہ ہے۔"

ڈاکٹر سید عابد حسن نے گم شدہ اوراق کو محفوظ کر دیا ہے۔ ان سے اہلِ قلم کبھی نہ کبھی فیض پا سکتے ہیں۔

کتاب معقول طریقے سے چھپی ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

اردو گلدستہ

مرتب: انور حسین انور
قیمت: ۵ روپے
ملنے کا پتا: عقب مسجد گڑھی، بیرسیہ (بھوپال)

گل دستے شائع کرنے کی روایت قدیمی ہے۔ انور حسین انور نے "اردو گلدستہ" شائع کیا ہے اس میں بیرسیہ (بھوپال) کے مستقل اور عارضی ساکن شاعروں کا انتخاب کلام شامل ہے۔ شاعر کا نام تخلص اور اور دو تین باتیں شاعر کی لیاقت اور روزگار کے بارے میں درج ہیں۔ حسبِ ذیل شعراء شامل ہیں۔

عتیق احمد اثر۔ منظور علی عاقب۔ مقبول احمد مقبول۔ سحر رائے پوری۔ سلطان بیگ سلطان گردھر گوپال شیدا۔ درگا پرساد نشتر۔ محمد یحییٰ نسیم۔ علی احمد بشر۔ نفیس احمد سحر۔ عبدالرزاق عیشی سراج احمد رونق۔ انور حسین انور۔ مسعود اختر ناروی۔ عبدالمجید سالک۔ محمد ادریس ادریس۔ عبدالمجید شرر۔ نریندر کمار وکیل۔ اشرف علی اشرف۔ محمد یوسف راغب۔ شاہد انصاری۔ احمد علی احمد بشارت علی شبنم۔

"گلدستہ" کے شروع میں محمد رفیق بیربیہ کی بزم ادب کے صدر کا نہایت مختصر تعارف ہے۔ اشفاق البنی کا ذکر کافی طور پر کیا گیا ہے۔ ان کی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اردو سے انگریزی میں اچھا ترجمہ کر لیتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔

انور حسین انور نے "اردو ادب ایک سرسری جائزہ" پیش کیا ہے۔ اس میں نہایت مہمل گمراہ کن اور خطرناک بیانات شامل ہیں۔ ص ۱۶ "اب اسلامی ادب"۔ تعمیری ادب کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔"

ص ۱۴۔ "چکبست نے رامائن کا سین پیش کیا ہے"، ص ۱۵۔ "دیاشنکر نسیم، چکبست، نانک، چودھری دتو رام کوثری، تلوک چند محروم، پنڈت بال مکند عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور رگھوبیر سرن دواکر راہی وغیرہ شعرا کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کا شمار اسلامی ادب میں کیا جا سکتا ہے۔"

ص ۱۱۔ "اردو ادب کی تاریخ میں ولی سے لے کر جگر تک تمام شعرا کے کلام میں اسلام کے تصور توحید، رسالت، آخرت اور اسلامی اقدار و افکار کی واضح جھلک ملتی ہے۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق اور سر تیج بہادر کی پوری عمر اس اعلان میں گزر گئی۔ (اردو زبان ہندو مسلمانوں کا مشترک سرمایہ ہے)

اردو زبان و ادب کی تاریخ۔ ناقدین و محققین اور نامور شعرا نے اردو ادب میں ہندستانی کلچر کی نشان دہی کی ہے اور عالمی قدر کی شمولیت کا اظہار کیا ہے۔

انور حسین انور کی تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ اردو زبان و ادب کی ساخت، تاریخ اور ارتقا سے وہ قطعی ناواقف ہیں۔ انھوں نے اسلام کے مبادیات کو پڑھا ہوگا۔ سمجھا نہیں ہے۔ مسلک تصوف اور وحدت و کثرت کے مسائل ان کے فہم سے باہر کی چیزیں ہیں۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر (اردو ادب) کو آپ اسلامی ادب کا نام دے کر اردو کی خدمت فرما رہے ہیں یا اسلام کی؟ یا حصول ثواب دارین!

جگر مرادآبادی صوفی شاعر نہیں تھے۔ ان کا مشرب یہ تھا۔

(خلد شیشے میں ہے فردوس ہے پیمانے میں)

"اردو گلدستہ" میں آپ نے ۲۳ شاعروں کی غزلیں درج کی ہیں۔ کیا یہی اسلامی ادب ہے؟ کیا آپ عربی ادب کو بھی اسلامی ادب سمجھتے ہیں۔ امراءالقیس، متنبی، مہل، ہل بن ربیعہ اور خلیل جبران کے بارے میں آپ کی ریسرچ کیا ہے؟

اب آپ اپنی غزلوں کے اشعار پڑھ لیجیے۔ اس اسلامی ادب یا تعمیری ادب سے روحانی توانائی عود کر آئے گی۔:

اس سراپا کی آہ رعنائی — یاد آئی تو قیامت آئی
جب سے دیکھی ہے اس کی انگڑائی — پھر تو جانِ حزیں پہ بن آئی
گھٹائیں چھائی ہیں تھوڑی سی آج مے پی لو — کبھی تو آپ ہمارا بھی کچھ کیا کرتے

نئے لکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ کسی مقامی اہلِ نظر سے استفادہ کر لیا کریں۔ بہر حال مُرتب نے ایک علاقے کے شعرا کو متعارف کرایا۔ ان کا کلام قارئین تک پہنچایا۔ یہ سعی مسعود ہے۔ "گلدستہ" کا سرورق رنگین ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

شفق زار

شاعر: اوم کرشن راحت
ملنے کا پتا: ادبی سنگم ۱۵/۲ ا/اف فرید آباد (ٹاؤن شپ)
قیمت: پندرہ روپے

اوم کرشن راحت کا شعری مجموعہ "شفق زار" شائع ہوا۔ اتر پردیش اکاڈمی سے انعام ملا۔ اس میں غزلیں، قطعے، رباعیاں اور نظمیں شامل ہیں۔

راحت کا شعری ذوق ماضی کی خوش گوار یادوں سے وابستہ ہے۔ شاعر کے والد مہاراج کرشن اور اختر شیرانی کے گہرے تعلقات تھے۔ راحت پر اختر شیرانی کی شاعرانہ شخصیت کا اثر بارہ تیرہ برس کی عمر میں ہی مترتب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ساحر لدھیانوی اور راحت ہم مکتب رہے تھے۔ یہ صحبت زیادہ اثر انداز ہوئی۔ آخری نقش خموش سرحدی نے مرتسم کیا "من آنم کہ من دانم" میں راحت نے اعتراف کیا ہے:-

ص ۷۔ "جناب خموش سرحدی صاحب نے حوصلہ افزائی اور باہمی گفت وشنید میں شاعرانہ رموز جو مجھ پر کبھی روشن نہ تھے اور اصول جن کو میری راہ روی نے کبھی روا نہ رکھا تھا اُن کے سمجھانے اور ان کی ضرورت کو محسوس کروانے میں ان کا بہت دخل ہے۔"

راحت کی نظموں پر اختر شیرانی اور ساحر لدھیانوی کے آہنگ و اسلوب کا اثر نہیں ہے۔ لیکن ذہن اور موضوع سے قربت نظر آتی ہے۔ شاعر کی نظم "حیات" قابلِ توجہ ہے اس میں زماں و مکاں کی فضا اور روشن مستقبل کی بشارت قاری کو رجائی ذہن کی دعوت دیتی ہے۔ قطعوں میں عام راہ ملتی ہے۔ بعض رباعیوں میں روشنی ہے ان میں نفسیاتی نقطۂ نظر اور خارجی حقائق کا مشاہدہ نظر آتا ہے۔ راحت کا محبوب لفظ "مریم" ہے۔ اس کی معنوی تعبیر غزل اور رباعی میں کئی مقامات پر ملے گی۔ دو رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

آشاؤں بھری دھوپ کو ڈھل جانے دو
اس موم کی مریم کو پگھل جانے دو
پھر پڑ کھیں گے جذبات محبت راحت
لمحات جدائی کو نکل جانے دو

یہ کربِ نظرات کے ڈھلنے تک ہے
یہ لغزشِ پا۔ تیز نہ چلنے تک ہے
بے جان ہیں پتھر نہ پکاریں گے تجھے
گھر سے پرکشش، گھر سے نکلنے تک ہے

(تجھے) کی جگہ ہمیں یا انھیں رکھ دیا جاتا تو اجتماع ردیفین سے بچنا آسان تھا۔

شاعر کا جوہر غزلوں میں ملتا ہے۔ لیکن بعض الفاظ غزل کی فضا میں نظم کے در آئے ہیں جو محلِ نظر ہیں۔ وہ رمز و ایما کی زبان میں کھپ نہیں سکے ہیں۔ مثلاً بلونا' اکنا' بسارنا اور ہانپنا وغیرہ ان معمولی امور سے قطعِ نظر شاعر کی غزلیں محاسنِ شعری کی آئینہ دار ہیں۔ کیا اور کیسے کا خوبصورت اور معتبر جواب ملتا ہے۔

رشی پٹیالوی نے "شفق زار" کے پیش لفظ میں مناسب رائے دی ہے۔

"ان کی شاعری جمالیاتی اندازِ شعور اور مفکرانہ ضیائے بصیرت کی ملی جلی کیفیتوں کے حسین امتزاج کا مرقع ہے۔"

قارئین کو محسوس ہوگا کہ راحت کی غزلوں میں حقیقت، جسارت، ذہن پر خارجی مناظر کے اثرات، ذہنی ارتقا، ذوق و جستجو، تجربہ، روحانی حسیت وغیرہ کتنے جلوے فروزاں ہیں۔ تقدیر پرستی اور عمل و ردِ عمل کا جائزہ لینے سے اکثر افراد معذور ہیں۔ شاعر نے انھیں آگہی دی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

غم و الم کے تحائف جہاں سے لایا ہوں
خبر کرو مرے مولا کو میرے آنے کی

اکثر مجھے جگاتا یا شبِ ماہتاب نے
پچھلے پہر تو نیند عموماً اچٹ گئی

ہر نئی فکر میں پاتا ہوں میں ادراکِ حیات
کہ مرے ذہن کا در بند نہیں ہے یارو

جو تم نے پیار سے دیکھا تو یوں ہوا محسوس
کہ اپنے آپ کو ہم نے بھی آج دیکھا ہے

خدا مورد الزام جو کشتی ڈوب لے
پار ہو جائے تو سب شکرِ خدا کرتے ہیں

کتاب عمدہ چھپی ہے۔ شاعر کی تصویر بھی ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

آئینہ غزل

شاعر: منزل لوہاٹھیری
ملنے کا پتا: منزل دارالادب، لوہاٹھیر رمضان پور ضلع بدایوں
قیمت: آٹھ روپے

مولانا ابرا حسنی گنوری کا فیضانِ ادب ہندستان اور پاکستان کے ہر خطے میں پایا جاتا ہے۔ ضلع بدایوں بھی فیض یاب ہوا۔ منزل لوہاٹھیری اور ان کی تخلیق "آئینہ غزل" اسی کا ذرّہ ظہور سمجھیے۔ اس شعری مجموعے میں غزلیں، قطعے اور رباعیاں شامل ہیں۔ غزلوں کا رنگ و آہنگ

اس طرح ہے۔

ایک تصویر کے لیے منزل سونے سونے ہیں آئینہ خانے
محبت اور غم، دھوپ اور سائے ہمارے دم سے ہیں منزل بہ منزل
جو دن تم سے مانگ لیے تھے وہ دن ہم کو راس نہ آئے

کیوں تیرا من گھبرائے ہے کیوں تیرا دل دھڑکے ہے
ایک رنگیلی رت بھی ساتھی بعد ہر اک پت جھڑ کے ہے

''آئینہ غزل'' پر حسب ذیل حضرات نے اظہارِ خیال کیا ہے۔
ڈاکٹر بشیر بدر، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، عبداللہ ولی بخش قادری، راد عارمن جوش بدایونی، دیر بند ربرشاد سکسینہ بدایونی، مبشر علی صدیقی، ذکی تال گانوی۔

منزل لوہا ٹھیری نے اپنے حالات بھی لکھے ہیں اور ان ہی صفحات میں علمِ عروض اور محاسن و معائبِ سخن کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔
شاعر کی تصویر چھپی ہے۔ کتاب بھی عمدہ چھپی ہے:

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

سائبان

شاعر: نصرت گوالیاری
ناشر: باری برادران۔ ۴۳۰۵ کوچہ رحمان
چاندنی چوک دہلی ۱۱۰۰۰۶
قیمت: بیس روپے

نصرت گوالیاری نے راج دھانی میں رہ کر بھی اپنے خواب کو کثرتِ تعبیر سے بچالیا ہے۔ انھوں نے اپنی موزونیت طبع اور شعری صلاحیتوں کو ''صنف غزل'' کے لیے وقف رکھا، اور اسی کا ثمر شیریں ''سائبان'' میں محفوظ ہے۔ نصرت کی دوسری دور اندیشی بھی کام آئی۔ انھوں نے جناب عشرت کرتپوری سے عروض و بیان کے نکات سیکھ لیے۔

نصرت کے مجموعۂ غزلیات ''سائبان'' پر استاد کی دعا کے علاوہ ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر شریف احمد، اظہار اثر اور ڈاکٹر مغیث الدین فریدی کی رائیں چھپی ہیں۔
ڈاکٹر خلیق انجم نے خلوص، انصاف اور آگہی کی روشنی میں تعارفی اور تنقیدی مضمون سپردِ قلم فرمایا ہے۔ چند سطور ملاحظہ کیجیے:

''نصرت کا یہ مجموعہ کلام ہمارے عہد کی غزل گوئی کی نمایندگی کرتا ہے۔ یہ امتزاج ہے کلاسیکیت اور عصری آگہی کا۔ یہ مجموعۂ کلام ہمارے عہد کی غزل گوئی کا ایک قابلِ قدر نمونہ ہے۔''

اب چند شعر پیش ہیں:

ان کی بدلی ہوئی نظر بھی مجھے جانے کیوں مہرباں سی لگتی ہے

جب گزرتے ہیں وہ مقابل سے — دیر تک روشنی سی رہتی ہے
کہنے والا بھی جس کو بھول گیا — دل اسی ایک بات میں گم ہے
آج کیسے آئے تم — کوئی خاص بات ہے
تیری موجودگی میں بھی اکثر — دل نے کی ہے تری کمی محسوس
آپ کے بس میں ہو تو نصرت کو — شوق سے بھول جائیے صاحب

طویل بحروں میں بھی شاعر کا یہی اسلوب قائم ہے اور یہ یقیناً انفرادی خصوصیت ہے۔ مجموعے کا صوری حسن بھی نظر نواز ہے۔ شاعر کی تصویر آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔
(ڈاکٹر سیفی پریمی)

سخن جوہر

مرتب: اختر بستوی
ناشر: اتر پردیش اردو اکاڈمی۔ قیصر باغ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱۔
قیمت: چار روپے پچاس پیسے

مولانا محمد علی کا تخلص جوہر تھا۔ ان کے بڑے بھائی ذوالفقار علی نے گوہر تخلص اختیار کیا تھا۔ کسی نے دریافت کیا کہ آپ کے ایک اور بڑے بھائی شوکت علی ہیں۔ معروف سیاسی لیڈر، اس لیے "علی برادران" لکھا جاتا ہے وہ بھی شاعر ہوں گے۔ ان کا تخلص کیا ہے۔ مولانا محمد علی نے قافیہ تلاش کر کے برجستہ کہا۔ "شوہر"! یہ تو لطیفہ ہوا۔

ڈاکٹر اختر بستوی نے مولانا محمد علی جوہر کا کلام "سخن جوہر" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اردو اکاڈمی لکھنؤ نے اس کی اشاعت کی ہے۔ ڈاکٹر اختر بستوی نے اپنے مقدمے میں کلام جوہر کے دو دائرے قائم کیے ہیں۔ (۱) حب ملک (۲) عشق مذہب۔ ان دائروں میں جوہر کی شخصیت، جذبات و افکار اور عمل و ردعمل کی لہریں رقصاں ہیں۔ شاعر کا اسلوب کلاسکی ہے۔ شاعر کی نظر ہند سے باہر مسلم ممالک کی سیاست پر بھی مرکوز ہے۔ اسی لیے نظمیں وجود میں آئی ہیں۔ غزلوں میں بھی سیاسی اشارے اور روحانیت کی گرمی ہے۔

"علی گڑھ کالج" سے رخصت ہوتے وقت جو نظم کہی تھی اس کے تین شعر:

ہم جاتے ہیں اے کالج، پر یاد رہے اتنا
یاد آئے گی جب تیری، تو خون رلائے گا
سیکھی تھی محبت جو یاں آٹھ برس رہ کر
جوہر اسے کس طرح پھر دل سے بھلائے گا
کیا بادہ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
دانا رکھے آباد اں، ساقی تری محفل کو

ڈاکٹر محمود الٰہی نے "پیش لفظ" میں فرمایا ہے:

"جوہر کی شاعرانہ صلاحیتوں نے لازمی طور پر اپنے گردوپیش سے کسب نور کیا اور پھر مدرستہ العلوم علی گڑھ نے ان پر جلا کی۔ یہی بات ہے کہ ان کی شاعری میں جذبات کا تموّج اور خیالات کا بحرنا پیدا کنار ملے گا"

"سخن جوہر" کی ترتیب تاریخی اعتبار سے کی گئی ہے۔ بعض تاریخی واقعات اور شخصیات کی حاشیے میں اشارہ سازی کردی ہے۔ کلام جوہر کی مختلف اشاعتوں میں بعض مصاریع میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حاشیے میں ایسے مصاریع کو درج کر دیا ہے۔

محمد علی جوہر کی آخری مندرجہ غزل (عطا کردے، بپا کردے) کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

مجھ کو تم اس نگاہ سے دیکھو جو تمھیں درد آشنا کردے

اس مجموعۂ کلام کی سب سے اچھی غزل جس میں روانی، ترنم، تغزل اور صحیح معنوں میں غزل کی سج دھج ہے وہ ص ۶۸ پر درج ہے اور شروع ۱۹۱۲ء کی تخلیق ہے۔ پہلا مصرع ہے (تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں)

بیٹھا ہوا توبہ کی توخیر منا یا کر ٹلتی نہیں یوں جوہر اس دیس کی برساتیں

چند شعر:

عنبر کا خط ہے کہ دل ہے کسی دلدادہ کا
کچھ تو ہے تم نے جو مٹھی میں چھپا رکھا ہے

چاک مت کر جیب بے ایام گل کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

ہاں جنبش مژہ بھی گناہ عظیم ہے چپ چاپ دیکھتے رہو، جو کچھ دکھائے دوست

عشق ہی باعث تکوین جہاں ہے غافل تو نے جانا کہ یہ اک شغل ہے بے کاری کا

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی اشاعت کا منصوبہ کار مستحسن ہی سمجھا جائے گا مگر اس کی اشاعت میں مزید توجہ اور احتیاط درکار ہے۔ "سخن جوہر" میں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔

اردو اکاڈمی کا یہ سستا اڈیشن ہے۔ اردو پبلک کو اس موقع سے بہرہ اندوز ہونا چاہیے۔ سرورق معقول ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

شعلۂ احساس

شاعر: کرشن مراری
پبلشرز: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، جے ۱۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱
قیمت: ۲۶ روپے

"سازِ رگِ جاں" کو ابھی اردو شعری ادب کے شیدائی بھولے نہیں ہیں۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی کی فضا میں اس شعری تخلیق پر انعام پانے کا چرچا مناسب طور پر ہوتا رہا۔ خوشی کی بات

کتاب "شعلۂ احساس فروزاں ہے۔

کرشن مراری کی یہ دوسری آواز ہے۔ اس میں قارئین کو غزلوں کے ساتھ دوہڑے اور دوہے کی ہیئت سے واقفیت کا موقع ملے گا۔ اور ان کے رنگ و آہنگ سے دل کو نور اور ذہن کو سرور ملے گا۔ آزاد غزلیں مستزاد ہیں۔

پریم پال اشک نے درست کہا ہے:

"ان کی شاعری خالص ہندستانی تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتی ہے۔ کرشن مراری نے اپنے کلام میں شیرینی، موسیقی اور ترنم کو رچا بسا لیا ہے۔"

اب شاعر کے تغزل کا سحر آگیں ماحول آپ کی توجہ چاہتا ہے۔

سوچ کو مل گئی ایک منزل نئی — خواب دلکش سجانے لگی زندگی
ہم سفر کی طرح وہ چلا تھا مگر — راستے بھر رہا اجنبی اجنبی
ایک لمحے کو ٹھہری تھی چنچل نظر — رک گیا ایک چلتا ہوا راستہ
سکھ دکھ کے دو پھول کھلے — مہک نئی تھی مٹی کی

مراری کے دوہے کی فضا بھی دیکھیے:

شوخ علامت میں سجی فکر فکر کی دھوپ
اور بھی عریاں ہو گئے جیون کے کچھ روپ

مرمرسی انگڑائیاں غزلوں سا آہنگ
گرمی تیرے خیال کی ساجن رنگا رنگ

ہیئت اور تخیل کے تجربے کرشن مراری کو اور "شعلۂ احساس" کو عزیز تر بناتے ہیں۔ شعری مجموعہ خوب صورت چھپا ہے۔ شاعر کی تصویر موجود ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

کلام نیرنگ

شاعر: میر غلام بھیک نیرنگ
مرتب: ڈاکٹر معین الدین عقیل
ناشر: مکتبہ اسلوب، پوسٹ بکس ۲۱۱۹۔ کراچی -۱۸
قیمت: پچیس روپے

میر غلام بھیک نیرنگ کی شخصیت میں بڑی کشش تھی۔ ان کا ذکر چھڑتے ہی محمد علی جوہر، اقبال اور شیخ عبدالقادر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ہندستان کا تعلیمی اور سیاسی نقشہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

شاعر کی اصلی نام غلام محی الدین تھا۔ ایک صوفی بزرگ میراں بھیک کی عقیدت کے باعث میر غلام علی بھیک نام ہوا۔ طالب علمی کے زمانے میں متواج تخلص کرتے تھے۔ بعد میں "نیرنگ"

تخلص اختیار کیا۔ "کلامِ نیرنگ" ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اشاعت سوم ۱۹۸۳ء میں ہو سکی۔

میر نیرنگ کو علی گڑھ تحریک سے زندگی بھر دلچسپی رہی۔ وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی مجلس منتظمہ اور کورٹ کے ممبر رہے۔ ندوۃ العلما لکھنو کے رکن رہے۔ تحریک خلافت اور آل انڈیا نیشنل کانگریس سے وابستہ رہے۔ انبالہ کانگریس کمیٹی کے صدر چنے گئے۔ تعلیمی اور سیاسی سرگرمی کے باعث شاعری تقریباً ترک ہو گئی تھی۔

نیرنگ کے معاصرین میں اقبال اور نادرکاکوروی خصوصی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال نے کہا ہے:

نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم سفر   ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

ابتدائی مشق کے زمانے میں نیرنگ اور اقبال ایک دوسرے کو اپنے اشعار بھیجا کرتے تھے۔ نیرنگ کو اپنا ایک شعر یاد رہ گیا تھا۔

حرم کو جانا جناب زاہد یہ ساری ظاہر پرستیاں ہیں
میں اس کی رندی کو مانتا ہوں جو کام لے دیر سے حرم کا

شروع میں اقبال کے کلام پر زبان و بیان کی خامیوں کے باعث اعتراض ہوتے تھے اور میر نیرنگ کبھی "اقبالوی" کبھی "پنجابی" کے نام سے اقبال کی حمایت میں مضمون لکھا کرتے تھے۔

میر نیرنگ سیاسی میدان کے شہسوار تھے۔ ان کی دوستی نے اقبال کو سیاست کی جانب مائل کیا اور آخر میں اقبال کے اثر نے نیرنگ کو اپنا سیاسی مسلک بدلنے پر آمادہ کر دیا۔ آخر میں میر نیرنگ پاکستان چلے گئے۔ شاعری کو سیاست نے تباہ کر دیا تھا۔ اب وکالت کو بھی سیاست نے تباہ کیا۔ لاہور اور جھنگ میں ان کی وکالت ناکام رہی۔ غیر منقسم ہند کے پنجاب میں ان کی وکالت نے دھوم مچا رکھی تھی۔ بیوی اور بیٹی کی وفات نے ان کی روح کے تار کو شکستہ کر دیا۔ یہ دل شکستہ شاعر، ناقد، سیاست داں، ایڈوکیٹ، تعلیم کا پرچارک اپنی بچی کھچی جائیداد کے سہارے زندگی کے آخری دن پورے کر کے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

کلامِ نیرنگ میں غیر مدون کلام بھی شامل ہے جس میں بیشتر نظمیں، چند تاریخی قطعات اور کچھ غزلیں ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ کلام خواجہ مشفق کی تجویز پر مرتب کیا گیا ہے خواجہ مشفق نے فرمایا ہے:

"ڈاکٹر عقیل نے اس کتاب پر جو فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے اس کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ میر نیرنگ کے حالاتِ زندگی اور ادبی کاموں کے بارے میں پہلی جامع تحریر ہے:

میر نیرنگ کے تین شعر:۔

پھر ہوا ہم کو دل درد آشنا کا بچانا مشکل   نگہہ ناز کا پھر ہم سے تقاضا ہے وہی
شعلۂ طور سے تو وادیِ ایمن ہی جلی   تم جہاں آتے ہو اک آگ لگا جاتے ہو

کچھ تو لایا ترے در سے نیرنگ   آخری دید کی حسرت ہی سہی

"کلام نیرنگ" آفسٹ پر نہایت عمدہ چھپا ہے۔ مگر آرٹ اپنے آرٹسٹ کی تصویر کا متلاشی ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

نیلا آکاش

شاعر: احتشام اختر
پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۲
قیمت: پچیس روپے

ساتویں دہائی کے اواخر میں نئے شعراء کی جو نسل منظر عام پر آئی تھی ان میں احتشام اختر بھی شامل ہیں۔ ادبی سفر میں ان کی رفتار مدھم سہی لیکن متواتر اور متوازن ہے ۷۴ء میں ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ منظرِ عام پر آیا تھا اور اس کی غزلوں نے مجھے بطورِ خاص اپنی طرف متوجہ کیا تھا اب احتشام اختر نے "نیلا آکاش" میں اپنی چھ درجن مختصر نثری نظمیں پیش کی ہیں۔ اردو میں پابند شاعری اور آزاد نظم کی ایسی چند نادر روایت موجود ہے کہ میرا خیال ہے یہاں نثری نظم کے اس حد تک پنپنے کے امکانات نہیں ہیں جتنے کہ ہندی میں ہیں بہر حال احتشام اختر جیسے کچھ فن کار اس طرف سنجیدگی سے متوجہ نظر آتے ہیں اس لیے مستقبل کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا درست نہ ہوگا۔ پیش نظر نظموں میں "شرارت"، "کوشش"، "دل کا آنگن" اور "آسمان" جیسی تخلیقات سے جھلکتی ہوئی معصوم شوخی، کھلنڈراپن اور جرأت اظہار دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اگر ان میں شعریت کا تھوڑا سا عنصر اور شامل ہوتا تو شراب دو آتشہ ہوجاتی۔ کتاب خوب صورت چھپی ہے اور موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

کلیاتِ سراج

شاعر: سراج اورنگ آبادی
مرتب: پروفیسر عبدالقادری سروری
ناشر: ترقی اردو بیورو، بلاک آر، کے، پورم
ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲
قیمت: چوالیس روپے

سراج اورنگ آبادی اور میر تقی میر ہم عصر تھے۔ میر نے اپنے تذکرے "نکات الشعرا" میں سراج اورنگ آبادی کے حالات لکھے ہیں اور اشعار بھی درج کیے ہیں۔

ترقی اردو بیورو نئی دہلی نے "کلیات سراج" کی تصحیح کرکے اس کو شائع کیا ہے۔ ۳۳۲ صفحات کی ضخیم اشاعت ایک بڑے ادارے کے شایانِ شان کارنامہ ہے۔ اس کی تصحیح و ترتیب کے لیے پروفیسر عبدالقادری سروری سے زیادہ اور کون مناسب ہو سکتا تھا ان کی وسعت مطالعہ

محنت وتلاش، تقابلی مطالعہ، تحقیق و تجزیہ اور حصولِ علم کی دھن بے نظیر تھی۔ ان کی تصانیف نے اردو زبان و ادب میں گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ "تاریخ زبان اردو" اور "تذکرے" فیض یابی کا مستقل سرچشمہ ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے "کلیات سراج" مرتب کرنے میں ۲۶ نوادرات سے کام لیا ہے۔ اوّلین تذکرہ اس باب میں "نکات الشعرا" میر تقی میر ہے اور آخری چیز "سراجِ سخن" جو مرتب کا معتبر کارنامہ ہے۔

مرتب نے کلیات میں اپنا مبسوط اور پر مغز مقدمہ شامل کیا ہے اس مقدمے میں سراج اورنگ آبادی کے دکن کی سیاسی، ثقافتی، مذہبی، تصوفانہ، ادبی سرگرمیوں کی مختصر روداد بھی ملتی ہے اس تناظر میں سراج اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور شعری ذوق نیز معاصرین میں ان کے مقام کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

سراج کی ایک غزل بے حد مقبول ہوئی جس کا مطلع یہ ہے:

خبرِ تحیرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو، تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بیخبری رہی

مرتب کا بیان ہے۔ ص ۲۷

"سراج کی یہ وہ غزل ہے جو نہ صرف دکن بلکہ ہندستان بھر میں مشہور اور مقبول ہے۔ اور اسی مقبولیت کے سبب ہندستان کے کئی شعرا کے نام سے منسوب ہو چکی ہے۔"

"کلیات سراج میں گیارہ مثنویاں شامل ہیں۔ حروفِ تہجی کے تحت غزلیات درج ہیں۔ حاشیہ میں حک و اضافہ اور اختلافِ متن کی نشان دہی ملتی ہے۔ متفرقات میں فردیات، رباعیات، قصیدہ، مستزاد، مخمسات، ترجیع بند اور مناجات کا اندراج ہے۔

مرتب نے شمالی ہند کے مشہور شعرا کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ سراج اورنگ آبادی کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

یار کوں بے حجاب دیکھتا ہوں — میں سمجھتا ہوں خواب دیکھتا ہوں
یہ عجب ہے کہ دن کوں تاریکی — رات کوں آفتاب دیکھتا ہوں

لیا ہے ہات میں ساقی شراب کا شیشہ — کہاں رہے گا سلامت حباب کا شیشہ

ہوا ہے مہرباں وہ موکمر آہستہ آہستہ — کیا مجھ آہ نے شاید اثر آہستہ آہستہ
مرے حالِ پریشاں کی حقیقت کو سنا جاکر — صبا کوچے میں گلرو کے گذر آہستہ آہستہ

"کلیات سراج" اردو شاعری کا یادگار سرمایہ ہے۔ اس کو ہر لائبریری میں فیض یابی کے لیے محفوظ ہونا چاہیے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

لفظ و بیاں

شاعر: رفیع بدایونی
ناشر: بزم جامی بدایوں
قیمت: بیس روپے

رفیع بدایونی کا پہلا شعری مجموعہ "لفظ و بیاں" اشاعت پذیر ہوا ہے۔ انتخاب کلام شاعر نے خود کیا ہے۔ رونق بدایونی نے انتخاب کلام پر نظر ثانی کی ہے۔ شاعر نے استادی شاگردی کی رسم سے بے نیازی برتی ہے۔

"لفظ و بیاں" کا مقدمہ پروفیسر آل احمد سرور نے رقم فرمایا ہے چند سطور ملاحظہ فرمائیے:

"رفیع بدایونی کی غزل کا رنگ و آہنگ تو کلاسیکی ہے۔ ان کے تجربات میں کہیں زندگی اور حسن و عشق کی مانوس عکاسی ملتی ہے مگر ان کی زبان اور ان کے لہجے میں اس دور کی حسیت بھی جھلکتی ہے"

اس مقدمہ نے رفیع کو وقیع بنا دیا ہے۔ عبداللہ ولی بخش قادری نے "رفیع میاں گھر کے اندر اور باہر" تحریر کر کے شام بدایونی کی تصویر کشی کی ہے۔ شعرا کی زندہ دلی، ہم نشینی اور شعری فضا کا بیان نہایت دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ اسی منظر نامہ سے شاعر کی شخصیت کا نقش ابھرتا ہے۔

مبشر علی صدیقی، عروج زیدی، طیب بخش بدایونی۔ قاضی الیاس رشید، صغیر حسن صدیقی، دیریندر پرشاد سکسینہ، شاداب بدایونی، اسعد بدایونی، کرشن موہن وحشی بدایونی اور رونق بدایونی نے اپنی اپنی پسند اور رائے کا اظہار کیا ہے۔ شاعر نے اپنی زندگی اور شاعری کی ابتدا و رفتار کے متعلق اشارے کیے ہیں۔

اس ہجوم آرا میں تبصرہ نگار کو بھی اپنا فرضِ منصبی ادا کرنا ہے۔ میرے نزدیک شاعری کو ورثہ میں پانا کوئی فیض یابی نہیں۔ اس لیے کہ ورثہ میں بورژوا معقولیت پسندی کا رنگ غالب ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں شاعر کی انفرادیت کو تقویت نہیں پہنچ سکتی۔ اچھا شاعر بننے کے لیے نبی نوع انسان کے تجربات کا ورثہ چاہیے۔

رفیع کی شاعری میں کلاسیکی انداز پایا جاتا ہے۔ مگر رفتارِ وقت نیا راستہ بھی دکھاتی ہے اور نیا اسلوب بھی جلوہ ریز ہے۔ یہ نیا اسلوب اختیار کرنے میں دل سے روایت سے اور کسی مخصوص تحریک سے کام نہیں لیا بلکہ یہ اس کی ذہنی روشنی کا کرشمہ ہے۔ یعنی فن کار کے فنی ارتقا اور زندگی کے نقطۂ نظر اور فنی طریق کار میں تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے شاعر کے یہاں حسن و عشق کے ساتھ اپنے سماج، اقتدار، سیاست اور عوام کے مسائل پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے۔

اب رہی "شاعر کی اپنی آواز" اس مقام پر کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ دس گیارہ برس کی شاعری میں واضح سمت متعین کرنا بھی ممکن نہیں۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محاسن و معائب سخن پر کڑی نظر ضروری ہے۔ شاعری

میں ہیئت و مواد دونوں کی اہمیت ہے۔
"لفظ دبیاں" کے مطالعے سے مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ شاعر نے علمیت اور بعض ثقیل لفظیات کا سہارا روا رکھا ہے۔ یہ روش تخلیقی عمل کے لیے خطرناک ہے اب چند اشعار پیش کرتا ہوں جن سے شاعر کی شناخت کی جا سکتی ہے:

کوچۂ یار سے پھر بادلوں کی خوشبو آئی — تذکرہ خلد کا اے شیخ حرم رہنے دے

بڑھوں تو شہرِ ملامت، رکوں تو دشتِ جنوں
کدھر کو جاؤں کہ اب کوئی راستہ نہ رہا

کیا خبر تھی کہ ٹھہر جائے گا چلتا سورج
صبح آئے گی مرے پاس نہ شام آئے گی

موسم گل سے لیے پھولوں نے رنگیں پیرہن
اور وحشی ہیں کہ وہ جامہ دری تک آگئے

گھر کا سکون، زیست کا سایہ نظر میں تھا
ہم رک گئے تھے سایۂ دیوار دیکھ کر

خوشی ہے کہ رفیع بدایونی نے شعری مجموعوں کی فہرس میں ایک خوش گوار اضافہ کیا ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

شعرِ شگفت

شاعر: کرشن کمار طور
قیمت: تیس روپے
پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

کرشن کمار طور کا نام ادبی رسائل کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے نیا نہیں ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام "شعرِ شگفت" حال ہی میں دھرم شالہ (ہماچل پردیش) کے رِتو پرکاشن نے شائع کیا ہے جس میں بہتر ۷۲ غزلیں شامل ہیں۔ کرشن کمار طور کے شعر پڑھ کر پہلا احساس شدت سے یہ ہوا کہ فن کار نے شعوری طور پر جدید رنگ میں غزل کہنے کی کوشش کی ہے۔ جو نتیجہ برآمد ہوا اس کے نمونے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

بریدہ ارضِ وفا اسمِ زردیِ زرخیز — حصارِ مرگِ طلب ابجدِ آسماں بانی
گماں سرابِ غبار، دامِ نگوں نگاہی — کہ بے صدا ابھی ہے دل کا اب شہرِ بے خبر سا
میں برقِ لفظ تھا پڑتا تھا بسر کانوں میں — نشاطِ گرمیِ لطفِ کتاب کیا رکھتا
میں اپنے چہرے کی تقدیس کو کر دوں موقوف — کہ اب یہ سنگِ سمندر تو آب دے گا کون
ترے وجود کی خوشبو ہے طور عکسِ نمو — تو اپنی کشتِ سخن میں بدن کے تیور بھر

یہاں میں نے ایسے اشعار کا انتخاب کیا ہے جنھیں شعری آہنگ کے ساتھ پڑھا جا سکے

ورنہ مجموعے کی اکثر غزلوں کو پڑھتے ہوئے حسن سماعت اور غنائیت کی بین کمی کا احساس ہوتا ہے۔ کرشن کمار طور کی ترکیب سازی پر گرفت اور معنی آفرینی کی خواہش اگر اپنے کچھ ہم عصر مقبول شعرا کی تقلید سے آزاد رہ سکے تو یقیناً وہ اچھی غزل کہہ سکتے ہیں۔ "شعر شگفت" میرے خیال میں تخلیق اور تقلید کی درمیانی منزل ہے جس میں جذبے کی حرارت اور فن کار کے نجی تجربات و مشاہدات کا فقدان ہے۔ نیا انداز بیان اختیار کرنا بلاشبہ ایک مستحسن فعل ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری ہے کہ آپ کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات بھی ہو۔ کرشن کمار طور بھی زیب غوری جیسے ان بہت سے شعرا کی صف میں شامل نظر آتے ہیں جنھوں نے بانی اور ظفر اقبال سے ضرورت سے زیادہ اثر قبول کر کے اپنی تخلیقی شناخت کو دھندلا کر لیا ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

نوشتہ

شاعر: عشرت ظفر
ملنے کا پتا: بزم خضر راہ ۱۲۴/۱۰۵ گوالٹولی کانپور۔۱
قیمت: ۲۰ روپے

عشرت ظفر جدید غزلیہ شاعری کے روح رواں ہیں میرے خیال میں ان کی طبیعت کو غزل سے زیادہ نسبت ہے وہ ہر بات غزل میں ہی کہہ لینا پسند کرتے ہیں انھوں نے کم کہا ہے مگر جو بھی کہا ہے وہ خوب ہے۔ ہر شعر میں کوئی نئی بات کہنے کی سعی کی ہے جس سے آج کے قاری کو انھیں پڑھ کر مایوسی نہ ہوگی۔ معنویت۔ بلند خیالی اور فکر سے اشعار مزین ہیں۔

ممتاز نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے کسی شاعر کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے وہی بات عشرت ظفر پر صادق آتی ہے۔ "کسی شاعر کے پہلے مجموعۂ کلام کی اشاعت کوئی ایسی خاص سنسنی خیز بات نہیں ہوتی لوگ لکھتے رہتے ہیں اور جن کے مقدر میں کوئی ناشر لکھا ہوتا ہے وہ چھپ بھی جاتے ہیں لیکن اگر شاعر عشرت ظفر ہو اور مجموعۂ کلام 'نوشتہ' ہو تو یقینی طور پر ایک اہم واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"

عشرت ظفر کے نظامِ تخلیق میں ان کی ذات مرکزی مقام کی حامل ہے اور بقیہ تصورات زیست یا معاملات حسن و عشق سب اسی توہی مرکز کی کشش کے تابع ہیں وہ خود بھی تو کہتا ہے۔

آخرش میری ہی شمشیر میرے کام آئی
کوئی بھی تیغ قلم کر نہ سکی سر میرا!

سادہ لوحی مری مشہور سہی ۔۔۔ سادہ اک نقش ہے پر فن میرا

مت ڈھونڈھ مجھ کو راہِ طلب کے غبار میں
میں قید ہوں خود اپنی انا کے حصار میں

اس طرح ان کی شاعری زیادہ تر ذاتی حصار میں مقید ہے۔

میری ہستی ہے محورِ تخلیق ۔۔۔ میں چلا دورِ کائنات چلا
پھر کھلا منظر شگفتن خاک ۔۔۔ پھر میں سوئے حصارِ ذات چلا

ان کے یہاں غم کی چمک ملتی ہے وہ غم جسے اس نے غمِ جاناں کے روپ میں قبول کر لیا اس کے سارے کرب اور اذیت کے ساتھ۔

مصروفِ گفتگو تھا میں جب اس کے جسم میں
چاروں طرف حصار کی صورت گھٹائیں تھیں

غم کی آگ میں جلنا اور پھر تخلیقی سطح پر اس کو اپنے فن میں ڈھالنا یہی اس کا کمال ہے عشرت نے تجربے کی آگ کو فن کی اساس قرار دیا ہے اس نے غم کو ذات تک محدود نہ رکھا بلکہ اس نے ذات کے غم سے دوسروں کے غم تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب ہے۔

میں ایک ذرّہ سہی میرا امتحان تو لے ؎
مرے وجود پہ رکھ دے سمندروں کی اساس

انھوں نے غزل کو نئی نئی علامتوں سے مزین کرنے کی سعی کی۔ نوشتہ کی غزلوں میں جو علامتیں استعمال کی گئی ہیں وہ غیر واضح نہیں ہیں اور نہ اس میں ترسیل کا المیہ پایا جاتا ہے اشعار دل کی گہرائیوں میں اترتے ہیں ان میں تاثر بدرجہ اتم موجود ہے اس طرح ان کے کلام میں گہرائی اور گیرائی دونوں نمایاں ہیں جو ایک پختہ ذہن و شعور کی نشان دہی کرتی ہیں۔

ہزار بار زمیں پیرہن بدلتی ہے ؎
لباس آب پہنتا ہے آسماں اس کا

اسلوب کے اظہار میں نعرہ بازی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ایک حساس اور باشعور فن کار ہونے کے سبب اس نے دوسروں کے غم کو بھی محسوس کیا ہے۔ اس طرح اسلوب کے لحاظ سے بھی ان کی غزلیں الگ پہچان رکھتی ہیں۔

غمِ ذات، غمِ جاناں اور غمِ دوراں — ان کی شاعری میں تینوں ہی سمتیں نمایاں ہیں۔

؎ رات کی عمر جو دراز کرے   وہ کہانی اسے سناؤں میں

عشرت ظفر ہنگامی موضوعات پر مبنی آہ اور واہ' قسم کی اخباری شاعری نہیں کرتا ہے اس کی شاعری میں عصری شعور شعر بن کر آیا ہے اخباری بیان بن کر نہیں۔

فلک کا فاصلہ بڑھنے لگا ہے   دعائیں رہ نہ جائیں راستوں میں
سمندر کی تہوں تک جا نہ پائے   دمکتے سنگریزے دل کے پجاری

خدا کرے اس نے شاعری کی صورت میں جو آئیڈیل پانے کے تخلیقی سفر کا آغاز کر دیا ہے اس میں وہ کامیاب ہو۔

کل وہی اسم ہو گا نقشِ نجات
جس پہ ہنستی ہے آج میری آل

(تسکین زیدی)

برگِ غزل

شاعر: ڈاکٹر ابو محمد سحر
ناشر: مکتبہ ادب بھوپال
قیمت: پندرہ روپے

اردو غزل واقعی بُری "کافر صنفِ سخن" ہے۔ اس نے ادب کے بڑے بڑے صوفیوں کے ایمان ڈگمگا دیے ہیں جس کا ایک ثبوت پیشِ نظر مجموعہ "برگِ غزل" بھی ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر کا نام اردو تحقیق و تنقید میں اہمیت کا حامل ہے۔ موصوف کا قلم اردو میں قصیدہ نگاری' سے لے کر غالبیات کے چند مباحث' اردو املا اور زبان و لغت کے مسائل تک اپنا لوہا منوا چکا ہے۔ لیکن "برگِ غزل کے منظرِ عام پر آنے سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ تنقید و تحقیق کے میدان کا یہ شہ سوار کوچۂ غزل میں بھی تاک جھانک کرتا رہا ہے۔ " یہ غزل کی کافرادائی" نہیں ہے تو اور کیا ہے ــ کہا جاتا ہے کہ تخلیق (خصوصاً غزل) اور تنقید ایک میان میں دو تلوار کے مترادف ہے لیکن "برگِ غزل" کے شاعر اور تنقید کے شہ سوار نے اپنی صلاحیتوں کی بنا پر شیر اور بکری دونوں کو ایک ہی گھاٹ پر پانی پلانے کی ایک حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔

"برگِ غزل" ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ترپین غزلوں کا گلدستہ ہے۔ جس میں شاعر کی ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کی شعری کاوشیں شامل ہیں۔ ان میں روایتی انداز کی غزلوں کو بھی جگہ دی گئی ہے اور غزل کے نئے لب و لہجہ کی نمایندگی بھی ملتی ہے اور کہیں کہیں تخلیق کار نے شعوری طور پر بھی اپنی شناخت بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غزل کہتے وقت شاعر کے لاشعور میں غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری کا بھرپور تاثر رہا ہے جو "برگِ غزل" کی غزلوں میں جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض اشعار میں شاعر کے کچھ مخصوص الفاظ کا عمل دخل زیادہ ملتا ہے۔ جو شعر کہنے کی شعوری کوشش کی چغلی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مجموعے کے متعدد اشعار اپنے زمانے اور عصری آگہی کی نمایندگی کرتے ہیں اور شاعر کے گہرے درد کا پتا دیتے ہیں مثلاً ؎

چلنا نصیبِ زیست ہے یوں ہی چلے چلو ــ اس راستے میں شہرِ تمنا نہ آئے گا
ہو جائیں آپ بھی کہیں پتھر نہ دیکھیے ــ جادوگروں کا شہر ہے مڑ کر نہ دیکھیے
ارضِ قمر پہ جا کے سبک ہو گئی تو کیا ــ اس اپنی زندگی پہ تو بھاری ہے زندگی
تھا محوِ خواب زمانہ ہمیں نہ دیکھ سکا ــ طلوعِ صبح سے اٹھ کر عیاں ہوئے ہم لوگ
کس کو اب حوصلۂ انجمن آرائی ہے ــ کوئی عالم ہو یہاں عالمِ تنہائی ہے
اب اس سے کیا غرض ہے کہ انجام کیا ہوا ــ یہ تو نہیں کہ تیری تمنا نہ کر سکے

اگرچہ "برگِ غزل" کے شاعر کو بحیثیت محقق و نقاد کے جو مقام اردو ادب میں حاصل ہے وہ بحیثیت غزل گو "برگِ غزل" دلانے میں ایک حد تک ناکام رہی ہے۔ البتہ اس لحاظ سے یہ قابلِ قدر ہے کہ نقاد کے پسِ پردہ شاعر کو اگر ابھرنے کا موقع دیا جائے تو صاحب

"برگِ غزل" میدان غزل میں بھی اپنا لوہا منوا سکتا ہے۔
مجموعہ کی قیمت و طباعت و سرورق دیدہ زیب ہیں۔ قیمت بہ اقتضائے زمانہ قطعی نامناسب نہیں ـــ

(واجد قریشی)

دشتِ آرزو

شاعر: غنی اعجاز
ناشر: سہیل اعجاز مومن پورہ آکولہ
قیمت: ۲۰ روپے

اردو میں شائع ہونے والی کتابوں میں شاعری کے مجموعوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن اچھی شاعری کے مجموعے بہت کم منظرِ عام پر نظر رہے ہیں۔ "دشتِ آرزو" غنی اعجاز کا مجموعہ کلام ہے۔ غنی اعجاز کی شاعری کلاسیکی روایت کی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ انکار سے اظہار تک روایت کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ البتہ جہاں غنی اعجاز نے اپنے ذاتی تجربے کا بیان سماجی تلخ کامیوں کے پس منظر میں کیا ہے وہاں ان کی غزلوں میں روایت کا حسن نظر آتا ہے۔ مثلاً ؎

جانے کیسا شخص ہے وہ کون سمجھائے اسے
قاتلوں کے شہر میں ہے مہربانی کی تلاش

بدلتی رت نے برہنہ کیا درختوں کو
لگا ہے ڈھیر سا اتری ہوئی قباؤں کا

ہر شب غم کے مقدر میں سحر ہے لیکن
اپنی قسمت کے ستاروں کی روش کیسی ہے

اس طرح کے اشعار قابلِ توجہ ہیں لیکن یہ امر باعثِ افسوس ہے کہ دوسرے نئے شعراء کی طرح غنی اعجاز نے بھی زبان و بیان اور عروض و فن کی طرف غفلت برتی ہے جس کا ثبوت ان کی ہر غزل سے فراہم ہوتا ہے۔ مثلاً ؎

دائرے میں گھومتے ہیں ہم نہ راہی نہ مقیم
رہگذر پے چیدہ اپنی ہم سفر پے چیدگی

بڑی نیکی ہے حق گوئی مگر منصف نہیں دنیا
گلے پڑ جائیں نہ داد و رسن کچھ کہہ نہیں سکتے

چل سکی نہ ایک بھی پیشِ اجل
چارہ گر خود آج بے چارہ ہوا

ان تینوں اشعار میں "نہ" "نا" کے وزن پر استعمال ہوا ہے جو فصاحت کے خلاف ہے۔
مندرجہ ذیل اشعار خارج از بحر ہیں ؎

تاریکی ہے سناٹا ہے سنسان ہے جنگل
چلاؤں بھی چیخوں بھی مگر کس کو صدا دوں

کہیں آنسوؤں کے چراغ ہیں کہیں زخم ہیں کہیں داغ ہیں
غمِ یار ہے یا بہار ہے کہ روش روش کو سجا دیا

ہم کو چلے ہو تم سمجھانے صحرا نوردی آبلہ پائی
ہم نے تو گلزار کیے ہیں دشت و بیاباں تم سے زیادہ

موتی کی لڑی ہے کہ وہ دنداں ہیں دہن میں
لب ہے یا کوئی غنچہ سرِ شاخ کھلا ہے

رخسار حسیں ہیں کہ دہکتے ہوئے شعلے
دامن جہاں پر شوق نگاہوں کا جلا ہے

ان اشعار میں "تاریکی کی "ی" یا کا "الف" صحرانوردی کا "الف" جہاں کا "الف"
ساقط ہوگیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں اس سے زیادہ عبرت ناک صورت حال ہے ؎

تمام شب کی سیاہی کو نوشِ جاں کر کے
نجوم سحر نئی صبح کے نقیب ہوئے

سحر بروزن "درد" نظم ہوا ہے جس کے معنی جادو کے ہیں لیکن یہاں یہ لفظ سحر بروزن
"اثر" کے معنی میں لکھا گیا ہے اس لیے مصرعہ خارج از بحر ہے ؎

چاہیے عادت کے ہی خلاف کرو
اپنی غلطی کا اعتراف کرو

غلطی (بروزن فعلن ہے) غلط تلفظ کے ساتھ نظم ہوا ہے۔

اپنے مرکز سے ہر ایک چیز گریزاں نکلی
لیلیٰ ہر بزم میں تھی خلوت محمل کے سوا

لیلیٰ۔ لیل کے وزن پر نظم ہوا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں ایطا ہے۔

یہ کرشمہ غمِ عشق ہے کہ دلوں کو جس نے جلا دیا
یہی زندگی جو عذاب تھی، اسے سازگار بنا دیا

عشق دریا روز و شب بہتا ہوا
حسن جادو ہر گھڑی چلتا ہوا
تم نے دیکھا ہے کبھی ٹلتا ہوا
کاتبِ تقدیر کا لکھا ہوا

جلا، بنا، بہتا۔ چلتا اور ٹلتا۔ لکھا میں ایطائے جلی ہے۔

مندرجہ ذیل شعر میں شکست ناروا وارد ہوا ہے ؎

ہیں جہاں کی گردشیں معتبر تو نہ ہوگی کیسے بھلا سحر
جو مزاجِ شب پہ طلوعِ صبح بھی ہے گراں تو ہوا کرے

صبح ٹکڑے ہو کر آدھا مصرعہ کے ابتدائی حصے میں اور آدھا مصرعے کے آخری حصے میں شامل ہو گیا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار بھی زبان و بیان کے نقطۂ نظر سے محلِ نظر ہیں ؎

اے سادہ لوحوں کے اعتمادوں کو لوٹ کر مسکرانے والو
طلسم مہر و وفا کہاں تک فریب باغ و بہار کب تک

کوئی الزامِ محبت ہو لگائے رکھیے
ایسی تہمت کیسے ملتی ہے اٹھالی جائے

اگر غنی اعجاز اس مجموعے کو شائع کرنے سے پہلے لسانی، فنی اور عروضی نقطۂ نظر سے اور محنت کر لیتے تو بہتر ہوتا۔

(پروفیسر عنوان چشتی)

ارمغانِ اعلا

شاعر: شمیم ٹونکی
ناشر: ادبستان صاحب۔ قافلہ اسٹریٹ راجستھان۔
قیمت: دس روپے

شمیم ٹونکی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ارمغانِ اعلا کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے اس میں مختلف عنوانات کے تحت پیش کردہ نعتیہ نظموں کے علاوہ بیس رباعیاں بھی شریکِ اشاعت ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، مخمور سعیدی اور اکبر شہابی نے شمیم ٹونکی کی نعت گوئی اور اردو شاعری کے نعتیہ سرمائے کے پس منظر میں اس کی قدر و قیمت

سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی کا کہنا ہے کہ:

"ان کی نعتیہ شاعری میں حضرت صائب ٹونکی سے ربط نے فن کارانہ حسن اور حضرت صاحبزادہ شوکت علی خاں ٹونکی سے وابستگی نے روحانی کیفیت پیدا کی ہے۔"

مجھے ان دونوں خصوصیات کی جھلک شمیم ٹونکی کی نعتیہ شاعری میں نظر آئی مگر ان کے یہاں وہ کیفیت نظر نہ آئی جو موضوع سے والہانہ ربط و عقیدت کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ شاید یہ عمر کا تقاضا ہے اور مستقبل میں شمیم ٹونکی فنی و جذباتی پختگی کی راہ پر یقیناً آگے بڑھتے رہیں گے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے شمیم ٹونکی صاحب کے کلام میں فنی حسن کے جلوے موجود ہیں انھوں نے ایک مشکل صنفِ سخن پر کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ بعض سخت قوافی اور ردیف کے ساتھ بھی اشعار کہے ہیں مثلاً

ہے سحر روئے صباحت روئے ختم المرسلین
شام ہے منت کش گیسوئے ختم المرسلین

لیکن ان کی شاعری کا فن کارانہ حسن رباعیات میں زیادہ نمایاں ہوا ہے مثلاً

مصروف ہوں ان کی یاد میں شام و پگاہ
ہے گنبدِ خضرا کی طرف میری نگاہ
میں اور کروں غیر کے آگے سر خم
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

اور

اس درجہ ہے روضۂ اقدس کی یہ خاک
قندیل سے گنبد کی ہیں روشن افلاک
ہے فرش سے تا عرش فرشتوں کا ہجوم
اللہ رے یہ عظمت شاہ لولاک

ایک بات جو میں نے ارمغان اعلا کا مطالعہ کرتے وقت بطورِ خاص محسوس کی وہ یہ ہے کہ شمیم ٹونکی کے موضوعات و خیالات میں زیادہ وسعت نہیں۔ ظاہر ہے کہ رسولِ پاک کی ذاتِ اقدس اور مدینہ منورہ سے متعلق ان کے بیانات بیشتر شنیدہ ہیں اور مدینے کی گلیوں سے گذرنے کی سعادت انھیں حاصل نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی شاعر کے ذاتی احساسات کی پیش کش کچھ تو ہونی تھی یہاں حال یہ ہے کہ روایتی قسم کے بعض موضوعات تواتر کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، صرف ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

رسولِ پاک کے دیدار کی دل میں تمنا ہے
کہ اس دیدار سے اللہ کا دیدار ہو جائے
خدا کو دیکھنے والے رسول کو دیکھیں
جمالِ ذاتِ خدا ہے جمالِ روئے رسول
نگاہِ شوق نے جب بھی خدا کو دیکھنا چاہا
تمہارا کر لیا ہم نے نظارا یا رسول اللہ
نظارہ کی مشتاق ہے یوں میری نظر
اللہ کا دیدار ہے تیرا دیدار
خدا جلوہ گر ہے رخِ مصطفےٰ میں
رخِ مصطفےٰ آئینہ ہے خدا کا

مجموعی طور پر شمیم ٹونکی کی یہ کاوش قابلِ قدر ہے۔ ان کے بعض نقادوں نے انھیں قبولِ عام کی دعا دی ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ شمیم ٹونکی کو بار بار دیارِ رسولؐ کی زیارت نصیب ہو

تاکہ ان کے قلب میں عشقِ رسولؐ کی جو چنگاری موجود ہے وہ شعلہ بن سکے۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

مصنف: شرر فتح پوری
ناشر: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز۔ جے۔ ۶۔
کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

فردا

قیمت: ۲۶ روپے

شرر فتح پوری کا مجموعہ کلام "فردا" غزلیات، نظمیات، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ غزلوں کے سرسری مطالعہ سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فردا کا شاعر اپنے سینے میں دردمند دل رکھتا ہے۔ وہ انسان دوست ہے اور اس کی آواز، وقت کی آواز ہے۔ اس شعر میں شاعر اپنا تعارف کراتا ہے ؎ میرا نغمہ، دلِ حیات کا درد، میری آواز، وقت کی آواز فردا کے منظوم دیباچہ میں شاعر نغمہ طراز ہے ؎

ہر رنگ میں جلا مرے دل کا لہو شرر وہ اشک تر ہو اکہ جبیں کا عرق ہوا

اور یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجیے ؎

اِک اِک ورق ہے جس کا شرر نقش رنگا رنگ میں وہ غمِ حیات کا رنگین جریدہ ہوں
زندگی دردِ مشترک ہے شرر بانٹ لو اہل کے دل فگاروں میں

یہی وجہ ہے کہ جب شاعر قلم اٹھاتا ہے تو وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ؎

اپنی روداد کہوں، یا غمِ دنیا لکھوں کون سی بات کہوں، کون سا نقشہ لکھوں؟

اور جب وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے اور اپنے دور کا جائزہ لیتا ہے تو اسے ایک شدید بے حسی کا احساس ہوتا ہے ؎

بے حسی وہ ہے کہ اس دور میں جینے کا مزا نہ گنا ہوں میں رہا اور نہ ثوابوں میں رہا

پھر شاعر اپنے دور کو "دورِ آگہی" کہہ کر طنز کرتا ہے اور آگہی کے پردے میں ایک سرد جنگ کا انکشاف کرتا ہے ؎

اس دورِ آگہی میں فراغِ سکون کہاں برپا ہر اک محاذ پہ اک سرد جنگ ہے

اس سرد جنگ کے باعث وطن کا کیا حال ہوا؟ اس شعر کے آئینے میں ملاحظہ کیجیے ؎

گلشن لٹا تو رنگِ خس و خار کھِل اٹھا شاخِ گلاب ہو گئی، ٹہنی ببول کی

ان چند اشعار سے ہی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ شاعر اپنے خارجی ماحول، سماج اور معاشرہ اور اپنے دور کے نشیب و فراز سے باخبر ہے اور روحِ عصر پر اسکی گرفت مستحکم ہے۔ شرر فتح پوری کی غزلوں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ درد و غم کی شدت کے باوجود شاعر کبھی قنوطی نہیں ہوتا۔ بھرپور رجائیت اشعار میں جاری و ساری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرر کے کلام میں مستقبل کی بشارت بھی جھلکتی ہے اور یہ ان کے صحت مند شعری رویہ کا ہی کرشمہ ہے۔

شررؔ کی نظموں پر ایک طائرانہ نظر، ان کی گہرائی اور گیرائی، زبان و بیان کا دروبست، اظہار کی گرفت اور صلابت، لہجہ کی توانائی اور طنطنہ۔ ایسی خصوصیات کو اجاگر کرتی ہے۔ شاعر ساقی سے مخاطب ہے ؎

مجھے آنا ہے طوفانِ حوادث سے گزر جانا　　　مرا دل بے نیازِ کلفتِ انجام ہے ساقی (ساقی)

شاعر کا شوقِ شہادت اور اس کا رجائی پہلو ملاحظہ ہو ؎

میں کہ جاں دادۂ نشاطِ حیات
اس مسرت کی زندگی کے لیے
شادمانی سے جان دیتا ہوں
یاس و غم میری ذات سے ہیں دور
میں مسرت کی موت مرتا ہوں

("دارورسن" پھانسی کے سائے میں جیلیو فیوچک کی وصیت)

دین دھرم کی آڑ میں جو بے دینی اور ادھرم ہوتا ہے۔ اس کی خوبصورت عکاسی اس نظم میں کی گئی ہے ؎

آہ بن بن کے بکھرتی رہی ناقوس کی لے　　　دھن یہ بنسی کی نہ پازیب کی جھنکار اٹھی
دھرم گنگا میں یوں ہی گھلتا رہا نفس کا زہر　　　راس لیلا میں کہیں لٹ گئی رادھا کوئی

(مندر)

نئے زمانے کی آمد آمد ہے۔ شاعر علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔ جہاد کو لبیک کہتا ہے اور اپنے انقلابی ترانے سے قدیم تعطل و جمود کو توڑ دیتا ہے ؎

علمِ بغاوت کے اٹھ رہے ہیں، دلوں کے آئینہ دار ہو کر
فضا میں رنگِ جہاد اڑتا ہے، رقصِ برق و شرار ہو کر
خموشیوں کا جمود چونکا ہے، شورشِ نغمہ بار ہو کر
نیا زمانہ، نیا ترانہ

(ترانہ)

شاعر مورخ کو للکارتا ہے ؎

تو نے لاریب مقابر کے پڑھے ہیں کتبے　　　تو نے ہر دور کی سطوت کے نشاں ڈھونڈے ہیں
تو نے شاہوں کے قصیدوں کو بنا کر ماخذ　　　عہدِ ماضی کے نشاناتِ گراں ڈھونڈے ہیں

(مورخ)

لیکن اب مورخ کو پرانا رویہ بدلنا پڑے گا اور جمہور کی تاریخ ضبطِ تحریر میں لانی ہوگی۔ شاعر نئے دور کا ان الفاظ میں خیر مقدم کرتا ہے ؎

ابھر رہی ہیں منزلیں، نقوش زیرِ گام سے
چھلک رہی ہے زندگی مسرتوں کے جام سے
بشر نے پائی ہے اماں، ملوکیت کے دام سے
یہ دور نو حیات کا

بشر کی آگہی، مزاج داں مہ و ماہ ہے
زمیں پہ ہے قدم تو سوئے آسماں نگاہ ہے
کہ بحر و بر کا ذکر کیا، فلک بھی گردِ راہ ہے
یہ دورِ نو حیات کا (دَورِ نَو)

انتظار، پنگھٹ، اور چاند رومانی نظمیں ہیں، پیامِ آزادی، دردِ وطن اور کاروانِ سحر حب الوطنی کے جذبات سے لبریز ہیں۔ کاروانِ سحر میں شاعر نے ہندستان کے ماضی، حال اور مستقبل کا جائزہ لیا ہے۔
شررؔ کے قطعات اور رباعیات کا رنگ و آہنگ بھی بڑا توانا ہے۔
(جاوید وششٹ)

دستِ کوہکن

شاعر: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ
ناشر: شمی فائن آرٹ۔ محمد علی روڈ۔ مومن پورہ ناگ پور۔ ۴۴۰۰۱۸
قیمت: دس روپے

پچھلی کتاب: ”کامٹی کی ادبی تاریخ“ کے جائزے میں اس کا ذکر آیا ہے کہ اس کے مصنف محمد شرف الدین صاحب نثر نگار کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں، پیشِ نظر کتاب ”دستِ کوہکن“ ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ کچھ شاعر ایسے ہوتے ہیں جو صرف غزلیں اچھی کہتے ہیں، نظم یا تو کہتے ہی نہیں یا کہتے ہیں تو بھس پھسی ہوتی ہیں، کچھ ایسے ہوتے ہیں جو صرف نظمیں کہتے ہیں، غزلیں یا تو سرے سے کہتے ہی نہیں یا کہتے ہیں تو برائے بیت، کچھ ایسے ہوتے ہیں جو دونوں میدانوں کے شہ سوار ہوتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا میدان ان کا اپنا خاص ہے۔ ساحلؔ صاحب اس آخری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ آگے چل کر کیا بنیں گے، غزل گو یا نظم گو یا دونوں، کچھ کہنا مشکل ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ اس وقت دونوں ہیں اور دونوں صنفِ سخن میں خوب کہتے ہیں، دونوں کی مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں، ”کتاب“ کے قارئین خود فیصلہ کریں کہ آیا وہ دونوں میں یکساں قدرت رکھتے ہیں یا کسی میں زیادہ اور کسی میں کم۔ پہلے ایک غزل ملاحظہ ہو جو چھوٹی بحر میں ہے۔

وہ جو ہم سے قریب ہے یارو — یہ ہمارا نصیب ہے یارو!
عشق جب سے ہے مہرباں مجھ پر — میرا عالم عجیب ہے یارو!
فکرِ درماں نہیں مجھے منظور — عشق خود ہی طبیب ہے یارو
فتنۂ زندگی قیامت ہے — ہر قدم پر صلیب ہے یارو
جس کو نغمہ سمجھ رہے ہیں ہم — نالۂ عندلیب ہے یارو
اس نے ساحلؔ کو کر دیا برباد — آدمی خوش نصیب ہے یارو

اب ایک نظم ملاحظہ ہو، اس کا عنوان ہے: "نوائے شوق" جو علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم کے چند اشعار پر تضمین ہے۔ اگرچہ بعض لوگ کسی چوٹی کے شاعر کی تضمین کو خلافِ ادب سمجھتے ہیں، مگر نوجوان شاعر نے اقبال جیسے عظیم اور منفرد شاعر کی مشہور نظم کی تضمین کی جرأت کی ہے،

عکس کسی کا ہے مرے آئینۂ حیات میں
خاص و دلنشیں ہیں کچھ، میری لطیف ذات میں
لاکھوں نکات ہیں یہاں، میری ہر ایک بات میں
"حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیرے تجلیات میں"

کارگہہ جہاں میں ہے خوفِ زیاں و فکرِ سود
روحِ بشر کو ہے دوام، پیکرِ زیست میں نمود
جن و ملک کا عجز سے خم ہے یہاں سرِ سجود
"گاہ میری نگاہ تیز، چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی، میرے توہمات میں"

حکم سے اپنے، خاک کے پتلے کو زندہ کر دیا
وسعتِ کائنات میں اس کو شرف عطا کیا
پھر بھی زبانِ عشق پر شکوہ یہی ہے اے خدا
"تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا، سینۂ کائنات میں"

امید کہ اردو کی شعری دنیا میں نوجوان شاعر کی ان تخلیقات کو قدر و عزت کی نظر سے دیکھا جائے گا اور ان کو مناسب داد دی جائے گی۔

(عبداللطیف اعظمی)

رادار

مصنف: ساقی فاروقی
ناشر: نئی آواز، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت: بیس روپے

"پیاس کا صحرا" کے بعد یہ ساقی فاروقی کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ساقی عرصے سے دہلی میں مقیم ہیں۔ اس لیے اس کی بہت سی نظمیں اس نئی ادبی اور سماجی فضا کی عکاسی کرتی ہیں جس میں وہ سانس لے رہے ہیں۔ وہ بہت کم کہتے ہیں اور جو کچھ بھی وہ کہتے ہیں اسے بہت سوچ سمجھ کر اور محنت کے ساتھ کہتے ہیں۔ ان کی بہت سی نظمیں جو اردو کے عام قاری کو شاید بہت اکھڑی اور پیچیدہ معلوم ہوں اُن کی اس ذہنی اپج اور عرق ریزی کا

نتیجہ ہیں جس کے ساتھ وہ اپنی نظم کی تشکیل کرتے ہیں۔ تخلیق کی رو سے ترسیل کی منزل تک پہنچنے کی وہ درمیانی گھڑیاں جن میں نظم تشکیل پاتی ہے۔ ساقی کے نزدیک بہت کٹھن بھی ہیں۔ اور بہت اہم بھی۔ جس کا ذکر بذاتِ خود بعض گفتگوؤں میں وہ کر بھی چکے ہیں۔ ن م۔ راشد نے ساقی فاروقی سے کہا تھا " نہ صرف تم اشیاء کو لمس کرتے ہو بلکہ اشیا تمھیں لمس کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے اس مجموعے کی نظمیں امانت، شیرا مداد علی کا مینڈک، خالی بورے میں زخمی بلا، ایک سور سے شاہ صاحب اینڈ سنز اس کیفیت کی آئینہ دار ہیں اور یہی کیفیت مجموعے کی سب سے پہلی نظم کمرنی کیشن میں بھی ہے جو اس طرح ہے:

یہ احساس کہ اک ذی روح
مری آواز کے شعلے سے جل سکتا ہے
خاموشی کے ریشم سے پگھل سکتا ہے
اتنا جاں پرور ہے کہ آنکھیں
بند ہوئی جاتی ہیں خوشی سے
بھیگی جاتی ہیں۔

ساقی اپنی شاعری کے موضوعات تو آس پاس سے اٹھاتے ہیں۔ لیکن اپنی شاعری کی زبان اور مخصوص لہجے کی تلاش میں انھیں دور تک جانا پڑتا ہے۔ وہ زندگی کو فن کے وسیلے سے دیکھنا تو چاہتے ہیں لیکن فن کے مروجہ فارمولوں کی عینک سے نہیں۔ ساقی کی غزلوں کے یہ شعر بھی دیکھیے:

ہر طرف ٹوٹ پھوٹ جاری تھی   ایک کہرام میرے اندر تھا
تیرے بدن کی آگ سے آنکھوں میں ہے دھنک   اپنے لہو سے یہ رنگ پیدا نہیں ہوئے

زندگی اور موت کے معاملات پر ساقی ایک وجودی کی حیثیت سے غور کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دانش وری اور وجودیت کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں ملتے ضرور ہیں۔ موت کا خوف تو معمولی انسانوں اور جانوروں میں بھی ہوتا ہے لیکن یہ صرف جسمانی اذیت کی ایک انتہائی منزل ہے۔ ذہنی اذیت ناکیوں کی سطح پر کائنات اور اس کی غرض وغایت کے سباق وسباق میں موت بڑے ہی بھیانک روپ میں ہمارے سامنے آن کر کھڑی ہوتی ہے جو ہر شے کی مقصدیت پر ایک سوالیہ نشان لگاتی چلی جاتی ہے اور انسان کے پورے وجود پر جبر کی سیاہ گھٹا سی چھا جاتی ہے:۔

عظیم آسمانوں میں دشمن جہازوں کی سرگوشیاں ہیں
ستاروں کی جلتی ہوئی لبتیاں ہیں
اور آنکھوں کے راداروں پر
صرف تاریک پرچھائیاں ہیں
امید کی سرخ آبدوزوں میں سہمے
تباہی کے کالے سمندر میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔

(اسلم پرویز)

بارش

شاعر: منظور ہاشمی
ناشر: دائرے پبلی کیشنز علی گڑھ
قیمت: بیس روپے

"بارش" منظور ہاشمی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی اطلاع کے مطابق بہ سلسلۂ ملازمت سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ ان کی اطلاع کے مطابق اس مجموعے کی بیشتر غزلیں ان کے سولہ سالہ قیام علی گڑھ کی یادگار ہیں۔ اس مجموعے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی تمام غزلیں مقطع سے عاری ہیں۔

منظور ہاشمی محسوسات کے فنکار ہیں۔ ان پر جو کچھ بیتی ہے اور انھوں نے اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیا ہے۔ زبان غیر ضروری آرایش سے پاک ہے۔ بیشتر اشعار کا محور شاعر کی خود اپنی ذات ہے۔ ان اشعار میں اس نے اپنی مختلف کیفیات و واردات کو غزل کی زبان میں پیش کیا ہے۔ اس خصوصیت کے حامل چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

لفظوں کی رفتہ رفتہ ضرورت نہیں رہی — اب وہ بھی سن لیا ہے جو اس نے کہا نہ تھا
طبیعتوں میں بہت اختلاف تھا لیکن — تری پسند ہماری پسند ہوتی گئی
جس سے روشن رہا مرا ہر دن — وہ رفاقت بس ایک شب کی تھی

لیکن آج کا شاعر محض اپنی ذات کا اسیر اور اپنے ماحول سے بے نیاز ہو کر نہیں رہ سکتا۔ وہ جس دور میں زندگی گذار رہا ہے اس کے انسان کا المیہ یہ ہے کہ بظاہر آسودہ خاطر اور اسے ہر طرح کا عیش و آرام میسر ہے لیکن اس کی روح غیر آسودہ ہے، وہ سکون کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہے لیکن اسے کہیں جائے امان میسر نہیں آتی۔ آج انسان کی ظاہری چمک دمک دراصل اس کے اندر کے کھوکھلے پن کا ایک پردہ ہے۔ منظور ہاشمی کے یہ اشعار آج کے انسان کے اس المیے کی غمازی کرتے ہیں:

ہر طرف لکھا ہوا تھا قریۂ امن و اماں — دھوپ سے بچنے کو لیکن سائباں کوئی نہ تھا
نہ جانے کون سے سائے کا قرض تھا ہم پر — جھلستی دھوپ رہی خیمہ زن ہماری طرف
ہر نئے موسم میں گھبرا کر یہی کہتے رہے — رُت جو اس کے بعد آئے گی سہانی آئے گی
مجھ کو ورثے میں ملی ڈوبتی سورج کی کرن — اور سب لوگ سمجھتے ہیں کہ تابندہ ہوں

منظور ہاشمی کا یہ پہلا مجموعۂ کلام ان کی قادر الکلامی کو ظاہر کرتا ہے۔ کئی غزلیں ٹیڑھی زمینوں اور مشکل ردیفوں میں کہی گئی ہیں۔ کلام عام طور پر فنی اسقام سے پاک ہے۔ کہیں کہیں ہوتی قوافی استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک غزل میں ہانپنے، بھاگنے، ناچنے، ناپنے جیسے قافیے بھی نظر آئے ہیں جو اصولاً صحیح نہیں ہیں لیکن آج کل اس قسم کی خامیاں عیوب میں شمار نہیں ہوتیں اس لیے قابلِ معافی ہیں۔

(حنیف کیفی)

کانٹوں کی خوشبو

شاعر: فیروز ظفر بدایونی
ناشر: ۱۳ فرشوری ٹولا۔ بدایوں۔ یوپی
قیمت: ۱۵ روپے

فیروز ظفر بدایونی ایک ایسے شاعر ہیں جو گوشۂ تنہائی میں ادب و شعر کی خدمت کر رہے ہیں بدایوں کی مردم خیز سرزمین سے ان کا تعلق ہے۔ جہاں ہر دور میں ممتاز صوفیا، علماء، شعرا اور ادبا رہے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں ہمارے ادب و شعر کا وہ روایتی حسن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ملتا ہے جو ادبی مراکز کا طرۂ امتیاز ہے۔ انھوں نے تنہائی، خاموشی اور سادگی سے ادبی طاقت حاصل کی ہے۔ اگرچہ انھوں نے اپنا نظریۂ ادب "ادب برائے ادب" لکھا ہے لیکن ان کی شاعری اس کی نفی کرتی ہے۔ اس دور کی شاعری ادب برائے ادب کے زمرے میں آ ہی نہیں سکتی۔ بہرحال ان کی شاعری میں غزل کی روایتوں کی دلکش بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس میں محرومی، یاس، شکستِ آرزو، خون نشاں جذبات اور نا آسودہ تمناؤں کا رنگ بھی ہے اور کہیں کہیں زندگی اور سماج پر شاعرانہ انداز میں تنقید بھی ملتی ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ٹھہر ُ جائیں گے اگر یک جا کرو ... سنگ ریزوں کو نہ ٹھکرایا کرو
آنکھ میں اشکوں کا ہونا ہے بصیرت کی دلیل ... ہر نگاہ بے بصر خوشبوں کی سودائی ملی
ہمارے خون کے چھینٹے اسے سب کچھ بتا دیں گے ... ہمارے بعد جو بھی کوچۂ قاتل سے نکلے گا
ہر مرحلۂ شوق کو سر کرتے رہیں گے ... ہم لوگ مسافر ہیں سفر کرتے رہیں گے
مری دیوانگی پر اس سے بڑھ کر طنز کیا ہوگا ... کہ بعض اوقات تیرا نام پوچھا جاتا ہے مجھ سے

اس مجموعے میں قطعات، نظمیں اور غزلیں سب کچھ ہے۔ کلاسیکی شاعری کے قدر دانوں کو اس سے زیادہ مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔ امید کہ یہ مجموعہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

(پروفیسر عنوان چشتی)

دوہے

شاعر: جمیل الدین عالی
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
قیمت: بارہ روپے

جمیل الدین عالی کے دوہے پاکستان میں شائع ہو کر خاصی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اب مکتبہ جامعہ نے ان کے پہلے مجموعے "غزلیں، دوہے، گیت" اور دوسرے مجموعے "لاحاصل" کے علاوہ بعد میں کہے گئے کلام کا انتخاب "دوہے" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ کوشش قابلِ تحسین ہے۔

عالی کی شاعری خصوصاً دوہوں سے متعلق محمد حسن عسکری نے دیباچہ میں جو باتیں لکھی ہیں وہ اہم بھی ہیں اور عالی کی شاعری کے بعض امتیازات کی نشان دہی بھی کرتی ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن سے متعلق ان کی رائے کو الگ رکھیے تو دوہوں کے بارے میں ان کی رائے کا خلاصہ

یہ ہے کہ:

"عالی نے اپنے دوہوں کے لیے مروجہ اردو میں ہندی کے دس پانچ مقبول الفاظ ملاکر ایک خاص زبان وضع کی ہے جس کی وجہ سے ان کے دوہوں کی تازگی دوبالا ہوگئی ہے۔ پھر عالی نے ہندی شاعروں کے خیالات اور احساسات کی روایت کا تتبع کرنے کی بجائے اپنا ذاتی تجربہ پیش کیا ہے..." عالی کے دوہوں میں مضامین کا تنوع غزلوں سے بھی زیادہ ہے.....
یوں تو انھوں نے دوہوں میں ہمارے زمانے کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے لیکن وعظ یا اخلاقی درس کا رنگ کہیں نہیں پیدا ہونے دیا۔" ان باتوں میں سے بعض ایسی ہیں جن سے اختلاف کی بھی گنجائش نکلتی ہے۔ مثلاً ایک بات تو یہی ہے کہ عالی کے دوہوں میں مضامین کا تنوع غزلوں سے زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ عالی کے تجربات کی دنیا محدود نہیں مگر اپنے دوہوں میں انھوں نے زیادہ تر ایک ہی طرح کے موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ دس بیس اشعار کے بعد اگر کوئی ایک شعر کسی نئے موضوع کو پیش کرے تو تقریباً ستر صفحات پر مشتمل کلام میں مضامین کے تنوع کی مثالیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں (کل صفحات ۸۸ ہیں جن میں سے تقریباً اٹھارہ صفحات دیباچہ اور فہرست وغیرہ کے لیے مخصوص ہیں)، دوسری بات وعظ یا اخلاق درس کے رنگ سے متعلق ہے۔ عسکری صاحب نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے جیسے دوہوں میں اخلاقی نصیحت کا پایا جانا کوئی جرم ہو۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ عالی کے دوہوں میں اخلاقی رنگ موجود ہے اور یہ کوئی قابلِ اعتراض پہلو نہیں۔ عسکری صاحب کی یہ بات البتہ بالکل درست ہے کہ عالی نے اسلوب اور خیالات کو ایک نوع کی تازگی سے ہم کنار کیا ہے۔ اور ایک بات بھی انھوں نے صحیح لکھی ہے کہ عالی کی جذباتی معصومیت جو غزلوں میں بھی نمایاں رہی ہے یہاں آکے دوچند ہوگئی ہے۔ میری نظر میں یہی جذباتی معصومیت عالی کی انفرادیت اور پہچان بھی ہے۔

بہر حال مجھے اس مجموعۂ کلام کا مطالعہ کرنے وقت شدت سے یہ احساس ہوا کہ عالی اس صنفِ سخن کو بہت آگے لے جا سکتے ہیں۔ پہلے اور دوسرے مجموعۂ کلام اور اس کے بعد کے دوہوں کا تقابلی مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عالی کا فن موضوع اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے مائل بہ ارتقا ہے۔ دوسرے مجموعے سے منتخب کیے ہوئے ابتدائی اشعار ہی ایک نئے احساس کا پتا دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اشعار خصوصاً آخری شعر میں شاعر کا لہجہ شوخی کی حدوں سے تجاوز کر گیا ہے مگر روایتی موضوعات کی فرسودگی بہت دور چھوٹ گئی ہے۔ تین اشعار دیکھیے:

چاند اُڑا کر سب ہیں مگن، پر سوچ میں ہیں ہیں کچھ لوگ
یہ دھرتی کا مان بڑھا ہے، یا دھرتی کے روگ
کنوارا جسم اور کنواری آتما ہے کوئی ایسی نار
لو بھگوان اب عالی مانگے نئے نئے اوتار

تیس روپے میں بیس ہیں اس کے دس لیوے دلال
اتنا مہنگا شہر اور اس میں ایسا سستا دلال

عالی نے یہ انداز دوسرے دوہوں میں بھی برقرار رکھا ہے اور روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ بعض نئے موضوعات کو بھی چھیڑا ہے۔ لندن کے بارے میں دو شعر دیکھیے۔

لندن جس کا شور تھا اتنا نکلا بہار سے خالی
گھومے کیا کیا نار نویلی ٹک ٹک دیکھے عالی
لندن بھی مرے جیون جیسا کچھ دھولا کچھ کالا
تھوڑی دہسکی باقی پانی بھدا انکھد پیالا

میرا خیال ہے کہ جمیل الدین عالی اگر دوہے کے اسی معصوم انداز میں عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل اور نازک حقائق کو چھو سکیں تو بہت جلد مقبولیت کی بلند ترین منزلوں کو بھی چھو لیں گے۔ شاید انھیں خود بھی اس کا احساس ہے ع

نرناری کی باتیں چھوڑو، یہ باتیں ہیں پرانی

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

عکس در عکس

شاعر: خالد رحیم
ناشر: خالد رحیم۔ بخشی بازار، کٹک ۷۵۳۰۰۱
قیمت: بیس روپے

"عکس در عکس" خالد رحیم کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں آزاد غزلوں کے علاوہ ایک حمد، ایک نظم اور کافی تعداد میں پابند غزلیں شریک اشاعت ہیں۔ کتاب کے فلیپ پر وزیر آغا نے اور پیش لفظ کے تحت کرامت علی کرامت نے خالد کی شاعری سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے انفرادی رنگ سخن کی بڑی حد تک نشان دہی کر دیتے ہیں۔ وزیر آغا نے لکھا ہے:

"خالد رحیم کی غزل میں بچپن کی معصومیت اور حیرت بھی ہے اور عہد پیری کی فکری پختگی بھی۔ مگر یہ دونوں رویے لخت حالت میں نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر و بیشتر اس طور یکجا ہوتے ہیں کہ انھیں الگ الگ کرنا بھی ممکن نہیں رہا ہے۔"

کرامت علی کرامت نے اس رنگ سخن کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

"... ان کی شاعری دراصل اپنے گردو پیش کے گہرے شعور و ادراک کی عکاسی ہے اور اس شعور و ادراک کے اظہار کے لیے انھوں نے جو لہجہ دریافت کیا ہے اسے

رومانی معصومیت اور معصوم رومانیت کے ملے جلے آہنگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے:

"ان کی شاعری دراصل اپنے گرد و پیش کے گہرے شعور و ادراک کی عکاسی ہے اور اس شعور و ادراک کے اظہار کے لیے انھوں نے جو لہجہ دریافت کیا ہے، اسے رومانی معصومیت اور معصوم رومانیت کے ملے جلے آہنگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے"۔

میرا خیال ہے کہ خالد رحیم کے منفرد رنگِ سخن کی نشان دہی ان آرا سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی وسیع دنیا کے مسائل اور تجربات سے گہری آگہی کے باوجود ان کے لب و لہجے میں ایک ایسا لوچ، شیرینی اور گھلاوٹ ہے جو ان کے ہم عصروں کے یہاں بہت کم موجود ہے۔ پھر یہ کہ اندازِ فکر اور طرزِ بیان کی ندرت کے باوجود وہ اس ابہام کے کہیں شکار نہیں ہوئے جو بیشتر جدید شاعروں کا مقدر ہیں۔ چند خوب صورت اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک طوفان اٹھا ہے مجھ میں — پھر کوئی ڈوب چلا ہے مجھ میں
یاد آتا رہا میں اسے رات بھر — پھول سے رخ پہ شبنم برستی رہی
اب یہ سازش ہے کہ خوں رنگ ہو موسم کا لباس — سبز پودوں کا سلامت کہیں پیکر نہ رہے
ورق ورق پہ سمندر ہے ڈوب جاؤ گے — کتابِ جسم کھلے گی تو بچ نہ پاؤ گے
دشمنوں کے شہر سے آئے تھے ہم — دوستوں سے مل کے پچھتانے لگے

خالد کے تجربات کی دنیا وسیع ہے اور ان میں اظہارِ خیال کی بہترین صلاحیت بھی ہے اس لیے ان کے تابناک مستقبل کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں۔ صرف ایک بات آزاد غزل کے تعلق سے کہنا چاہتا ہوں۔ برادر محترم مظہر امام اور ان کے بیشمار ہمنواؤں کی پیہم دلیلوں کے باوجود اب تک میں آزاد غزل کی تاثیر اور معنیٰ خیزی کا قائل نہ تھا مگر پچھلے دنوں مظہر امام کے اور اب خالد رحیم کے بعض اشعار پڑھ کر اس صنفِ سخن سے متعلق میری ناامیدی دور ہونے لگی ہے۔ خالد رحیم کی آزاد غزلوں کے دو شعر آپ بھی سن لیجیے:

جانے اس کا حال کیا ہوگا سوادِ شام تک — ایک سورج کی طرح نکلا ہے وہ
وقت سنتا رہا — زندگی دردِ غم کی کہانی سناتی رہے

"عکس در عکس" کی کتابت و طباعت بہت اچھی ہے اور سرورق دیدہ زیب۔ معنی خیز شعری مجموعوں کی آج کل باڑھ آئی ہے مگر خالد رحیم کا یہ مجموعہ ان سب سے الگ اور خوبصورت ہے۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

مثنوی آسمانی خطوط

شاعر: ڈاکٹر محمد یعقوب عامر
پتا: دارالاشاعت ترقی ۳/۱۰/۱۴۱ رام نگر، شاہدرہ، دہلی ۳۲
قیمت: ۲۰ روپے

یہ مثنوی آٹھ خطوط پر مشتمل ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ سب 'آسمانی' ہیں یعنی کہ عالم بالا سے تحریر ہوئے ہیں۔ یہ ایک خاتون کے جذبات پیش کرتے ہیں اور اپنے شوہر کے نام ہیں۔ یہ ضرورت کیوں پیش آئی؟ 'پہلا خط' اس طرف اشارہ کرتا ہے:

لطف دنیا کی ہے کہانی میں　　آئی ہوں میں بھری جوانی میں
دل کے دل ہی میں رہ گئے ارماں　　کیسے کیسے تھے زیست کے ساماں

یہ خط نا آسودہ خواہشات کا مرقع ہے اور شوہر سے والہانہ محبت کا مظہر۔ وہ شوہر کو بہتر اور مطمئن زندگی گزارنے کے لیے اکساتی ہے اور بچوں کی یاد اسے ستاتی ہے۔

دوسرے خط میں "اظہار محبت برملا ہو رہا ہے: آہ مر کے بھی تم پہ مرتی ہوں۔ ہر گھڑی تم کو یاد کرتی ہوں۔ اس خط میں شوہر پرستی کا جذبہ ابھرتا ہے اور مر کر بھی زندگی کا کاروبار شوق نظر آتا ہے: سوٹ اچھا سا ایک سلا لیجیے۔ میرے جہلم پہ خرچ کم کیجیے۔ اور بس اتنی سی فرمائش ہوتی ہے کہ "صرف دو لفظ پیار کے لکھ دو"

تیسرے خط میں رنگ بدلتا ہے۔ بات شروع ہوتی ہے کہ "با مروت ہو' با وفا ہو تم" اور شکوہ شکایت پر پہنچ جاتی ہے:

صرف ایک خط کی بھیک مانگوں گی　　آپ سے اور کچھ نہ چاہوں گی

اس کے علاوہ عام روش کے برخلاف سسرال والوں کی محبت کا اعتراف کیا گیا ہے: نند آکر گلے لگاتی تھی۔ ساس قربان میرے جاتی تھی۔

مگر چوتھے خط میں لہجہ تلخ ہو جاتا ہے اور بات پلٹ سی جاتی ہے۔ اب کہا جا رہا ہے:

آپ کے گھر میں کیا سکوں پایا　　زندگی بھر سبھی نے ٹھکرایا
مجھ کو ان پر ہی چھوڑ جاتے تھے　　آپ دلی میں موج اڑاتے تھے

اس خط میں شوہر کی غفلت شعاری کو دہرایا گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ: یہ شکایت ہے، خیر مت مانو۔ میرے اس خط کو آخری جانو۔ لیکن پانچواں خط پھر آتا ہے: شکوہ بے محل کیا میں نے۔ جو نہ لکھنا تھا لکھ دیا میں نے۔ اپنے پچھلے خط پر اظہار ندامت کے بعد ازدواجی زندگی کے شادکام لمحات کا ذکر کیا گیا ہے اور زمانے کی سنگدلی و عیاری پر چوٹ بھی کی گئی ہے:

رزق خود اب نہ چل کے آئے گا　　جو جھپٹ لائے گا' وہ کھائے گا
نکلو خود اپنی پیروی کے لیے　　کیا ہے مشکل کچھ آدمی کے لیے

اس خط کی غرض و غایت، شوہر کو کارزار حیات میں مستعدی دکھانے کے لیے اکسانا ہے۔
چھٹے خط میں شوہر کے گن گائے گئے ہیں اور ساتھ ساتھ زمانے کی روش پر چھینٹے بھی

موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات کا ذکر بھی ہوا ہے کہ اسے عرش سے فرش پر اپنا وطن دکھائی دیا ہے اور اپنی زندگی کے مناظر سامنے آئے ہیں:

دیکھنی کیا ہوں جیسے جیتی ہوں   اپنے ماں باپ کی چہیتی ہوں

ساتویں خط میں شوہر کو ایک خواب بیان کیا گیا ہے جس میں اس نے شوہر کو نئی بیوی کے ساتھ دیکھا ہے اور دریافت کیا گیا ہے کہ کہیں اس کا یہ خواب ایک حقیقت تو نہیں بن گیا ہے اس کے علاوہ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ عرش پر ہی اس کی ملاقات ساس اور سسر سے ہوتی ہے اور اپنے باپ سے بھی جنھوں نے اس کے سامنے ان سے شکایت کی ہے:

اس نے ہم پر بہت ستم ڈھایا   دوسری بیوی گھر میں لے آیا

آٹھویں خط میں وہ اپنے بھائی کی آمد کا ذکر کرتی ہے اور اس سے اپنے شوہر کی دوسری شادی کا حال سن کر جو ردّعمل ہوتا ہے اسے یوں بیان کرتی ہے:

اب مجھے کچھ رہا نہیں افسوس   میرے بچوں سے وہ ہوئی مانوس
آپ کی اب شریک کار ہے وہ   مجھ سے بڑھ کر وفا شعار ہے وہ

اس خط میں شوہر کو زندگی گزارنے کا حوصلہ دیا گیا ہے۔ آخری شعر یہ ہے:

میری نسبت کی شرم کچھ تو کرو   پھر سے جینے کا عزم کچھ تو کرو

آسمانی خطوط کا خلاصہ بس کسی قدر ہی مثنوی کا تاثر پیش کر سکتا ہے۔ اصل لطف پوری مثنوی پڑھنے سے ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد یعقوب عامر ایک خوش فکر اور بالغ نظر شاعر ہیں۔ انھیں پوری طرح قدرتِ اظہار حاصل ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے بڑی چابکدستی سے ایک شادی شدہ عورت کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے ازدواجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر عورت کا ردّعمل دکھایا ہے لیکن یہ سب کچھ پیش کرنے کے لیے انھوں نے شریکِ حیات کو عالم ارواح میں پہنچا دیا ہے مگر یہ آسمانی خطوط قطعی طور پر وارداتِ ارضی سے پُر ہیں بلکہ انھوں نے حقیقت نگاری کے جوش میں کہیں کہیں ان پر ایسی چھاپ بھی لگا دی ہے جو شناخت پیدا کرتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ تاہم ان کے پُر اثر اور پر خلوص اظہار کی داد تو دینی ہی پڑتی ہے۔

"مثنوی آسمانی خطوط" پڑھ کر شیخ احمد علی شوق قدوائی کی تقریباً ساٹھ سال پرانی مثنوی "عالم خیال" کا معاً خیال آجاتا ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ یعقوب عامر نے اپنی راہ الگ نکالی ہے اور ان کے یہاں غمِ ہجر کے علاوہ اور بھی غم موجود ہیں اور سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ آج کی زندگی کے مسائل بھی پیش ہوتے ہیں۔ ایک نفسیات داں کی طرح اگر تحلیلی ضابطوں کے تحت اس مثنوی کا جائزہ لیا جائے تو شاعر کے انکار و انداز کو سمجھنے، اس کے جہادِ زندگانی کو جاننے، ضابطہ حیات کو پہچاننے اور اس کے موجودہ سماجی زندگی پر ردّعمل کی معنی آفرینی کے لیے اچھا خاصا مواد فراہم ہو جاتا ہے۔ یہ میری رائے ہے، آپ اپنی رائے ضرور قائم کریں لیکن "آسمانی خطوط" پڑھنے کے بعد۔

(عبداللہ ولی بخش قادری)

تجلیاتِ قمر

مؤلف: جمال احمد صدیقی
تقسیم کار: عثمانیہ بک ڈپو ۲۵ا/ رابندر سرانی کلکتہ ۳
قیمت: پندرہ روپے

تجلیات قمر ایک ایسا حسین و دل فریب شعری گلدستہ ہے جس میں گلہائے رنگا رنگ ایک قرینے اور سلیقے سے آراستہ کر دیے گئے ہیں جس سے مؤلف کے ذوقِ جمال اور ذوق سلیم کا پتا چلتا ہے۔ چوں کہ مؤلف جمال صاحب بذاتِ خود ایک با ذوق ادیب ہیں اس لیے انھوں نے ایک بصیرت افروز مقدمہ اور حالاتِ زندگی بھی شامل کر دیا ہے تاکہ شاعر کے عہد و ماحول اور فطرت رجحان و میلان کو سمجھنے میں قاری کو کوئی دقت پیش نہ آئے۔ مؤلف جمال صاحب نے قمر صدیقی مرحوم کی شاعری اور شخصیت کی گہری نقش گری کی ہے۔ جمال صاحب نے قمر صدیقی کے عہد و ماحول اور فکر و فن پر بڑی فکر انگیز خیال آرائی کی ہے۔

یہ حقیقت مسلّم ہے کہ ہر اچھی شاعری نہ محض الفاظ و بیان کی عمدہ تہذیب و تزئین ہوتی ہے اور نہ ہی صرف فکر و خیال کی رنگینی و رعنائی کی عکاس۔ بلکہ اس میں زمانے کے مزاج و رجحان اور تجربات و مشاہدات کی گہری رنگ آمیزی بھی ہوتی ہے۔ قمر صدیقی کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت دونوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ قمر صدیقی نے جس وقت شعر و سخن کی دنیا میں قدم رکھا اس وقت اردو شاعری پر رومانیت و جمالیت کی فضا طاری تھی۔ دوسری طرف وطن پرستی اور حقیقت پسندی کی ترویج و اشاعت شروع ہو چکی تھی۔ ایسی حالت و فضا میں ایک فن کار کا زمانے کے مزاج اور رنگ و آہنگ سے متاثر ہونا ایک فطری امر ہے قمر صدیقی نے بھی عصری رجحانات و میلانات سے گہرے تاثرات قبول کیے اور اپنے قلب و جگر کو تاب و تب عطا کیا اور فکر و فن کو جلا بخشی۔ قمر صدیقی کے معاصرین میں بر دیر شاہدی علاّمہ جمیل مظہری، شاعر کلکتوی، آصف بنارسی، ہجو کلکتوی، محمود طرزی، طاہر رضوی کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ قمر صدیقی نے وحشت کلکتوی سے کسبِ فیض کیا اور تا حیات ان کی قصیدہ خوانی کرتے رہے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر جس میں عقیدت و احترام کا نقش فرکم ہے

کمالِ نکتہ سنجی سے قمر اپنا یہ دعوا ہے
کوئی وحشت کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

یوں تو اس کتاب میں مختلف اصنافِ شاعری یک جا کر دی گئی ہیں یعنی غزلوں، نظموں قصیدوں، قطعات اور حمد و منقبت سے اس کتاب کی زیب و زینت ہے۔ لیکن قمر صدیقی دراصل غزل کے مرد میدان تھے جس میں حسن و عشق، جذب و کیف، کرب و اضطراب اور شیرینی و لطافت کی بیکراں بو قلمونی پائی جاتی ہے اور جسے کلیم الدین احمد نے "نیم وحشی صنفِ سخن" کے نام سے موسوم کیا اور جسے رشید احمد صدیقی نے "اردو شاعری کی آبرو" کہا اور فراق گورکھپوری نے "عطر کا عطر" کہہ کر اس میں "سکون پائے سرمدی" تلاش کی۔ قمر صدیقی نے اس کے آئینے میں حیات و کائنات کی بے شمار رنگینیاں اور رعنائیاں دیکھی ہیں اور قلب و روح کو سکون و راحت

بخشی ہے۔ قمر صدیقی کی غزلوں میں حسن و عشق کی رعنائی بھی نظر آتی ہے۔ تصورات کی رنگینی بھی۔ ان کی غزلیں قوسِ قزح کی طرح مختلف رنگوں کی آئینہ دار ہیں ملاحظہ فرمایئے ؎

ملا نہ ایک بھی شاہد ادا شناس جمال
جو اس نے خلوت رنگیں کو بزم عام کیا

ہو کر رہیں گے غرق خیال نشاط میں
ہم دم نہ لیں گے قطرہ کو دریا کیے بغیر

کسی کے جلوے کا حامل تمام عالم ہے
نظر میں حسن کا منظر کبھی سما نہ سکا

اب نہ وہ عشووں کی شوخی ہے نہ غمزوں کی بہار
بے قراری سے مری ان کو قرار آ ہی گیا

جو ادائیں میں نے دیکھیں ترے لطف بیکراں کی
سمٹ آئیں آرزوئیں مرے دل میں دو جہاں کی

ہیں آنکھوں جلوؤں کی حائل جلوے بھی ہیں انکے گو مائل
یہ بیچ میں تمکیں کا پردہ بیکار گرایا جاتا ہے

موج طوفان خیز سے کشتی کہاں ہے مطمئن
تغیر دریا میں ابھی ہے اور ابھی ساحل میں ہے

قمر صدیقی کی غزلوں میں واردات قلب و جگر کی کارفرمائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ بادہ و ساغر کی زمزمہ سنجیاں بھی اور حقیقت و معرفت کی تجلیاں بھی۔ انھوں نے مختلف چمن سے خوشہ چینی کی ہے اور مختلف رنگوں میں اپنا ایک انفرادی رنگ پیدا کرنے کی سعی کامیاب کی ہے۔

قمر صدیقی کی نظموں میں مناظر قدرت کی جلوہ طرازیوں، شادابیوں اور رنگینیوں کی دلفریب تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہاں فطرت کی قلم کاریوں اور نقش ہائے رنگا رنگ کا چشم بصیرت سے مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں "چمن میں ایک چاندنی رات" "ایک پردہ نشین مغنیہ سے خطاب" اور "ایک حسینہ چمن میں" ان کے جمالیاتی ذوق و شوق، روحانی خیالات

اورجذبات کی پاکیزگی کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہاں وہ جوشؔ اور اختر شیرانی کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں ؎

رخصت نظارہ ہو تو دیکھیے ناز چمن
چاند کے جلوے ہوئے ہیں آئینہ ساز چمن
اکتساب نور سے ہر گل ہے شمع انجمن
ہے نشاط بزم سے معمور اندازِ چمن
پھول نے اپنے کٹورے بھر لیے ہیں نور سے
مہوشی کا راز گویا ہو گیا رازِ چمن

یہی نہیں بلکہ شاعر درس حیات اور اسرار حقیقت پر بھی فکر آرائی کرتا ہے ؎

خستہ دل در پردہ ہیں لیکن ہنسا کرتے ہیں پھول
زندگی کا راز کلیوں سے کہا کرتے ہیں پھول
نغمہ پیرا ہے کچھ اس انداز سے بادِ بہار
شبنم "غمدیدہ روتی ہے ہنسا کرتے ہیں پھول

الغرض اردو شاعری میں قمر صدیقی کی شاعری اور شخصیت ایک خاص اہمیت و انفرادیت کی حامل ہے۔

(ڈاکٹر سید غلام مرتضیٰ)

سحر نما

شاعر : عشرت قادری
پبلشر : مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال
قیمت : پندرہ روپے

بھوپال اپنی گوناگوں خصوصیات کے سبب ادبی دنیا میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

عشرت قادری اسی آسمان کا ایک روشن ستارہ ہے شعری عمر کے لحاظ سے عشرت قادری خاصے سینیر ہیں انھوں نے ترقی پسند تحریک کا بھی اثر قبول کیا ہے اور ان کے مجموعۂ کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید شاعری سے بھی اپنے روابط استوار کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "سحر نما" طویل شعری تجربات کا آئینہ دار ہے۔ نئے اور قدیم نظریات میں رد و قبول کی کشمکش، روایات کا احترام، قدیم روایات کی شکست و ریخت پہ فطری کرب کے ساتھ نئی حقیقتوں کا اعتراف۔ نئے الفاظ و تراکیب کا استعمال نئی علامتوں تازہ زمینوں اور نئے شعری رجحانات سے واقفیت نے عشرت قادری کی فکر کو بصیرت شعور کو گہرائی اور لہجہ کو وسعت سے ہمکنار کیا ہے۔ درج ذیل اشعار میرے خیالات کی تائید کریں گے۔

پھر آئی شام وہ یادوں کے قافلے اترے — تمام شب ہے سفر کا عذاب آنکھوں میں
ہمیں ہیں وہ جنھیں آئی ہے زندگی کی ادا — سلگ رہے ہیں دل و جاں دماغ روشن ہیں

سو گئی رہگذر کوئی دریچہ نہ کھلا　　وادیٔ شب میں بھٹکتی ہے صبا آوارہ
ہوں میں گونج رہی ہیں جو درد کی ٹیسیں　　دہک رہے ہیں شرارے مری نواؤں کے

مجھے امید ہے کہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے شائع ہونے والی یہ کتاب اردو ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ثابت ہوگی۔　　(خالد محمود)

نقوش ہستی

شاعر : ذکی تالگانوی
ناشر : ذکی منزل، محلہ سوتھ، بدایوں
قیمت : چوبیس روپے

ذکی تالگانوی کا شعری مجموعہ "نقوش ہستی" فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔
شاعر کا مقطع ہے :

داماں ابر میں جو ذکی مل گئی پناہ　　رنگِ کلام اور بھی اپنا نکھر گیا

اس اعتراف کی توجیہ یہ ہے کہ ذکی نے سحاب سخن مولانا ابر احسنی گنوری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو کر شعری محاسن و معائب کی پرکھ کی تھی۔ عروض و بیان کے نکات سے واقفیت بہم پہنچائی تھی چنانچہ قارئین کو "نقوش ہستی" کا مطالعہ کرنے پر محسوس ہوگا کہ یہ شعری مجموعہ معائب شعری سے بہت بڑی حد تک پاک و صاف ہے۔

"نقوش ہستی" میں قطعات، شگوفہ، تضمین بر غزل مولانا ابر احسنی گنوری اور چند عقیدت مندانہ نظمیں درج ہیں۔

اس گوناگوں سرمایہ کے علاوہ غزلیات کا خزینہ نقوش ہستی کی دین ہے۔

خارجی کیفیات کا انسان کی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ اس کی داخلی زندگی اور گرد و پیش کا رنگ بدل جاتا ہے یہاں تک کہ مظاہر فطرت کے آثار و قرائن بدلے نظر آتے ہیں۔

کوئی تسکین دل کا سہارا نہیں　　شام غم چرخ پہ کوئی تارا نہیں

اب اس کی متضاد صورت دیکھیے :

کسی کا جلوۂ رنگیں اگر نگاہ میں ہو　　قدم قدم پہ چمن آدمی کی خاطر ہیں

(سیفی پریمی)

سات سمندر

شاعر: بدیع الزماں خاور
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ دریا گنج۔ دہلی ۲
قیمت: بیس روپے

بدیع الزماں خاور کے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ تازہ شعری مجموعہ "سات سمندر" نئی آب و تاب اور نئی تاب و تب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ مجموعہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں "سات سمندر کا شاعر" کے عنوان سے حرمت الاکرام کا خاور کی غزل گوئی پر مختصر

مگر جامع تبصرہ موجود ہے مقدمہ ڈاکٹر خلیق انجم، دیباچہ ڈاکٹر گیان چند جین، اور پیش لفظ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کے علاوہ قمر رئیس، عنوان چشتی اور مظہر امام کی آرا بھی شامل ہیں۔ یہ ایوان ادب کے سر برآوردہ ستون ہیں جنھوں نے مختلف جہتوں سے خاور کی شعری صلاحیتوں کو پرکھا اور "سات سمندر" کی غزلوں پر نقد و تبصرہ کرنے کے بعد جدید شعرا میں ان کے مرتبے کا تعین کیا ہے۔ خاور دورِ جدید کے نامور شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری عصری حسیت اور مادرائی قوت کے ساتھ بھرپور ارضیت کی عکاس ہے۔ اسلوب میں روانی، شستگی اور سادگی میں ترنم موجود ہے۔ خاور اردو شاعری کی واحد آواز ہے جس نے ارضیت کے خمیر سے اشعار کی تشکیل کی ہے۔ رنجبل جذبات کی عکاسی میں Poetic Frenzy کی حد تک خاور شہرت رکھتے ہیں۔ تہ داری فرسودگی کی جگہ نیاپن اور ناآسودگی کی جگہ آسودگی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ وہ ماحول اور سماج و معاشرہ کے کبھی شاکی نہیں رہے۔ بلکہ فرد کی اصلاح کو سماج و معاشرہ کی اصلاح پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کوشش میں بقول ڈاکٹر خلیق انجم تخلیقی حسن تو نہیں لیکن زندگی کے تلخ حقائق کا شاعرانہ اظہار ضرور ہے۔" چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

لے کے مٹی کا بدن پار اترنا ہوگا دشت کے بعد سمندر سے گذرنا ہوگا

میں اس کا بندۂ کمزور ہوں مگر مجھ سے ملائکہ سے بڑے کام وہ کراتا ہے

شب کو جلتا ہوں شمع کی صورت دن کو سورج سا جگمگاتا ہوں

بے تحاشا پیار کی دولت لٹائی عمر بھر دوستی کا ہم نے کچھ انجام سوچا ہی نہیں

سات سمندر پی بیٹھا ہوں پھر بھی پیاسے کا پیاسا ہوں

رخصت ہوا تھا چھوڑ کے گھر اپنا گاؤں میں لوٹا تو گاؤں میں نہ پتا میرے گھر کا تھا

کوئی دل ہو ہر دل سے ہے ربط میرا کسی کی دعا ہوں، کسی کی فضا ہوں

بھلا کیوں نہ ہو طرزِ اظہار میرا میں خاور نئے دور کا ترجماں ہوں

نہ وہ جھکے گا نہ میں اپنی ہار مانوں گا مرا حریف ہے مغرور تو میں خودسر ہوں

مجموعی طور پر "سات سمندر" کا شاعر خاور اپنے دور کا قدآور فن کار ہے جسے اپنے ماحول اور معاشرے

کی بھرپور آگہی ہے اور اپنی ارضیت پر وہ اتراتا ہے مگر یہ غرور خودسری نہیں کہا جا سکتا۔

نہ چھوڑے گی مجھے مٹی نہ میں مٹی کو چھوڑوں گا
ہے کتنا دل ربا مٹی سے یہ پیمان مٹی کا

ڈیمائی سائز میں رنگین گیٹ اپ اور خوب صورت کتابت وطباعت سے آراستہ خاور کی غزلوں کا یہ تازہ مجموعہ "سات سمندر" نعمانی پریس دہلی سے زیر اہتمام پریم گوپال متل جنوری ۸۲ء میں ایک ہزار کی تعداد میں پہلی بار منظر عام پر آیا جسے مختلف مکتبۂ فکر نے پرکھنے کے بعد خاور کو نئے آہنگ اور نئی آواز میں کام کی چیزیں پیش کرنے پر مبارک باد سے نوازا۔ ان ماہرینِ فن نے اپنی تہنیتی آراء دے کر واقعی خلوص دل سے شاعر کی ہمت افزائی کی ہے۔

(سید حسن عباس گوپال پوری)

انتخاب کلیات ریاض خیرآبادی

مرتب: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں
ناشر: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں۔ ۶۵۰ بالدہ روڈ پہلی گلی نشاط گنج۔ لکھنؤ ۶
قیمت: سولہ روپے

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں کو کون نہیں جانتا۔ انھوں نے ریاض خیرآبادی پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ حالاں کہ وہ ریاضی کے لکچرار ہیں۔ ان کی تصانیف ریاض خیرآبادی (حیات وادبی خدمات)، اعتبار الملک مضطر خیرآبادی وغیرہ شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی ایک دستاویزی فلم ریاض خیرآبادی پر لکھنؤ ٹی وی سنٹر سے آچکی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے ادبی مضامین اکثر و بیشتر ملک کے ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

انتخاب ریاض۔ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔ یہ ریاض خیرآبادی کے ضخیم دیوان ریاض رضواں کا معیاری انتخاب ہے جس میں دو سو تیئیس ۲۲۳ غزلیں شامل ہیں۔ شروع میں مصنف نے ریاض خیرآبادی کا سماجی وادبی خاکہ کھینچا ہے اور حیات کا تذکرہ کیا ہے۔ مقدمہ میں ریاض کے ہر ادبی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی شاعری (عشقیہ، طنزیہ، واقعاتی فطری، خمریہ) پر الگ الگ ان کے اشعار کا حوالا دیتے ہوتے تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ تبصرہ بڑا جامع اور مدلل ہے۔ یہ ایک خوش باشی اور خوش فہمی کا مجموعہ ہے جو تھوڑی دیر کے لیے آلام زندگی سے بالکل الگ کر دیتا ہے:

رات دن بزم میں دور رہتے گلفام چلے
دور تجھ سے جو مری گردش ایام چلے

ہم تو خدا پرست بھی تھے بت پرست بھی
ہم کو ریاض شیخ و برہمن نے کیا کہا

پینے آئیں تو فرشتہ خو ریاض
حور کے دامن میں چھانی جائے گی

تصنیف کی باطنی صورت کے ساتھ ظاہری صورت بھی خوش نما ہے۔ کاغذ بھی اعلا درجہ کا ہے

لیکن کتابت کی غلطیوں سے گریز نہیں کیا جا سکا۔

کھل گیا باب ریاض فردوس آکے سب بادۂ تسنیم پئیں۔

(امیر علی جونپوری)

مسدّس عالی

شاعر: سریر کابری مینائی
ناشر: سید محمد داؤد اختر کابری۔ سدیر منزل کریم گنج۔ گیا (بہار)
قیمت: پانچ روپے

سرّیر کابری ایک مسلم الثبوت شاعر گذرے ہیں جو امیر مینائی اسکول کے ایک نمائندہ شاعر ہیں۔ امیر مینائی کے دو اہم تلامذہ یعنی کوثر خیرآبادی اور جلیل مانک پوری سے آپ مستقل مشورۂ سخن کرتے رہے۔ اس لیے آپ کی شاعری پر امیر مینائی کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کے باوجود آپ کی جدت طبع اور فکر دور رس نے ہمیشہ اظہار خیال کی نئی راہیں نکالی ہیں اور نادر موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ "مسدّس عالی" بھی اگرچہ اپنے نام کے لحاظ سے ایک تقلیدی نوعیت کی تصنیف معلوم ہوتی ہے لیکن موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک نادر چیز ہے۔ یہ مسدّس حصول آزادی کے بعد ملک میں پھیلی ہوئی بدامنی انتشار اور خرابیوں سے متعلق ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر اس مسدّس کی اشاعت خود سریر کابری کی زندگی میں ہوتی تو ان پر ہتک عزتی کا ایک نہ ایک مقدمہ ضرور دائر ہو جاتا۔

یہ طویل نظم مسدّس حالی کی طرز پر لکھی گئی ہے لیکن حالات کی براہِ راست عکاسی کے علاوہ فن پر مکمل گرفت کے سبب اس میں "مسدس عالی" سے زیادہ لطفِ بیان ملتا ہے۔ آزادیٔ ہند کے بعد ہندستانی معاشرے کے مختلف شعبوں مثلاً عدالت، ریلوے، اسپتال، پولیس اور تعلیم وغیرہ میں پیدا ہو جانے والی مختلف خرابیوں کا اس میں بڑا بے باک اور دلچسپ بیان ملتا ہے۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن سے ہم پہلے بھی دو چار تھے اور اب بھی دوچار ہیں لیکن جن کو برسرِعام کہنے کی جرأت پہلے بہت کم فن کاروں میں پائی جاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ طویل نظم اپنی موجودہ شکل میں نامکمل ہے۔ ادیب حسن آدیب کے لکھے ہوئے "عرض حال" میں کہیں اس نکتے کی وضاحت بھی نہیں ملتی کہ نظم اسی قدر کہی گئی ہے یا کچھ حصہ حذف کرکے شائع کی گئی ہے بہرحال نظم کے جتنے بند شریکِ اشاعت ہیں وہ بھی بہت خوب ہیں۔

اس طویل مسدّس کے علاوہ پیش نظر کتاب میں ۷ نظمیں، سترہ غزلیں اور بارہ قطعات و رباعیات ہیں۔ نظموں میں موضوعات کا تنوع مختلف عنوانات مثلاً ناصرہ، تنزیل کعبہ، جمہوریت لڑکیاں اور مغربی تعلیم، رکشا والا، تبسم کا آنسو، اتحاد و اتفاق، نئے سال کا ساقی نامہ، وغیرہ سے ظاہر ہے لیکن یہ تنوع ان کے یہاں پائی جانے والی فنی پختگی اور لطافت کو متاثر کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سریر صرف سماجی ناہمواریاں کی نقاب کشائی کو ہی اپنی نظموں کا مقصد قرار دیتے تو زیادہ

کامیاب اور مقبول ہوتے کیوں کہ بقیہ نظموں میں خیالات فرسودہ ہیں اور اندازِ بیان کی پختگی زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے سکی ہے۔ جہاں تک غزلوں کا سوال ہے سرور نے روایتی رنگ میں بھی خوبصورت اشعار کہے ہیں اور نئے رنگ میں بھی۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ تم کو جو نہ چاہوں تو بتا دو کسے چاہوں — کیا تم سا زمانے میں کوئی اور حسیں ہے
؎ کون مجھ کو عدم آباد میں لے جائے گا — روح تو جسم کی پوشاک اتار آئی ہے

نظموں اور قطعات میں بعض جگہوں پر سرور حدِ اعتدال سے بڑھ گئے ہیں۔ مثلاً
کون پوچھے گا انھیں یوں ہی پڑی رہ جائیں گی — لڑکیاں ہو جائیں گی ایک دن سڑے کتے کی لاش

ایک بازاری سے پوچھا کیوں ہے تو روپوش آج
دنگ تھی دنیا تری جلوہ گری کے سامنے
مسکرا کر ناز سے بولی کہ اے بندہ نواز
کون پوچھے گا مجھے کالج پری کے سامنے

بہر حال ایسی مثالیں بہت کم ہیں البتہ ان اشعار کو شریکِ اشاعت نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ مجموعی طور پر "مسدس حالی" کا مطالعہ ہر صاحبِ ذوق کے لیے لطف انگیز ہوگا۔ قیمت مناسب ہے۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

شب آہنگ

شاعر: سید شاہ حسین نہری
پتا: ایم پبلیکیشنز، منظور پورہ اورنگ آباد
قیمت: دس روپے

آج کی اردو شاعری فرد کے المیے کی شاعری ہے جہاں عقائد اور سماجی بندھنوں کا رشتہ مبہم ہے۔ سید شاہ حسین نہری کی شاعری کا خمیر عقائد اور سماج کے اسی ابہام کا آفریدہ ہے۔ اسی لیے ان کی تشکیک زدہ شاعری میں یقین کے عناصر بھی اپنی معنویت میں تذبذب کا ایک ایسا منظر نامہ پیش کرتے ہیں جہاں سب کچھ کسی دھند میں کھویا ہوا ہو۔ ان کے یہاں غزل کی زمین زندگی کی بے چہرگی۔ کربِ ذات اور صداقت کے توہمات کی شاعری ہے جہاں وجود کا احساس گم ہے اور زندگی کی تکمیل کی راہیں مبہم ہیں لیکن سفر مسلسل ہے۔ دو شعر مثال کے طور پر ملاحظہ کیجیے:

روشنی کہتے ہیں کہ اب گم ہے
اپنے ہونے کی اک سبب گم ہے

رغبتیں، خواہشیں، امیدیں، میں
راستے اس قدر ہیں، رکنا کیوں

دراصل شاہ کی شاعری کا خمیر جدید دور کے اس ہمہ گیر المیہ کا زائیدہ ہے جہاں ذات اور

ذات کی تفہیم، زندگی کا مقصد ہوتے ہوئے بھی، فرار کی راہیں انسان کی آرزوؤں کا مسکن بن جاتی ہیں، یعنی انسان یقین اور وہم کے درمیان اپنے احساس کو معلق رکھتا ہے دراصل شاعری کا وصف گزشتہ سے آئندہ تک حال کی دہلیز پر تفکر اور جذبے کے صادق جذبے کا آفریدہ ہوتا ہے کہ اس میں شعور اور لاشعور کی کرنیں، جو مدوجزر پیدا کرتی ہیں اسی وجہ سے ابلاغ کے سانچے ڈھلنا شروع ہوتے ہیں۔ شب آہنگ کی شاعری ہیں شاہ حسین نہری اعتبار اور تکنیک کے مدوجزر میں اپنے احساس کی خواب آلود فضا میں خود کلامی کرتے ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ چند اشعار اس بات کے ثبوت کے لیے:

سر بہ دامانِ ہوا یہ کیا ہے
پا بہ زنجیر صدا یہ کیا ہے
ذات کے پاس امانت میری
اور میں صبح، خدا! یہ کیا ہے

منظروں کی نشانی ہیں ہے
جیت کس کی کہانی ہیں ہے
ٹوٹتے بلبلے، دائرے
اور کیا چیز پانی میں ہے

جانا بوجھا سوال کب تھا
سوچا سمجھا جواب کب ہے

ایسے ہی احساسات سے ان کی نظمیں بھی آراستہ ہیں۔ ان کی نظموں کا خاص وصف احساس کی لہروں پر خیالات کی ایسی روشنی ہے جنھیں وہ لفظوں کے دروبست اور اتار چڑھاؤ سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی ایسی نظموں میں سب سے اچھی نظم "انفجار" ہے اور دوسری نظمیں "دائرہ"، "اپنے آپ میں" اور "باب الفتح" ہیں۔

امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ ان کی شاعری ارتقاء کے تابناک زینے طے کرے گی اور شاہ حسین نہری اپنا بلند مقام بنا سکیں گے۔ کتاب کی طباعت اور گیٹ اپ دیدہ زیب ہے۔

(باذل عباسی)

منتشر خاکے

مرتب: شبیر اقبال؛ نورانی نور
پتا: ناظم پبلیکیشنز ۲۵۲۲۔ مادھوپورہ دھولیہ (مہاراشٹر)
قیمت: بارہ روپے

زیر نظر کتاب دھولیہ (مہاراشٹر) کے شعرا کا انتخاب ہے جس میں ۱۹۲۰ء کے آس پاس سے

۱۹۴۰ء کے لگ بھگ پیدا ہونے والے شعرا کا انتخاب شامل ہے اور تقریباً چوبیس شعرا کی پانچ پانچ غزلوں کا انتخاب اور ان کے مختصر حالاتِ زندگی درج کیے گئے ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں دھولیہ کے شعرا کی ایک ردیف وار فہرست بھی دی گئی ہے جس میں تقریباً ایک سو شعرا کے نام شامل ہیں اور اس فہرست کو بھی نامکمل قرار دیا گیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں شبیر اقبال نے "شہر دھولیہ کی علمی، ادبی و شعری حیثیت" کے عنوان سے ایک مبسوط مقدمہ میں مختصراً اس شہر کے علمی و ادبی پس منظر میں اس کی تاریخی و تہذیبی بنیادوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ انجم نوقی بدایونی نے اپنی تصانیف "راز کہکشاں" اور "سلک پروین" میں دھولیہ کے شعرا کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن ایک ایسی تصنیف کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے جس میں شعرا کا تعارف ان کے حالات اور نمونۂ کلام شامل ہوں لہٰذا یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔

ان میں سے اکثر شعرا پر دہلی اور لکھنؤ اسکول کا اثر نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان شعرا نے جہاں اساتذہ کا تتبع کیا ہے وہیں خیالات کی رنگارنگی نے انھیں اپنے عہد سے بیگانہ نہیں رکھا اور ان شعرا میں ایک نئی لہر اور نیا آہنگ پیدا کر دیا۔ ان شعرا نے زبان و بیان کی نفاست اور نزاکت کا صرف خیال ہی نہیں رکھا ہے بلکہ اساتذہ کا، اور ساتھ ساتھ اردو زبان کی ساکھ اور بھرم بھی قائم کیا ہے۔ ان شعرا کے کلام سے چیدہ چیدہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

فصیل کرب کے سائے میں لا کے چھوڑ دیا
پھر اس کے بعد زمانے نے حوصلہ نہ دیا — سعید عقاب

لگتا ہے جلد پھر یہاں
آئے گا انقلاب سا
اک چہرہ اس زمین سے
ابھرے گا آفتاب سا — سعید عقاب

طلسم خواب تو ٹوٹا خدا خدا کر کے
نہیں سحر تو قریبِ سحر ہی کیا کم ہے — شفیق احمد راز یزدانی

نہیں معلوم کہ یہ رات کہاں تھی دن بھر
صبح کو نکلی ہوئی شام کو گھر آئی ہے — حنیف انصاری

اک صبح جہاں تاب کو مقصود بنا لو
سورج کو سیہ رات کی دلدل سے نکالو — شعبان زاہدی

غم کا جھونکا تو مرے گھر کی طرف سے گزرا
اترا اترا ہے ترے شہر کا چہرہ کیسے — عاجز پرتاپ گڑھی

ان اشعار سے جدتِ فکر اور جدید طرزِ اظہار کا پتا لگتا ہے کہ ان میں تازہ کار استعارے اور علامتوں کا استعمال ہوا ہے۔ لیکن خالص غزل کی زبان بھی ان شعرا کے یہاں بڑی چابکدستی سے نظر آتی ہے اور اس میں خیال کی نزاکت اور اظہار کی ندرت کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

نکلی کبھی چمن میں جو برقِ شرر کی بات
تازہ سی ہو گئی مرے برباد گھر کی بات — راز مشرقی

فیضِ آزادی کے کیا کیا خواب دیکھے تھے مگر
زندگی سہمی ہوئی ہے خواب کی تعبیر سی — عبدالمنان پرواز

یہ محرومی! وہاں سے بھی میں خالی ہاتھ لوٹا ہوں
جہاں سے لوگ خالی ہاتھ لوٹائے نہیں جاتے — شعبان زاہدی

تخلیقِ کائنات کا جن پر مدار تھا
وہ پیکرِ خلوص وہ انسان! کیا ہوئے
انسانیت کے نام پہ نکلے تھے جو کبھی
اے تاجدارِ ذنت وہ فرمان کیا ہوئے

امید ہے کہ یہ کتاب اہلِ ادب کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی — (باذل عباسی)

موسم زرد گلابوں کا

شاعر: شاہد میر
پبلشر: نکھار پبلی کیشنز۔ مئو ناتھ بھنجن۔ (یوپی)
قیمت: پچیس روپے

شاہد میر کو شاعری ورثہ میں ملی ہے، اس کے والد میر عرفانی سرونج کے مقبول شاعر تھے۔ دادا عاجز میر بھی شاعری کرتے تھے لیکن جن کے فیضِ تربیت نے شاہد میر کی شعری صلاحیتوں کو جلا بخشی وہ اس کے نانا "فخرِ مالوہ" عرفان محمد خاں ناطق مالوی کی ذاتِ گرامی تھی۔ شاہد اپنے بچپن میں ترنم کے ساتھ نانا کی غزلیں مشاعروں میں سنا سنا کر دونوں کے لیے داد وصول کرتا تھا یہیں سے موسیقی اور شاعری دونوں کا شوق پروان چڑھا اور شاہد میر کو خوش گلو و خوش فکر شاعر بنا گیا۔ آج اردو زبان کے تقریباً ہر ادبی رسالے میں شائع ہونے والا یہ مقبول شاعر اپنا شعری مجموعہ ــــ

"موسم زرد گلابوں کا" بازار میں لایا تو مجموعہ دیکھ کر غصہ بھی آیا افسوس بھی ہوا کتابت، طباعت، کاغذ، سرورق غرض کتاب کی اشاعت کا کوئی حصہ کوئی گوشہ اس کے شایانِ شان نہ تھا۔ یہی افسوس مجھے اپنے ایک دوسرے پسندیدہ شاعر ظفر صہبائی کا شعری مجموعہ "دھوپ کے پھول" دیکھ کر ہوا تھا۔ آج کے دور میں جب کہ اکیڈیمیوں کی معاونت کا بازار گرم ہے۔ گئے گزرے شاعر بھی اچھی خاصی کتاب چھاپ لیتے ہیں۔ قاری کا مزاج "آفیسٹی" ہو گیا ہے نگاہیں جاذب نظر کتابوں کی متلاشی رہتی ہیں اور پھر شاہد میر تو بڑا پیارا شاعر ہے۔

آج کل ہر شاعر میں روایت اور جدت کا سنگم تلاش کر لینا تنقید کا فیشن سا ہو گیا ہے لیکن کسی کو یہ سنگم دیکھنا ہی ہے تو شاہد میر کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ مترنم بحروں اور مشکل زمینوں میں احساسات کو چھو لینے والے اشعار شاہد کے مجموعے میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ جذبہ کی تیز آنچ کو شاہد حد سے تجاوز کرنے سے روکتا ہے اس کے کلام میں "پاسبان عقل" دل کو تنہا چھوڑنا بھی ہے تو بے راہ روی کی اجازت نہیں دیتا۔ خیالات کی پاکیزگی، فکر کی بلندی، جذبے کی لطافت اس کے اشعار کی غذا ہیں، الفاظ کی خوش انتخابی اور ترتیب و تہذیب نے کلام میں چستی اور روانی کے ساتھ موسیقیت پیدا کر دی ہے۔ تجربات و مشاہدات کی وسعت، فکر کی بلندی، فکر کی گہرائی اور فن کی تازہ کاری نے اشعار کی دلنوازی میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خوابوں کی انجمن میں ہر اک شے حسین تھی
جاگے تو اپنے پاؤں کے نیچے زمین تھی

شکستہ حال اشک ریز دل فگار آدمی
ملاحظہ ہو یہ خدا کا شاہکار آدمی

تو بڑی خوبیوں کا مالک ہے
کوئی خامی تلاش کر مجھ میں

تمہارے شہر کا یارو رواج کیسا ہے
کہ پوچھتا نہیں کوئی مزاج کیسا ہے

ایک رات کا حصار ہے اب اس کے اردگرد
جو دیکھتا نہ تھا کوئی منظر سوائے سبز

کوہ و بن دشت و در مہربانی میں تھے
پاؤں لیکن ہمارے روانی میں تھے

دامن خزاں سے ہم نے چھڑا تو لیا مگر
شاخوں کے ٹوٹنے کی صدا ساتھ ہو گئی

پہلے تو چھین لی مری آنکھوں کی روشنی
پھر آئینے کے سامنے لایا گیا مجھے

شبنم کے اشک سبزہ و گل پر بکھر گئے
بھیگا ہوا ہے صبح کا اخبار جا بجا

کہتے ہیں ہر شاعر کو اپنے کلام میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ خوبیاں نظر آتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو ہم عصروں سے ممتاز اور اپنے اشعار کو ان کے اشعار سے بہتر سمجھتا ہے۔ مجھے شاہد میر کی شاعری پہ ایسا گمان گزرتا ہے جیسے یہ اشعار میرے ہیں اور میں نے کہہ کر شاہد میر کو دیے ہیں — مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے تعاون سے شائع ہونے والی اس کتاب کو دیکھ کر اپنائیت کے اسی احساس نے مجھے طباعت کی شکایت پر مجبور کیا ورنہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اگر کوئی شخص نئی نسل کے دو چار شعری مجموعے پڑھنا چاہتا ہے تو اسے "موسم زرد گلابوں کا" بھی اپنے انتخاب میں شامل کرنا چاہیے۔

(خالد محمود)

خود کلامی

شاعر: اظہر عنایتی
پتا: اظہر عنایتی، شیخ کا پھاٹک، رام پور
قیمت: پندرہ روپے

اظہر عنایتی ہمارے ان معدودے چند غزل گویوں میں سے ایک ہیں جو مشاعروں کے مقبول شاعر بھی ہیں اور ادبی حلقوں میں بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ ان کی ادبی کاوشیں دو دہائیوں سے اردو رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں لیکن "خود کلامی" موصوف کا پہلا مجموعہ کلام ہے اور یہ تھم تھم کر قدم اٹھانے کا انداز ہی بتاتا ہے کہ شاعر سوچ سمجھ کر، ڈوب کر اور رچا بسا کر شعر کہنے کا عادی ہے۔ چنانچہ اس محتاط رویّے اور مسلسل ریاض کی ذہن وہ رلبودگی ہے جو ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ نمونے کے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

راستو! کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

ہوا سے ہی سہی، کھلتا تھا اکثر
مجھے بھی اک دریچہ دیکھنے کو

نسبِ خون جس پہ مارنے بیٹھے ہیں چند لوگ
وہ شخص چوڑیاں تو پہن کر نہ آئے گا

میں تو لاشیں بھی گنا دوں لیکن
بدمزہ ظلِّ الٰہی ہوں گے

اظہر جو قتل ہو گیا وہ بھائی تھا مگر
قاتل بھی میرے اپنے قبیلے کا فرد ہے

ان اشعار میں جو کسک، کھٹک اور کیفیت ہے، طنز کی کاٹ، زبان کی صناعی، مشاہدے کی وسعت اور جذبے کی شدت ہے، اہلِ نظر یقیناً محسوس کر سکیں گے۔ اظہر عنایتی نے زندگی کو ڈوب کر دیکھا اور اپنے ہاتھوں برتا ہے اسی لیے ان کے تجربات تازہ اور تخیل نادرہ کار ہے۔ محشر عنایتی جیسے استاد نے انھیں رموزِ فن اور بات کہنے کے آداب سکھائے ہیں اور ان سب باتوں نے مل کر واقعی ان کے کلام میں وہ لطف و ذائقہ پیدا کر دیا ہے جس سے انفرادیت کی راہیں پھوٹتی ہیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ وہ اس راستے پر دور تک جائیں گے۔ انھیں کا شعر ہے ؎

ذہنوں میں آفتاب روی ہو تو سوچیے
تاریک راستوں پہ کہاں تک میں جاؤں گا

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

حدیثِ خواب

شاعر: عبدالعزیز خالد
پتا: مقبول اکیڈمی چوک ۱۶۱ انارکلی لاہور (پاکستان)
قیمت: اڑتالیس روپے

"حدیثِ خواب" درجنوں شعری مجموعوں کے خالق کا نیا مجموعہ کلام، جس میں ان کی ۶۵ تازہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ عبدالعزیز خالد کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں ہندستان کے کرشن موہن کا خیال آتا ہے شاید اس لیے کہ دونوں محکمہ انکم ٹیکس کے افسر رہ چکے ہیں۔ دونوں کے درجنوں شعری مجموعے نہایت اہتمام اور سلیقے سے شائع ہوتے ہیں۔ دونوں نے زبان کے

استعمال میں بڑی فراخ دلی کے ساتھ دوسری زبانوں کے الفاظ کی پیوندکاری کی ہے اور دونوں کے یہاں تلمیحات کی کثرت ہے۔ فرق یہ ہے کہ کرشن موہن کی تلمیحات بیشتر ہندو دیومالا سے آئی ہیں۔ اور خالد ہندو دیومالا کے علاوہ قصص الانبیا، توریت، انجیل، یونانی غنیمات سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ پاکستان میں کئی نقاد عبدالعزیز خالد کو اسلامی شاعر کہتے ہیں شاید اس لیے کہ ان کی غزلوں اور نظموں میں حمدیہ و نعتیہ اشعار کی کثرت ہے۔ عبدالعزیز خالد کے مطالعے کی وسعت اور زبان پر مضبوط گرفت خاصی متاثر کرتی ہے۔ ذرا یہ اشعار دیکھیے:

ہوگا کفار کو معلوم لمن عقبی الدار — اذ یُدعّون الی نار جہنم دعّا
من تفکّر البصر خالد — فکر دل کا چراغ ہے گویا
کنک لتا سی میں واسو دتّہ تو آدریں — تجھے مدن کہے دنیا مجھے مدھوبالا
طروب و سارہ، تماثیل، وخیزران وقلم — قضیب و بذل و حیات النفوس و مرجانہ

مقام شکر ہے کہ خالد اشعار میں زیادہ تر سنسکرت، فارسی اور عربی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور محض تلمیحات عبرانی اور یونانی سے لیتے ہیں ورنہ وہ یہ زبانیں بھی استعمال کرنے پر قادر نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس نوع کی شاعری فرہنگ و لغات کی مدد سے ہماری معلومات میں خواہ کتنا ہی اضافہ کرتی ہو، ہمارے شعری سرمائے میں اس سے کوئی اضافہ ہونے والا نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ عبدالعزیز خالد سیدھا سچا شعر کہنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں کاش وہ اپنے مندرجہ ذیل اشعار جیسی شاعری زیادہ کر سکیں:

تاج دے، دولت دے لیکن دل نہ دے
بیچ دے ہر چیز عزت کے سوا
ہر آدم کے بیٹے کی ہے ایک قسمت
وہ دولت ہو عورت ہو شہرت کہ طاقت
میں مثل تاروں کے شب بھر سفر میں رہتا ہوں
میں منتظر ہوں مگر انتظار ہے کس کا

یہ اور بات ہے کہ مجھے اس مجموعے سے یہ تین عام فہم اشعار تلاش کرنے میں خاصی محنت اٹھانی پڑی ہے۔
(مظفر حنفی)

صہبا و سمن

شاعر: محشر عنایتی
پتا: اظہر عنایتی، پیپر شیخ، رام پور
قیمت: پندرہ روپے

محشر عنایتی مرحوم کی غزلیہ شاعری کا دور ۱۹۲۲ء لغایت ۱۹۷۵ء یعنی تقریباً چوّن سال کی مدت میں پھیلا ہوا ہے اس طویل عرصے کی شعری تخلیقات کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے کافی وقت درکار ہے۔ البتہ صہبا و سمن، کی غزلیہ شاعری کے غالب عناصر کی طرف چند اشارے ضرور کیے

جا سکتے ہیں۔

محشر عنایتی کی شاعری کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے ہاں زبان اور جذبے کا حسین امتزاج ہے انھوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور جس زمانے میں شاعری کی ابتدا کی اس زمانے کا رام پور نظام رام پوری، داغ دہلوی اور امیر مینائی کی شاعری کا وارث تھا جہاں زبان کی صفائی، محاوروں کا برمحل استعمال اور معاملہ بندی ہی غزل کی امتیازی خصوصیات تصور کی جاتی تھیں اس لیے محشر عنایتی کی ابتدائی غزلیہ شاعری میں مذکورہ بالا صفات کا در آنا ناگزیر تھا لیکن یہ بات کم طمانیت بخش نہیں کہ انھوں نے اساتذۂ شعر کے بتائے ہوئے راستوں پر آنکھ بند کر کے چلنا پسند نہیں کیا۔

اپنے زمانے کے ادبی، سماجی اور سیاسی رجحانات سے کوئی حساس ادیب یا شاعر دامن نہیں بچا سکتا اس لیے محشر صاحب نے بھی مکمل طور پر تو نہیں البتہ جزوی حیثیت سے یقیناً نئے انداز کے شعر بھی کہے اور اپنے اشعار کی وساطت سے اپنے عزائم کا اعلان بھی کیا فرماتے ہیں۔

کچھ تو فطرتاً ہم خود سختیوں کے عادی ہیں کچھ فضول رسمیں بھی زندگی پہ لادی ہیں
پائمال رستے پر ہر قدم نہ اٹھے گا جاؤ قافلے والو! ہم تو اجتہادی ہیں
کارواں کو جانے دو آؤ ہم بچھڑ جائیں ہم بھٹکنے والوں کی راہ بھی نئی ہوگی

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ کوئی بڑا شاعر یا ادیب اپنے دور کے ادبی سیاسی اور سماجی عوامل سے چشم پوشی نہیں کر سکتا اس لیے محشر عنایتی کی شاعری میں بھی سیاسی اور طنزیہ مضامین کا در آنا ناگزیر سی بات تھی — جو شخص سالہا سال استاد فن کی حیثیت سے مسند نشین رہا ہو جس نے عمر بھر سیکڑوں مقامی اور بیرونی مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دیے ہوں جس نے برسوں رام پور کے مشہور روزنامہ "ناظم" کا منصب ادارت سنبھالا ہو اور جس کے لاتعداد تلامذہ برصغیر کے دور دراز علاقوں میں موجود ہوں اس کے ہاں مقامی سیاست کا رنگ بھی ہوگا اور معاصرانہ چشمکیں بھی — چنانچہ فرماتے ہیں۔

بعد میرے مری ہر بات بھلا دی جائے
صرف تصویر دفاتر میں لگا دی جائے
جی میں آتا ہے کہ بت خانے کا رخ کر لیجے
بات وہ راہنمایان سخن کہتے ہیں
بڑے اچھے بڑے سیدھے کہیں کے ذرا دیکھو تو دیکھو آستیں کے

میں نے محشر عنایتی مرحوم کی زبانی ان کی متعدد غزلیں رام پور کی شعری نشستوں میں سنی تھیں ان کی غزلوں کو سن کر مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ ان کے ہاں کلاسکی رچاؤ، فنی پختگی اور زبان کی سلاست کے ساتھ ساتھ فکری اعتبار سے بھی کچھ نیا پن ضرور ہے لیکن میرے اس گمان نے یقین کی صورت اس دن اختیار کی جب میں ان کی علالت کے دوران عیادت کے لیے ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا اتفاق سے اس دن ان کی طبیعت بہتر تھی شعر سننے

سنانے کا موڈ ان پر طاری تھا اس دن محشر صاحب نے مجھے چند ایسی غزلیں سنائیں جو اس نے طرزِ فکر سے متاثر ہونے کے نتیجے میں کہی گئی تھیں جس کا آغاز ہمارے شعر و ادب میں بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ہوا تھا ان کے یہاں یہ جدید میلان دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ جس شخص کے یہاں شعرگوئی کی ابتدا حسرتؔ فانیؔ اصغرؔ اور جگرؔ کے زمانۂ عروج میں ہوئی ہو وہ کس طرح اس نئے طرزِ فکر کی جانب اس قدر اشتیاق سے راغب ہو سکتا ہے لیکن زمانہ تو بڑا اثر کار ہے یہ کروٹیں بدلتا ہے اور اپنے بدلتے ہوئے رنگ میں نامعلوم طور پر ان کو بھی رنگ لیتا ہے جو زمانے کو ارتقا پذیر نہیں مانتے۔ سال ڈیڑھ سال میں نے اپنی ایک ریڈیائی تقریر میں محشر عنایتی کی غزلیات سے بیس پچیس اشعار ایسے پیش کیے تھے جن کو محشر عنایتی کے نام کا حوالہ دیے بغیر کسی بھی نمائندہ جدید شاعر کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ محشر عنایتی سن و سال کے اعتبار سے کتنے ہی پختہ سہی طرزِ احساس و اظہار کے اعتبار سے جدید فکر کے حامی تھے۔

اب میں اپنی بات کے ثبوت میں محشر عنایتی کے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جہاں مشینی دور میں سماجی رشتوں کی ابتری اور اس کا پیدا کردہ عدم تحفظ اور تنہائی کا احساس انتشار و ابتلا کی فضا میں شدید روحانی کرب اور ذات کے صحرا کی تلاش جیسے مضامین کو موضوعِ شعر بنایا گیا ہے۔

سلسلہ ٹوٹ تو سکتا نہیں سناٹوں کا
دل کے سمجھانے کو آواز لگا دی جائے
رہ سکوں گا نہ کبھی نقطۂ قائم کی طرح
میں کہ ہوں قید سے بھاگے ہوئے مجرم کی طرح
کس کے ہمراہ نظر آتا تھا تنہا تنہا
کس سے بچھڑا ہوں کہ تنہا بھی دکھائی نہ دیا
روشنی کچھ یوں گھٹی تنہائی کچھ ایسی بڑھی
اپنے سائے کو بھی تاریکی میں رونا پڑ گیا
آبلے جسم پہ پڑتے تھے مگر دل میں نہیں
پہلے سورج کی تمازت میں کمی تھی شاید

مجھے یقین ہے کہ محشر صاحب کے محولہ بالا اشعار کو صالح اور صحت مند جدیدیت کے کسی بھی نمائندہ شاعر کے کلام سے مماثل اور ہم رنگ سمجھنے میں قارئین کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔

(آفتاب شمسی)

دکھتی رگیں

شاعر: شادؔ عارفی
پتا: رام پور پبلشنگ سوسائٹی رام پور
قیمت: چار روپے

شہر رام پور کی مخصوص علمی و ادبی فضا نے بہت سے صاحبانِ ادب اور کاملانِ فن کو جنم دیا

ہے۔ ان میں شاد عارفی کی شخصیت کئی اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنے دور کی دکھتی رگوں پر ایک بناض فطرت کی حیثیت سے ہاتھ رکھا ہے سماج کی خرابیوں پر ان کی دوررس نگاہ بہت جلد پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ طنزیہ شاعری سے عبارت ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "سماج" کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں منظرِ عام پر آیا تھا اس کے بعد سلطان اشرف نے ایک مجموعہ "سفینہ چاہیے" شائع کیا۔

لیکن شاد صاحب کو آزاد منشی، قلندری اور گوشہ نشینی کی زندگی سے نکال کر علمی سرفرازی اور ادبی قدر و منزلت کی مسند پر متمکن کرنے کا سہرا ڈاکٹر مظفر حنفی کے سر ہے جنھوں نے ان کے چار مجموعہ ہائے کلام مرتب کر کے شائع کیے۔ اور ۱۹۷۵ء میں "شاد کی کلیات بھی شائع کرائی اور سب سے بڑھ چڑھ کر یہ کہ انھوں نے "ایک تھا شاعر" اور شاد عارفی کی شخصیت اور فن" جیسی مکمل اور اور ناقدانہ کتابوں کے ذریعے شاد کو اردو ادب میں ان کا جائز مقام دلانے میں بڑی مدد کی ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کی ان فاضلانہ تصانیف کی بدولت اردو دنیا شاد عارفی کے صحیح مرتبہ کو پہچاننے کی اہل بن سکی ہے۔

شاد عارفی کی کلیات اور دوسرے مجموعوں میں ان کا تقریباً تمام و کمال شعری سرمایہ محفوظ ہو چکا تھا لیکن ان کے تخلیق کردہ کچھ قطعات اور رباعیات بطور باقیات الصالحات کچھ لوگوں کے پاس اور خود ان کی تحویل میں غیر مطبوعہ شکل میں موجود تھی، ان سب کو ساکھی عارفی اور فنیل عارفی نے بڑے اہتمام سے یک جا کیا اور سلطان اشرف نے رام پور پبلشنگ سوسائٹی کی جانب سے یوم شاد عارفی کی تقریبات کے سلسلے سے اسی سال ماہِ رواں میں "دکھتی رگیں" کے نام سے شائع کیا ہے۔

اس مجموعے میں ۱۶۰ قطعات و رباعیات کے علاوہ پانچ ہندی انداز کے گیتوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے "دکھتی رگیں" میں شامل قطعات و رباعیات کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہاں پر شاد عارفی ایک غزل گو کی حیثیت سے سامنے نہیں آتے ہیں بلکہ ان کا مخصوص تیکھا لب و لہجہ، طنزیہ اور مزاحیہ لے کا حامل نظر آتا ہے۔ نباض فطرت کی حیثیت سے انھوں نے جہاں ہمارے سماج میں رائج خرابیوں اور بے راہ روی کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں سماج کے بعض طبقات کی نفسیاتی کمزوریوں کو بھی انھوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے بقول فرقت کاکوروی جب وہ آواز کی پٹری پر غزل کو دوڑتا دیکھتے ہیں تو ان کا اس صورت حال سے دل کانپ جاتا ہے اور پھر وہ اپنے قطعہ میں اس طرح طنز و مزاح کا تیر چلاتے ہیں۔

شعر کے اندر غنائی کیفیت درکار ہے
اس کا یہ مطلب نہیں بزم ادب میں گاؤ بھی
وہ غزل جس میں ترنم ہو مگر معنی نہ ہوں
نرخ بالا کر نہیں سکتا بنا کر بھاؤ بھی

انھوں نے اپنے بعض قطعات میں نہایت سنجیدہ اور دل نشین انداز میں گہری باتوں کو بھی

پیش کیا ہے۔ اس قطعے میں کیسی پتے کی بات کہتے ہیں ؎

وقت کے تیور سمجھ لے گی جو قوم
خاک پھانے گی تو ہیرے پائے گی
جب ہوا کے رخ چلے گا کارواں
کارواں سے گرد آگے جائے گی

شاد عارفی کے یہاں شوخی و ظرافت اور مزاح کا انداز بھی بہت نکھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ ہمارے سماج میں جب کوئی قابلِ توجہ نکتہ پالیتے ہیں تو اس کا ذکر اپنے دلچسپ اور دل خوش کن پیرائے میں اس طرح کرتے ہیں کہ وہ بار محسوس نہیں ہوتا مثلاً ان کا یہ مزاحیہ قطعہ ملاحظہ ہو ؎

مرغیاں ہی مرغیاں دیکھیں جو کل اک گاؤں میں
میں نے پوچھا مرغ کیوں غائب ہیں؟ یہ کیا گھات ہے
راز دارانہ طریقے پر یہ بولا میزبان'
کیا کہا جاتے یہ بتاؤں کی شکمی بات ہے

(ڈاکٹر حسن احمد نظامی)

چہرے

شاعر: شاکر بانکوٹی
قیمت: پچیس روپے
تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

شاکر کا تعلق مہاراشٹر کے دریا ساوتری کے کنارے بسے ہوئے پر فضا' اور قدرتی مناظر سے مالا مال علاقے بانکوٹ سے ہے اور ان کی شاعری میں بھی وہ سارا حسن' وہ ساری دلکشی موجود ہے جو بانکوٹ جیسے ایک پر فضا اور قدرتی ماحول میں پلے ہوئے شاعر کی شاعری میں ہونا چاہیے اس مجموعے میں شاعر کی ششہتر منتخب غزلیں ہیں۔ پہلی غزل محبوبِ حقیقی کی حمد میں ہے لیکن باقی غزلیں ان جذبات و احساسات کا آئینہ ہیں جو کسی اچھی صورت' موہنی صورت سے پیار کرتے وقت یا زندگی کے سفر میں پیش آنے والے نشیب و فراز سے گزرتے وقت ہمارے آپ کے دلوں میں بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان جذبات و احساسات کی کہانی انھوں نے اپنے ایک الگ رنگ میں سنائی ہے۔ ایک ایسے رنگ میں جس میں خلوص ہے' سادگی ہے' سچائی ہے۔

غزل کی زبان بڑی نرم اور دل آویز ہوتی ہے۔ شاکر کی غزلوں میں بھی یہ ساری نرمیاں اور دل آویزیاں بھری ہوئی ہیں۔ لیکن جب ان کا احساس عشق شدید ہونے لگتا ہے تو ان کی زبان میں بھی بے انتہا گرمی' چستی اور تیزی آجاتی ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں کا رخ یہ بھی ہے:

نگاہیں چار ہوتی ہیں تو پیمانے لرزتے ہیں — پلائی جاتی ہے ایسی کہ میخانے لرزتے ہیں
کوئی پوچھے اثر خونِ وفا کا خارِ صحرا سے — برہنہ پا جو چلتے ہیں تو ویرانے لرزتے ہیں

مرے ذوقِ تجسس کی عجب تاثیر ہے یارب — کہ رخ کعبہ کا کرتا ہوں تو بت خانے لرزتے ہیں

شاکر کی شاعری خلوص و محبت کی شاعری ہے، پاکیزہ جذبات کی شاعری ہے۔ وہ زندگی کے سفر میں جن مقامات سے گزرے اور اس کا ان کے دل پر جو کچھ اثر ہوا اس کو انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ اپنی غزلوں میں ڈھال لیا ہے ان کی شاعری میں ایک سچے عاشق کا دل دھڑک رہا ہے:

ساتھ اک شوخ کے گذرے ہیں جو لمحے شاکر — میں بھلانا انھیں چاہوں تو بھلا بھی نہ سکوں

۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ صاف ستھرا اور دیدہ زیب شائع ہوا ہے جس کے لیے پبلشر داد کے مستحق ہیں۔ (ڈاکٹر حامد اللہ ندوی)

لہو کے چراغ

شاعر: انجم عباسی
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی ۲
قیمت: بیس روپے

مہاراشٹر کے دریائے ساونتری کے آس پاس کا علاقہ کوکن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہاں کے کچھ سرگرم اور مخلص حضرات نے ایک تنظیم بنائی ہے جس کا نام کوکن اردو رائٹرس گلڈ ہے تنظیم کی دیگر سرگرمیوں کے ساتھ یہ پروگرام بھی ہے کہ ارض کوکن کے ان کہنہ مشق اور باصلاحیت شعرا کو اردو دنیا سے متعارف کرایا جائے جو اپنی بے نیازی کے سبب گم نامی کی زندگی پر قناعت کیے ہوتے ہیں۔ ان شعرا کا رونا انجم عباسی کے اس شعر میں بھی موجود ہے کہ:

روز اخبار میں چھپ جانے سے ملتا کیا ہے — اپنے تشہیر کے انسانے میں رکھا کیا ہے

پیش نظر مجموعہ اسی مقصد کے تحت شائع ہوا ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد بلا تامل ماننا پڑتا ہے کہ گلڈ نے اردو کی خدمت کی ہے۔

انجم عباسی نے نظم بھی کہی ہے اور غزل بھی۔ ان کے پورے کلام میں تیکھے طنز اور جھنجھلاہٹ کا عنصر کہیں کہیں بہت واضح (مثلاً نظم "الکشن اور خون کے تاجر" وغیرہ — اور زرد سورج بانجھ دھرتی اور کالی ندیاں، پنج سالہ یوجناؤں کا تماشا خوب تھا، جیسے اشعار) اور کہیں زیریں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں کچھ ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو ابتدائی مشق معلوم ہوتی ہیں (" جی نہیں" "وہ اگر نہیں آئیں") اور اگر یہ مجموعے میں شامل نہ کی جاتیں تو بہتر تھا۔ غزلیں سب صاف ستھری ہیں اور ان میں شاعر نے اپنی انفرادیت پیدا کی ہے۔ ان میں روایت سے بغاوت تو بالکل نہیں لیکن تازگی کا احساس برقرار رہتا ہے اور جہاں شعر میں ہلکا سا طنز شامل ہو جائے وہاں تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

میں اپنے گھر میں رہوں چاہے اپنے دفتر میں — وہ میرے سامنے بیٹھا دکھائی دیتا ہے
دھوپ چہرے پر اگی ہے جسم ٹوٹا ہے بہت — ہم کو جینے کی ہوس نے روند ڈالا ہے بہت
سر خاب کے پر اپنے کاندھے پہ نہیں لیکن — جب کوئی ملا ہم سے سو بار ملا ہوگا

زمانے بھر کا جو فتنہ رہا تھا　　وہی شخص گاؤں کا مکھیا بنا تھا

کتاب موڈرن پبلشنگ ہاؤس کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے اور بہت دیدہ زیب چھپی ہے۔ کتابت و طباعت صاف ستھری اور معیاری ہے۔ (ارشد علی خاں)

حرفِ مسبّب

شاعر: رشمی کانت راہی
پتا: نجمی اکیڈمی، بخشی بازار، کٹک
قیمت: پچیس روپے

"حرف مسبب" کے شاعر رشمی کانت راہی کے بارے میں یہ جان کر ایک مسرت آمیز حیرت کا احساس ہوا کہ ان کی مادری زبان گجراتی ہے جب کہ وہ اڑیسہ میں مقیم ہیں اور اردو میں شعر کہتے ہیں۔ ان کے کلام کا مطالعہ ہمیں پھر حیرت انگیز مسرت سے دوچار کرتا ہے کیوں کہ اس میں مبتدیانہ اور بھرتی کے اشعار بہت کم ہیں اور اکثر غزلیں پختگی اور صلابت کی حامل ہیں۔ طرہ یہ ہے اردو کے مرکزی علاقوں سے دوری کا خیال انھیں کسی احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں کرتا اور زبان و بیان اور عروض کے تجربے کرنے سے دامن نہیں بچاتے چنانچہ اس مجموعے میں شامل اکثر غزلیں نامانوس اور غیر معروف بحروں میں ہیں اور ان میں پیش کردہ اشعار میں روایت سے زیادہ جدیدیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

خوشی سے سبھی کی کا منظر دیکھنا ہوگا　　خود اپنے سامنے جلتا ہوا گھر دیکھنا ہوگا
تنہائی کے دیپک میں یادوں کا خون　　رات کو ہم قطرہ قطرہ ٹپکاتے ہیں
واقفِ رازِ کون و مکاں　　اور کوئی نہیں، درد ہے
تن سلامت، روح زخمی　　ضبط کا ملبہ ہے، میں ہوں

اسی انداز پر مجموعے کی بیشتر غزلوں کا آہنگ تجرباتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں تجربوں کی منزل تک پہنچنے سے پہلے راہی کو اپنے دل کی باتیں سیدھے سیدھے اور دل نشیں انداز میں کہنی چاہئیں ورنہ تنقید انھیں محض استاد کہہ کر ٹال دے گی جب کہ وہ بہرحال شاعر ہیں (ڈاکٹر مظفر حنفی)

در بہ در

شاعر: پروین کمار اشک
پتا: سمیکشا پرکاشن، کرشنا اسٹریٹ، پٹھان کوٹ
قیمت: بارہ روپے

اشک کا تعلق اردو شاعروں کی جدید ترین نسل سے ہے اور در بہ در ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے جس میں ان کی تقریباً چار درجن غزلیں شریکِ اشاعت ہیں غزلوں میں شاعر کا لہجہ شادابِ اور شخصیت معصوم نظر آتی ہے لیکن اس بھولپن کے باوجود پروین کمار اشک کے ذہن میں تجسس کا دھندلکا اور دل میں جذبے کی چنگاریاں واضح دکھائی دیتی ہیں۔ تین شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

پھول چھونے سے بھی کٹ جاتی تھی جسکی انگلی　　آج اس شخص کے ہاتھوں میں بھی پتھر دیکھا

مروّت کی تجوری بند رکھنا　　یہ سکّہ شہر میں چلتا نہیں ہے

سمندر چیختا اس وقت پہنچا　　مکاں پوری طرح جب جل چکا تھا

ایسے تازہ تازہ شعر کہنے والا شاعر جب الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتتا ہے تو اچھا نہیں لگتا مثلاً ایک مصرع ہے "شاید نہیں رہے وہ خدا ترس آدمی"۔ یہاں ترس کی ر کو ساکن باندھا گیا ہے۔ امید ہے اشک سنبھل کر، سوچ کر اور ڈوب کر کہتے رہیں گے تو اونچے جائیں گے۔ (ڈاکٹر مظفر حنفی)

وقت کا سورج

شاعر: ساحر شیوی
پتا: موڈرن بلڈنگ ہاؤس۔ دریا گنج نئی دہلی ۲
قیمت: پچیس روپے

"وقت کا سورج" ساحر شیوی کا تازہ شعری مجموعہ ہے جس میں نظمیں، غزلیں، قطعات و رباعیات اور مختلف اشعار شامل ہیں۔ کتاب کے دیباچے کے مطابق ساحر شیوی ایک کامیاب اور مصروف کاروباری آدمی ہیں۔ تب یقیناً یہ ان کا جذبۂ صادق ہی ہے کہ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود وہ شعر کہنے کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔

نظم کی بہ نسبت ساحر کا رجحان غزل کی طرف زیادہ ہے اور اسی لیے دیگر اصناف کے مقابلے میں اس مجموعے میں غزلیں زیادہ تعداد میں ہیں۔ بقول بدیع الزماں خاور مجموعی حیثیت سے ان کی غزلیں اردو غزل کے روایتی اور مانوس انداز کی کہی جاسکتی ہیں۔ ان غزلوں میں سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ دل کی وہ کیفیت بھی ملتی ہے جسے محبت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہیم شگفتہ سے "وقت کا سورج" تک شاعر نے جو ادبی سفر طے کیا ہے اس میں ساحر کا زندگی کے کئی تلخ اور شیریں حقائق سے واسطہ پڑا ہے جس سے اس میں حقیقت سے آنکھ ملانے کی ہمت پیدا ہوئی ہے اور وہ صرف غمِ محبوب میں ہی گرفتار نہیں رہا ہے بلکہ اس نے غمِ دوراں کو بھی گلے لگایا ہے۔ اسے زمانے کی دورخی کا بھی احساس ہے اور اس کے سنگ دلانہ وحشیانہ رویہ کا بھی:

آج سر میں خودی کا سودا ہے　　اور کل تک خدا بنے گا وہ

ظلم جب بھی کسی پہ ڈھاتا ہوں　　آدمی ہوں یہ بھول جاتا ہوں

سونا بھی دو گھڑی نہیں اس کے نصیب میں　　وہ بادشاہ کتنا ہے مجبور دیکھیے

مٹھاس تلخیِ دوراں میں گھولتا ہی نہیں　　جو میں نے پالا ہے طوطا وہ بولتا ہی نہیں

نظموں میں "آدمی"، "محبت"، "اوپر کی کمائی"، "وقت کی آنکھیں" اور "سگریٹ" ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ قطعات و رباعیات بہت کم ہیں لیکن ٹھیک ٹھاک ہیں کیوں کہ بنیادی طور پر شاعر غزل کا شاعر ہی ہے۔ صوری اعتبار سے بھی کتاب دلکش ہے۔

(ارشد علی خاں)

آبِ رواں

شاعر: بسمل پرتاپ گڑھی
پتا: ایڈوانس کلچرل اینڈ سوشل گروپ خان روڈ احمد آباد
قیمت: پندرہ روپے

احمد آباد کے ابھرتے ہوئے شاعر بسمل پرتاپ گڑھی کے پہلے مجموعہ کلام میں اشعار کا رنگ بتاتا ہے کہ شاعر جدیدیت کو شعوری طور پر اوڑھنے کی کوشش کر رہا ہے جس کے نتیجے میں کلام نہ کلاسیکی رچاؤ کا حامل رہ گیا نہ اس میں عصری حسیت کی جھلک پیدا کی جا سکی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رکھے ذرا کچھ اپنی حرارت کی آبرو
گرتے ہوئے بدن کو سنبھلنا بھی چاہیے
اک عمر میں نوالۂ کرمک بنا رہا
کیا امتحان صبر میں کھایا گیا مجھے

مندرجہ بالا اشعار سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ بسمل میں شعر کہنے کی صلاحیت بہرحال موجود ہے اگر وہ فنی رموز کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے مزاج اور تجربے کی روشنی میں محسوسات کو نظم کریں تو غالباً ان کا مستقبل زیادہ روشن ہوگا۔ (خالد محمود)

تردید

شاعر: محبوب راہی
پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج دہلی ۲
قیمت: پندرہ روپے

"ثبات" کے بعد "تردید" محبوب راہی کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ بہار اسٹیٹ اردو اکیڈمی کی مالی معاونت سے شائع ہوا ہے۔

محبوب راہی بے تحاشا اور بے حساب لکھنے والوں کی صف میں شامل ہیں کوئی رسالہ اٹھا لیجیے مہاراشٹر کے اخبار کھولیے اور کچھ نہیں تو محبوب راہی کا خط ضرور پڑھنے کو مل جائے گا۔ انھوں نے شاید مظفر حنفی کا جھوٹا پانی پی لیا ہے جن پر وہ اپنا تحقیقی کام مکمل کر چکے ہیں۔

محبوب راہی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور خوب غزل کہتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ زود گو اور پر گو قسم کے غزل گویوں کے یہاں زود گوئی اور پر گوئی کے سوا باقی جو بچتا ہے وہ یوں ہی سا ہوتا ہے لیکن محبوب راہی کی غزلوں میں "یوں ہی سا" کے علاوہ بھی بہت کچھ موجود ہے۔ غزل کہتے کہتے وہ یکایک ایک دو ایسے اشعار کہہ جاتے ہیں کہ قاری پڑھتے پڑھتے رک کر انھیں دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خامیوں پر نظر رکھنے والی نگاہیں بھی یہ عمل کرتی ہیں مگر محبوب راہی کے اشعار کی خوبیاں نظر ثانی اور ثالث پر کھلتی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ذوق قاری کے لیے ان اشعار سے سرسری گزر جانا کتنا دشوار ہوگا ؎

پیاس سے باطن کی چاروں جاں بلب
ابر تر، دریا، سمندر اور میں

جتنے دروغ گو تھے وفادار ہو گئے ۔۔۔ سچ بولنا تھا اس بے غدار میں ہی تھا

جائزے

بڑے سکون سے یہ رات ہم پہ گزری ہے
نہ جانے صبح کا سورج کدھر سے نکلے گا

محبوب راہی نئے زمانے کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہیں ہر باشعور شاعر یہی کرتا ہے۔ وہی شاعری عصری آگہی کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جس کا خالق شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے عہد میں سانس لیتا ہے۔ محبوب راہی کے انداز کا تیکھا پن کہیں کہیں فکر کی آنچ اور جذبہ کی وارفتگی پر غالب آجاتا ہے۔ ان کے مزاج کی سادگی پیچ در پیچ سیاسی شعور سے میل نہیں کھاتی اس لیے وہ جس سے شاکی ہوتے ہیں اس پر طنز کا سیدھا وار کرتے ہیں۔ طنز غصہ اور جھنجھلاہٹ کے اظہار کا مرغوب اور موثر ذریعہ ہے۔ محبوب راہی کے اشعار میں اس ہتھیار کا استعمال منتقمانہ نہیں مخلصانہ ہوتا ہے۔

نئی نئی زمینوں میں ٹیڑھے ترچھے اشعار کی تخلیق کا شوق ابتدائً شاد عارفی اور وراثتاً مظفر حنفی کا طرۂ امتیاز ہے۔ محبوب راہی اس وراثت میں اپنا حصہ لگانے کی کوشش میں مصروف ہیں ذرا یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

اس کے سپنوں کے آنچل میں چاند ستارے ٹانک رہے ہو
کیوں بھیا کا ہے کو ایسی الٹی سیدھی ہانک رہے ہو
جب گلشن میں آگ لگی تھی تم بھی تو مسرور بہت تھے
اب کیوں کانٹے چبا رہے ہو اب کیوں مٹی پھانک رہے ہو

ان اشعار میں زبان و بیان کے ردیوں میں تبدیلی کی وجہ سے صفائی اور روانی میں تھوڑی سی کمی ضرور آگئی ہے مگر تیور وہی ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے محبوب راہی کی غزل میں میر اور غالب کے انداز کا پتا لگایا ہے جس میں ایک طرف جذبہ کی دھیمی لے آواز کی خستگی اور لوچ میں منقلب ہو کر سامنے آتی ہے دوسری طرف فکر کی آنچ جذبہ کی وارفتگی میں ڈھل کر نمودار ہوتی ہے۔ وزیر آغا کے الفاظ میں "محبوب راہی کو غالب کا انداز مرغوب ہے چنانچہ ان کے ہاں فکر کو پر عطا ہوتے ہیں اور جذبہ کو وارفتگی نصیب ہوتی ہے اور فکر اور جذبہ ایک دوسرے میں جذب ہونے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ امید ہے کہ اگر محبوب راہی کے ہاں شعر کہنے کی لگن اسی طرح جوان رہی تو وہ غالب کی شعری روایت کو زندہ رکھنے میں ضرور کامیاب ہوں گے"

(خالد محمود)

رات بہت ہوا چلی

شاعر: رئیس فروغ
ناشر: نام معلوم نہ ہو سکا
قیمت: نہ معلوم

زندگی ایک مسلسل فریب ہے اس پر اعتبار کرنا بہت بڑی نادانی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ انسان نے اسے باوفا سمجھ لیا ہے اس پر اعتبار کرتا رہتا ہے لیکن یہ ایسے آڑے وقت پر

آنکھیں پھیر لیتی ہے جب انسان کے منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچنے والے ہوتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو اعتبار تھا کہ رئیس فروغ اپنا مجموعہ کلام تکمیل دے رہے ہیں۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ وہ اپنے آٹوگراف کے ساتھ اپنے مجموعے کو خود تقسیم کریں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا ان کا شعری مجموعہ "رات بہت ہوا چلی" یقیناً ہمارے سامنے ہے مگر آٹوگراف غائب اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا اعتبار صرف خوش فہمی تھا۔

رئیس فروغ کا یہ مجموعہ کلام نظموں اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان کی شاعری کا اصل جوہر غزل میں پوشیدہ ہے لیکن عجب اتفاق ہے کہ انھیں پروز پوئٹری سے والہانہ لگاؤ تھا یہ کوئی نئی بات نہیں عموماً ہوتا یہ ہے کہ تخلیق نگار جس فن پارہ کو کم اہمیت دیتا ہے دوسروں کی نظر میں وہ زیادہ اچھا ہوتا ہے غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا لیکن وجہ شہرت اردو شاعری ہوئی۔ رئیس فروغ کی غزل میں ایک عجیب کشش ہے۔ اس کشش کی وجہ غالباً ان کے الفاظ ہیں۔ وہ نہایت سادہ عام فہم اور نئے الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اس بات کا خاص اہتمام نظر آتا ہے کہ ایسے الفاظ اور اصطلاحات استعمال کی جائیں جو اس سے پہلے کہیں اور استعمال نہ کی گئی ہوں خواہ لفظ دوسری زبان ہی کا کیوں نہ ہو۔ عموماً شعرا حضرات غیر مانوس الفاظ استعمال کرتے ہوئے گھبراتے ہیں نفسیاتی طور پر وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ غیر مانوس الفاظ میں شعری کیفیت پیدا نہیں ہو گی۔ اس لیے ان پر گھبراہٹ طاری رہتی ہے اس کے برعکس رئیس فروغ اس معاملہ میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں انھوں نے الیکٹرک سٹی کی ایک ٹرم (اصطلاح) کو غزل میں اس خوب صورتی سے استعمال کیا ہے کہ شعر میں توانائی اور معنویت بھی پیدا ہوئی ساتھ ہی ساتھ شعریت بھی موجود ہے۔

شارٹ سرکٹ سے اڑیں چنگاریاں
صدر میں اک پھول والا جل گیا

اردو غزل کے موضوعات پر جب ہم جدید غزل یا آج کی غزل کا تذکرہ کرتے ہیں تو یقیناً ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسی کوئی انفرادیت یا کوئی نیا پن جو گزشتہ تجربات شعری سے کچھ نہ کچھ مختلف ہو جب یہ صورت حال ہوتی ہے تو ہم اسے جدید غزل یا آج کی غزل کا نام دیتے ہیں میرے خیال میں اگر فروغ کے ان اشعار کو پیش نظر رکھا جائے تو ہمیں وہ جدید غزل کے ایک نمائندہ شاعر نظر آتے ہیں جب وہ کہتے ہیں۔

رات بہت ہوا چلی اور شجر بہت ڈرے
میں بھی ذرا ذرا ڈرا پھر مجھے نیند آ گئی

اپنے ہی ایک روپ سے تازہ سخن کے درمیان
میں کسی بات پر ہنسا پھر مجھے نیند آ گئی

بجھ گیا جل جل کے دریا دھوپ میں　　　کیا بجھاتے موکٹورا دھوپ میں

سخت بر ہم تھیں ہوائیں پھر بھی ریت پر پھول بنائے میں نے

ایک سانولی چھت کے گرنے سے اک پاگل سایہ کچل گیا

اپنے حالات سے میں صلح تو کرلوں لیکن مجھ میں روپوش جو اک شخص ہے مرجائے گا

ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فروغ کے اندر عہد کی بدلتی ہوئی اقدار کو قبول کرنے کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کی نئی صنف پروز پوئٹری کی جانب وہ مائل ہوئے بلا جھجک انھوں نے نئی روش کو قبول کیا اور اس پر طبع آزمائی کرتے رہے میرے خیال میں ہر تخلیق نگار کا یہ اپنا ذاتی حق ہے کہ وہ اپنی ذہنی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی فورم کو تبدیل کر سکتا ہے ہم اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے خواہ اس نے شاعری کی کوئی سی بھی فورم اختیار کی ہے۔ ہیئت سے نفرت کا اظہار کرکے ہم کسی کے خیالات کو ٹھکرا دیں تو یہ ہماری تنگ نظری کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ جہاں تک فروغ کی پروز پوئٹری کا تعلق ہے ان کی یہ ایک اچھی کوشش ہے میں تو کہوں گا کہ جن خیالات کو وہ غزل کے اندر اجاگر نہ کر سکے اس خلا کو انھوں نے اپنی نثری نظموں میں پیش کیا ہے بہ اعتبار خیال ان کی نظموں میں وسعت زیادہ ہے۔ طویل نظموں کی بہ نسبت مختصر ترین نظمیں زیادہ سے زیادہ قاری کو فکر کی دعوت دیتی ہیں جن سے بہت سے گوشے اور سوالات پیدا ہوتے ہیں ان نظموں میں "نئے پرندے" "انکوائری" "انکل پڑھے لکھے لوگ" اور "دبناں" قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی نثری شاعری کی ایک ہلکی سی جھلک آپ بھی دیکھیے ــــ

گرتے ستاروں کے آس پاس کہیں
گریٹ آئینڈ باز
اور ان میں گھرا ہوا ولیم جیمز
اس کے لڑکپن میں
پہاڑ بھاگتے تھے
جنگل بہتے تھے
بہتے جنگلوں میں نہاتی بطخوں کا پیچھا کرتے ہوئے
ہم
دھوبن کے فلیٹوں تک پہنچ گئے
ان تمام صدیوں کے دوران
اس چھری نے کئی چہرے بدلے
جسے پہلی بار ہم نے
سبزی کے تھال میں دیکھا تھا (نسیم سنز لکھی)

پسِ آئینہ

شاعر: جمیل ملک
پتا: نو بد پبلشرز، راولپنڈی
قیمت: ۳۶ روپے

جمیل ملک کی شاعری نے ہر طبقۂ خیال کو متاثر کیا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ترقی پسند تحریک کے باوجود شاعروں میں فیض، علی سردار جعفری اور مخدوم کے سوا دوسرا کوئی شاعر اپنی آواز کو تحفظ بہم پہنچا نہیں سکا اور بہت سے ایسے شاعر جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی ان کے داخل کی سچی آواز اس پر شور تحریک کے غلغلے میں گم ہو گئی اور ترقی پسند تحریک کے ساتھ ان کی پر خلوص وابستگی ان کی شاعری کو سہارا نہ دے سکی۔

جمیل کی کتاب "پسِ آئینہ" چھپ کر آئی تو میرے لیے حیرت کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب جمیل ملک نے ترقی پسند تحریک کے "وصیان" سے رابطہ قائم رکھنے کے باوجود "عرفان" کی نئی منزل کی طرف واضح پیش قدمی کی تھی اور اس کی شاعری سے وہ سچی آواز نمایاں طور پر ابھر رہی تھی جو بطونِ دل میں تلاطم بپا کرتی ہے تو بے ساختہ اظہار پر مجبور ہو جاتی ہے۔"

جمیل ملک کی متعدد نظمیں مثلاً "نغمہ جان۔ پلکوں کی دیوار" "دوام" "عرفان" "بدلتی رت کا جادو" "نروان سے پہلے، سمندر، ابدیت وغیرہ میں لمحۂ موجود سے بلند ہونے اور دوام ابد کو پا لینے کے آثار نظر آتے ہیں اور جمیل ملک نے حسی تمثالوں سے وہ عرفانی کیفیت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے جس سے معاشرے کے بوجھ تلے دبا ہوا انسان سبک رو جاتا ہے۔

"پسِ آئینہ" کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ ان کے موضوعات، نظموں کی ہیئت کے ساتھ آمیختہ ہیں، ہر نظم شاعر کے باطن سے اگتی ہوئی اور شجرِ حیات کی طرح پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جمیل ملک کی جوانی سا گرجیلا لہجہ اب آہستہ خرام ندی کی روانی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ بوجھل لفظوں نے کومل لفظوں کے لیے جگہ خالی کر دی ہے اور استعارے نے علامت کا بازو تھاما ہے تو معنی کی صورت آشنائی کے متعدد زاویے پیدا کر دیے ہیں۔

اس کتاب کے تذکرے میں شہر موجد کے یہاں خانۂ خیال سے ابھرے ہوئے نقش کی تحسین نہ کرنا بھی نا انصافی ہو گی، موجد نے مصوری اور خطاطی کے امتزاج سے سرورق ڈیزائن کرنے کا نیا انداز اختراع کیا ہے۔" موجد نے لفظوں کے بطون سے رنگ ابھارے ہیں اور رنگوں کے عقب سے منظر پیدا کیا ہے۔ گویا جو کچھ پسِ آئینہ ہے وہ مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ کتاب اردو نظم میں ایک خوب صورت اضافہ اور جمیل ملک کے دل کی سچی آواز ہے۔ (انور سدید)

کھل جا سم سم

شاعر: مظفر حنفی
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵
قیمت: اٹھارہ روپے

"کھل جا سم سم" مظفر حنفی کا ساتواں شعری مجموعہ ہے اور ہر لحاظ سے ساتواں طلسماتی در طنز سے طلسم تک کا یہ سفر

بڑا معنی خیز ہے۔ طنز یہ شاعری کے حدود ہوتے ہیں اور اگر ان حدود سے شاعر بے خبر رہتا ہے تو اس کی شعری کائنات سمٹتی چلی جاتی ہے۔ مظفر حنفی نے ایک عرصے تک اپنی غزلوں میں طنز یہ طور Satiric-mode کی اس روایت کے تسلسل اور توسیع کی کامیاب کوشش کی جس کا سب سے معتبر نام شاد عارفی تھا۔ جدید اردو غزل میں سنجیدہ غیر سنجیدگی یا Anti-Solemnity کا جو جدید رنگ ہے اس کی پیش آمد شاد عارفی کے یہاں ملتی ہے۔ اس روایت کے یوں تو کئی شاعر ایسے نظر آتے ہیں مگر اس امانت میں جیسی تخلیقی خیانت کا ثبوت مظفر حنفی نے دیا ہے اس کی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔ شعر کی دنیا میں کسی ذہنی یا اسلوبی روایت کی امانت داری۔ امانت کے ذہنی تصور سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں محفوظ رکھنے کا عمل تصرف اور تسلسل سے ہم رشتہ ہوتا ہے۔ اسی تصرف اور تسلسل سے روایت کی توسیع کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی تصرف اور توسیع کو میں تخلیقی خیانت کہتا ہوں اور یہ خیانت نہ کی جاتے تو نری روایت پرستی وجود میں آتی ہے اور روایت کا انقلابی تصور معدوم ہو جاتا ہے۔

غزل میں سنجیدہ غیر سنجیدگی کی روایت کے تمام تر اظہاری امکانات کو آزمانے کے بعد اور اس کے حدود کے احساس کے زیر اثر مظفر حنفی نے شعری تجربے اور اس کے اظہار کی طلسماتی جہتوں کی طرف توجہ کی۔ ان کا یہ تخلیقی سفر بڑا معنی خیز ہے۔ عام طور پر اوسط درجے کے شعراء کا سفر طلسم خیال سے عذاب آگہی کے تجربے کی طرف ہوتا ہے۔ اچھے اور اہم شعراء کے ہاں یہ سفر مختلف ہوتا ہے وہ خواب سے حقیقت کی طرف سفر کرتے ہیں اور ایک عرصے تک حقیقت شناسی کے بعد ان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ حقیقت بھی آخری تجزیے میں بعض خواب ناک طلسماتی ابعاد رکھتی ہے۔ یہ ادراک حقیقت کو زیادہ حقیقی بناتا ہے اور شاعر کی تخلیقی توانائی کا ثبوت ہے۔ مظفر حنفی نے اس سفر کا آغاز طلسم حرف سے کیا تھا۔ کھل جا سم سم' میں اس سفر کے تجربوں کے حسی متبادلات Emotional Equivalents کی فضا حساس' اور گمبھیر ہے۔ بعض روشن اور نیم رومانی پیکروں کے موجودگی کے باوجود ان کا تجربہ انسانی صورتِ حال کی ظلمت آثاری میں ایک طلسماتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس تخلیقی طلسم بندی میں ان کی غیر معمولی فنی دست رس کو بڑا دخل ہے جو انھیں اظہار کی حیرت انگیز بے ساختگی عطا کرتی ہے۔ جدید دور میں انسانی تجربے کی پیچیدگی کا تخلیقی اظہار فن کاروں کے لیے ایک عذاب بھی ہے اور چیلنج بھی۔ ہمارے بعض نئے اور کم مشق شعراء جن تجربوں کے اظہار میں ہکلانے لگتے ہیں مظفر حنفی انھیں کچھ ایسی سہولت سے ادا کرتے ہیں کہ ان کی پیچیدگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ ایک اچھے فن کار کی طرح اس رمز سے واقف ہیں کہ پیچیدہ تہہ در تہہ اور انسانی صورتِ حال کا اظہار پیچیدہ اسالیب میں کرنا کمال نہیں' عجز بیان ہے اور ایک طرح کی Imitative Fallacy پر مبنی ہے۔ اچھا فنی اظہار غیر مرتب تجربے کو مرتب' غیر مربوط کو مربوط اور غیر منضبط کو منضبط بنانے سے عبارت ہے۔ مظفر حنفی نے اس کارِ مشکل کو شعری اظہار کے وسائل پر ماہرانہ گرفت اور روایت کے توانا احساس کی مدد سے اتنا آسان بنا دیا ہے کہ ان کے نقاد مشکل میں پڑ گئے ہیں۔

" کھل جا سم سم' کی غزلوں میں اور بہت سی باتوں کے علاوہ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متوجہ کیا ہے وہ ہے جنگ اور پیکار کے پیکروں کا تواتر۔ یہ پیکر چوں کہ غزل میں برتے گئے ہیں اس

وجہ سے ان کے حدود یا اخذ Catchment Areas ہمارے روایتی نظام جنگ سے ماخوذ ہیں۔ اس مجموعے میں عسکری نوعیت کے تمثال میرے خیال میں کلیدی نوعیت کے حامل ہیں اور ان کی مدد سے انسانی وجود کی بساط پر ہونے والی جنگ کا منظرنامہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ جنگ شاعر کے اندر بھی جاری ہے اور باہر بھی۔ اس کی ذات میں بھی غیر ذات کے عناصر اس کے اصل جوہر سے نبرد آزما ہیں۔ باہر کی زندگی بھی اس کے جوہر پر یلغار کر رہی ہے، اس سے اس کا جوہر، اس کا چہرہ، اس کی شناخت، اس کی آواز کا اپنا مخصوص ارتعاش چھین لینا چاہتی ہے اور اسے اس شعور کا حصہ بنا دینا چاہتی ہے جس سے وہ خود عبارت ہے۔ باہر کی زندگی کبھی شب خون مارتی ہے، کبھی اس کے خلاف گوریلا جنگ لڑتی ہے اور کبھی یلغار کرتی ہے۔ شاعر اپنی پوری ذہنی اور اخلاقی توانائیوں کے ساتھ مدافعاتی جنگ کرتا ہے اور اس جنگ میں اپنے وجود کے اسلحہ خانے سے پورا کام لیتا ہے۔ اس کردار میں وہ خود رحمی، ہزیمت، خوردگی اور دل شکستگی نہیں ہے جس سے اردو کی نئی شاعری بھری پڑی ہے۔ دکھل جام سم، کے خالق کا شعری کردار اس سے اعتبار ہماری نئی شاعری کے مجہول شعری کردار سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ جو جنگ لڑ رہا ہے اسے اس نے حق و باطل کی جنگ میں تبدیل کر لیا ہے۔ اور ایسی جنگ کی ایک اخلاقی اساس ہوتی ہے۔ میں ابھی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مظفر حنفی کے اخلاقی وژن کے تمام خد و خال بالکل واضح ہیں مگر یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس جنگ میں ان کی خود اعتمادی کے پیچھے اخلاقیات کا نیا شعور ضرور کارفرما ہے۔ اب اس جنگ کے بعض استعارے یا پیکر ملاحظہ فرمائیے:

ہر سانس پہ کٹنے کی صدا آتی ہے پیہم
یہ تیشہ ہمیشہ مجھے ڈھاتا ہے کہ میں ہوں

تخت یا تختہ وہ کل فیصلہ ہو جائے گا
عیش کر لو رات بھر دشمن کا لشکر دور ہے

وار سہہ کر ظرف اپنا آزمانا تھا مجھے
اور وہ سمجھے مرا سینہ ہے خنجر آشنا

ہر سمت نیا حربہ ہر سمت نیا تیر
پانی کی تمنا ہو تو حلقوم پہ کھا تیر

کھلتا تھا شگوفہ کہ پڑا لو کا تھپیڑا
تازہ تھا ابھی زخم وہیں آن لگا تیر

ہم ہی تھے کہیں گاہ میں ہم ہی تھے نشانہ
ہاں جان بچا لائے مگر خوب چلا تیر

گردن کو جھکاتے ہی چلی پشت سے تلوار
سر ہم نے اٹھایا تھا کہ ماتھے پہ پڑا تیر

جتنے عرصے میں نیا تیر کماں تک جائے
چیختا ہے مری آواز جہاں تک جائے

آنا ہے کمک پہ تو چلے آؤ شتابی ہم دیر سے یلغار سنبھالے ہیں عزیزو

صدائے بازگشت بھی نہ آئی میری چیخ پر بگل بجا تو ہر طرف جوان ہی جوان تھے

میں نے بھی اپنا پیش قبض کھینچ لیا نیام سے جائے اماں کہیں نہ تھی جنگ و جدال کے سبب

لطیفہ ہے کہ میرے قبضۂ قدرت میں دنیا تھی تو میرا ہاتھ اکثر قبضۂ خنجر میں رہتا تھا

ادھر ساحل پہ ان کا پھونک دینا کشتیاں اپنی ہمارا پرچم و نقارۂ لشکر جلا دینا

آؤ منظفر تم بھی پہنو چوغہ اودے پر ودی اندر

مشہور جدید آئرستانی شاعر W.B.Yeats نے کہا تھا جب ہم دوسروں سے لڑتے ہیں تو خطابت جنم لیتی ہے اور جب خود اپنے آپ سے لڑتے ہیں تو شاعری۔ مظفر حنفی کی لڑائی نے دونوں ہی صورتوں میں شاعری پیدا ہوئی ہے، اچھی، سچی، اور معتبر۔ ہندستان میں بانی کے بعد مظفر حنفی اور محمد علوی ایسے دو شاعر ہیں جنھیں ہم اعتماد کے ساتھ پاکستانی غزل کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ علوی کے مقابلے میں لسانی اور فنی مہارت کے اعتبار سے مظفر زیادہ پختہ اور زیادہ قادر الکلام شاعر ہیں۔ غزل کی جمالیات کو دونوں نے ہی De solemnise کیا ہے، مگر میرے خیال میں مظفر حنفی نے یہ کام بہتر فنی شعور کی رہنمائی میں انجام دیا ہے۔ اینٹی غزل کا یہ رویّہ اب کمزور پڑ گیا ہے اور ایک نئی سنجیدگی اور خلوص اظہار کی ایک نئی جمالیات جنم لے رہی ہے۔ جو روایتی غزل کی انگرکھا پوشی اور شیروانی نواز جمالیات سے ذرا ہٹ کر اپنے آپ کو منوا رہی ہے مظفر حنفی کے چند اچھے شعر دیکھیے:

روز اس کے پاس جا کر بیٹھنا روز کچھ دیوار جیسا درمیاں

دنیا ہی عجب ہے کہ ہمیں راس نہ آئی یا ہم ہی زمانے سے نرالے ہیں عزیزو

نہ جمنے کا خطرہ نہ کائی کا ڈر مجھے فائدہ آبشاروں میں تھا

اک خلائے بیکراں ہے اور بازو مارنا درمیاں ہے رات چھتری سے کبوتر دور ہے

دروازے پہ تحریر یہاں کوئی نہیں ہے اندر کوئی زنجیر ہلاتا ہے کہ میں ہوں

ہم نے رکھ دی متاعِ ہنر دھوپ میں اوس ہے یا گہر خود ہی کھل جائے گا

رنگ تیرے پیرہن جیسا تھا تو تیری نہ تھی آج اک لڑکی نے میرا حافظہ مہکا دیا

وہی بہت حسین تھا کہ ہم ہی خوش گمان تھے ہزار تجربوں کے باوجود مٹ نہ ہو سکا

ہر آدمی مجھے جادو بیاں سمجھتا ہے لطیفہ یہ ہے کہ سچ بولتا رہا ہوں میں

ٹھکراؤ تو آسمان پر جائے جی ہاں، یہی خاکسار مٹی

کھڑکی کھولو کھڑکی کھولو خوشبوئیں سر پیٹ رہی ہیں

درِ سخن پر جو دراصل ایک طلسم کدے کا دروازہ ہے، مظفر حنفی نے اپنی آواز کی دستک دی ہے۔ یہ در اس پر کھلا ہے اور بھیدوں بھری کائنات کے اسرار اس پر منکشف ہوتے ہیں۔ اس کائنات کے بہت سے مناظر پر ان کے دستخط مجھے ثبت دکھائی دیتے ہیں۔ شاعری کے طلسم کدے میں یہ بھی ایک معجزہ ہوتا ہے! (انور صدیقی)

شرارِ نغمہ

شاعر: گوپال متل
پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۲
قیمت: ۲۵ روپے

بحیثیت صحافی گوپال متل نے اتنا نام کمایا کہ ان میں چھپے شاعر کی حیثیت ثانوی ہو گئی۔ مقامِ شکر ہے کہ "صحرا کی زبان" کی اشاعت نے ادبی دنیا کو ان کے تخلیقی جوہروں کی یاد بروقت دلائی اور اب موصوف کا دوسرا مجموعۂ کلام "شرارِ نغمہ" اس احساس کو مزید تقویت دلاتا ہے کہ وہ ایک ناقابلِ فراموش شاعرانہ شخصیت کے حامل ہیں۔ ہر چند کہ گوپال متل نے ادبی محاذ پر اشتراکیت اور ترقی پسندی کی بھرپور مخالفت کی اور ۱۹۶۰ء کے بعد سے جدیدیت کے فروغ میں اپنے مشہور زمانہ رسالے "تحریک" کے ذریعے نہ صرف حصہ لیا بلکہ باقی، کمار پاشی، راج نارائن راز جیسے جدید شعراء کو ممتاز مقام دلانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے لیکن ان کی شعری تخلیقات نہ سچی ترقی پسندی (لغوی معنے میں) کے خلاف ہیں نہ خالصتاً جدید۔ مجھ سے پوچھا جائے تو میں انھیں نئے زمانے میں کلاسیکی صحت مند روایات کی تجدید و توسیع کا شاعر کہوں گا۔ جس کی روشن مثالیں پیشِ نظر مجموعہ کی غزلوں اور نظموں میں قدم قدم پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً صرف یہ ایک شعر دیکھیے:

رونا بھی اب مشکل ٹھہرا دل کی بات چھپانا ہے — شام کو رو رو صبح کیا تھا صبح کو کیوں کر شام کریں

لیتھو پر چھپے ہوئے اس مجموعے کی قیمت ۲۵ روپے یقیناً زیادہ ہے۔ اس ادارے سے گوپال متل کی شخصیت اور فن پر کتاب جس معیاری انداز میں شائع ہوئی تھی اس کے مقابلے میں اس کتاب کی پیش کش کو محض گوارا ہی کہا جا سکتا ہے۔ (ڈاکٹر مظفر حنفی)

سمندر آشنا

شاعر: خالد محمود
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی
قیمت: ۱۵ روپے

کوئی سال بھر پہلے کی بات ہے کہ جامعہ کے نوجوان شاعر خالد محمود نے مجھے اپنا شعری مجموعہ "سمندر آشنا" دیا تھا اور شاید رائے بھی چاہی تھی مگر میرے ساتھ معاملہ کچھ عجیب ہے۔ میں نے اس شعری مجموعے کو بھی آواز کے اسی ہجوم کا حصہ سمجھا جس کا سامنا آج اردو کی نئی شاعری کے سرخاری کو ہے۔ ادھر چند برسوں سے شعری مجموعے اس کثرت سے شائع ہو رہے ہیں کہ افراطِ زر کی طرح افراطِ شعر کے ہوش ربا عواقب سے بچنا آسان نہیں ہے۔ خاص طور پر نئی غزل کے نام پر جگہ جگہ گھر یلو صنعتیں قائم ہو گئی ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے گویا نئی غزلیں کاربن پیپر کی مدد سے تیار کی جا رہی ہوں شاعری کے اچھے قاری کی آنکھیں اور کان ایک طرح کی یلغار کی زد پر ہیں۔ ایسی صورت میں پڑھنے والے کے نظام حواس کا خدا ہی حافظ ہے۔ کچھ اسی قسم کے تاثر یا تعصب کی وجہ سے میں خالد محمود کا "سمندر آشنا" نہیں پڑھ سکا۔ درمیان میں جب یہاں کی شعری نشستوں میں ان کا کلام سنا تو محسوس ہوا کہ تنقید نگار کے لیے خود مدافعتی تو اچھی چیز ہے مگر اس کے اندر مزاحمت کی کیفیت کا پیدا ہو جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ کبھی کبھی آوازوں کے اس ہجوم میں جس سے ہندستان میں آج کی اردو شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ عبارت ہے کوئی نہ کوئی آواز ایسی بھی ضرور ابھر آتی ہے جس کا اپنا چہرہ ہوتا ہے یا جس میں چہرے کا امکان پوشیدہ ہوتا ہے۔

خالد محمود کے "سمندر آشنا" میں مجھے ایک ایسے ہی چہرے کا امکان نظر آتا ہے۔ ان کی حالیہ غزلوں میں مجھے اس امکان کی بشارت ملتی ہے۔ ان میں اپنی آواز کو پانے کی ایک ایسی تخلیقی خلش ہے جو اگر باقی و برقرار رہی تو مجھے امید ہے کہ وہ اپنے آپ کو منوا لیں گے۔ مجھے ان کی بعض غزلوں میں احساس کی ایک ایسی ذہانت نظر آتی ہے جس سے اگر انھوں نے کام لیا تو جہاں ایک طرف تو وہ اس جھوٹی رومانیت سے بچ جائیں گے جو اس عمر کے اکثر شعراء کو خراب و خوار کرتی ہے تو وہیں دوسری طرف ان میں وہ نئی ہوش مندی بھی پیدا ہو جائے گی جو جدید زندگی کے پیچیدہ تجربے کے اظہار کے لیے لازمی ہے۔

غزل آسان طور پر مشکل فن ہے۔ خالد محمود کی غزلوں سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے صنفِ سخن کے مطالبات کو سمجھا ہے اور اس کی روایت میں جدت کے مفہوم سے اچھی طرح واقف ہیں مجھے امید ہے کہ اس آگہی کی حدود میں مزید وسعت کے ساتھ معجزہ ہائے سخن ان کی دسترس میں آتے جائیں گے۔ انھیں اپنی نظر پر اعتماد ہے اور وہ اپنے طور پر دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ احساس و نظر کی انفرادیت پر ان کا یہ اعتماد اپنی کرشمہ سازیاں ابھی سے دکھا

رہا ہے۔ اس اعتماد نے ان کی غزلوں کو ایک ایسا طنزیہ لہجہ بخشا ہے جو پڑھنے والوں کو متوجہ کرتا ہے مگر اس لہجے کے ساتھ ایک خطرہ بھی ہم رکاب ہے۔ اکثر نئی غزل کے شعرا اس لہجے کی راہ سے احساس و اظہار کے ایک طرح کے سفلہ پن کی طرف جا نکلتے ہیں جس میں کرشمے سے زیادہ کرتب کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ خالد محمود اور بہت سی ترغیبات کے ساتھ اس طرح کی ترغیب شعری پر بھی قابو حاصل کر سکیں گے۔

ان کے وہ چند شعر دیکھیے جن کی بنیاد پر میں ہی کیا دوسرے بھی ان سے بجا طور پر توقعات وابستہ کر سکتے ہیں۔

برائے تشنہ لب پانی نہیں ہے سمندر کا کوئی ثانی نہیں ہے

ترے ساتھ چلنے کی عادت نہیں ہماری نہ کر آزمائش ہوا

دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی ایک دستِ ناز یاد کا شانہ دبا گیا

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں زمانہ بھر کو جو لبِ نہر دکھائی دیتا ہے

کوئی شے گھر کی خوش نہیں آتی وہ برس دو برس سے باہر ہے

قافلے میں ہم اس مقام پہ ہیں جو صدائے جرس سے باہر ہے

زخمی ہوا بدن تو وطن یاد آگیا اپنی گرہ میں ایک روایت لہو کی تھی

ہر چہرہ ایک سوال ہے یادوں کی بزم میں شاید میں امتحان کے کمرے میں آگیا

جس میں خالی ہے کرائے کا مکان اس گلی میں نہیں رہتا کوئی

مایوس اور پامال آوازوں کے 'کرائے کا مکان' بھی 'بود و باش' سے گریز کی راہ اپنانے والے شاعر سے امید کی جا سکتی ہے کہ اس کے لیے اپنی آواز کے بارے میں اعتماد کے ساتھ رہنا مشکل نہیں ہوگا (انور صدیقی)

بہتا پانی

شاعر: احمد وصی
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵
قیمت: پندرہ روپے

شاعری داخلی تحریک بھی ہے اور خارجی کوشش بھی۔ اس کو اساتذہ کی پرانی زبان میں

اگر کہا جائے تو الہام اور اکتساب کے اچھے امتزاج سے اچھی شاعری پیدا ہوتی ہے۔ جب غالب نے کہا تھا کہ "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" تو دراصل غیب انسان کا وہ داخلی شعور تھا جو خارجی حقائق کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ احمد وصی کی شاعری آج کے عہد کی شاعری ہے جو ظاہر ہے کہ آج کے کربناک حالات سے متاثر ہوگی۔ اس کی ایک اچھی مثال ان کی نظم "نئی کربلا" ہے۔ بیسویں صدی اور جنریشن گیپ بھی اس میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ ان کی شاعری پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر کا نوعمر ذہن وقت کی سفاکیوں کے سامنے پسپا ہونے کے بجائے ان کا امتحان کر رہا ہے۔ اس کوشش میں انھوں نے نئے شعری پیکر تراشے ہیں اور ان کے ذریعے سے احساس کی نئی سطحیں چھونے کی کوشش کی ہے۔

احمد وصی نے ابھی اپنے شعری سفر کی ابتدا کی ہے اور سامنے ایک طویل راستہ ہے کیوں کہ راہ سخن جو ہزاروں سال پرانی ہے اس پر چلنے کے لیے اور آگے بڑھنے کے لیے نئی حوصلہ مندی اور امنگ کی ضرورت پڑے گی۔ اس شاعری میں اس نوجوان کے احساس کی تلخی بھی ہے جو بہت کچھ امیدیں رکھتا ہے اور اس شاعر کے لہجے کی مٹھاس بھی ہے جو ہر تلخ کو گوارا بنا لینے کا فن جانتا ہے میں ان کو نئے سفر پر مبارک باد دیتا ہوں۔ (سردار جعفری)

آوازِ دل

شاعر: جولیس نحیف دہلوی
ناشر: ماہ نامہ شان ہند، نئی دہلی ۲
قیمت: پندرہ روپے

مسیحی اہل قلم نے اردو ادب میں قابلِ لحاظ اضافہ کیا ہے۔ ان میں جولیس نحیف دہلوی شامل ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "آوازِ دل" ماہ نامہ شان ہند دہلی نے شائع کیا ہے۔

"آوازِ دل" میں رباعیات، قطعات، غزلیات درج ہیں۔ ان کے علاوہ وطنی نظمیں ہیں۔ تیوہاروں پر نظمیں ہیں۔ شخصیات پر نظمیں ہیں۔ یسوع مسیح پر عقیدت مندانہ نظم ہے۔

مروجہ زمینوں میں نحیف نے بعض اشعار اچھے نکالے ہیں۔ مثلاً ؎

گوشے گوشے میں مرے دل کے نظر آئیں گے آپ   چیر کر دل کو اِدھر سے یا اُدھر سے دیکھیے

شاعر نے اپنے حالاتِ زندگی اور شاعری کے بارے میں خود لکھا ہے وہ موج زیبائی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہیں۔

جولیس نحیف کے یہاں بعض انسانی تجربوں کو پیش کیا گیا ہے۔ واردات قلبی کی سرگزشت بھی ہے نفسیاتی عنصر بھی۔ اس کے ساتھ زندگی میں روشنی پر مکمل اعتماد یہ رجائی پہلو قابلِ قدر ہے۔ درج ذیل اشعار میں ان اوصاف کی تلاش کی جاسکتی ہے:

یادِ محبوب ترا ساتھ دیا ہے میں نے   کس خطا کے لیے تو مجھ کو سزا دیتی ہے
رفتہ رفتہ حیا جاتے گی   پہلی پہلی ملاقات ہے
ہزاروں بار تاریکی نے حملہ تو کیا لیکن   چراغِ آرزو کی روشنی مدھم نہیں ہوتی

(اسلم پرویز)

ناول اور افسانے

سالتواں آنگن

ناول نگار : صالحہ عابد حسین
ناشر : جیبی کتابیں، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
قیمت : آٹھ روپے

ہوشربا گرانی کے اس دور میں دیگر اشیاء کے ساتھ کتابوں کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اردو کی کتابیں چونکہ ہزار، پانچ سو کی تعداد میں چھپنے کے باوجود کئی کئی سال میں بک پاتی ہیں اس لیے ان کی قیمتوں کو کم کرنا تقریباً ناممکن سا ہے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے بہرحال اس مشکل کا ایک حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور "جیبی کتابیں" سیریز کے ذریعے نامور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کم سے کم قیمت میں اردو والوں تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ "سالتواں آنگن" اس سیریز کے پہلے سیٹ کی پہلی کتاب ہے۔ اور اس کی مصنفہ ہیں بیگم صالحہ عابد حسین۔

تشکیل و تکمیلِ فن میں صالحہ عابد حسین کا حصہ تقریباً نصف صدی کا قصہ ہے "اپنی اپنی صلیب" اور "گوری سوئے سیج پر" جیسے متعدد ناول اور افسانوں کے مجموعے ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ اور اپنے وقت میں ان کی تقریباً ہر کتاب نے اردو کے ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ مولانا حالی کی سی شیریں، شستہ، دلنواز اور عام فہم زبان عصرِ حاضر کے لکھنے والوں میں سے معدودے چند کو ہی نصیب ہوئی ہے اور صالحہ عابد حسین ایسی ہی باقیات الصالحات میں سے ہیں۔ اسی مانجھی دھلی زبان میں صالحہ عابد حسین نے اپنے منفرد اسلوب کی تشکیل کی ہے۔ اور اس منفرد اسلوب کا آئینہ دار ہے "سالتواں آنگن"، زیرِ تبصرہ ناول میں ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

"یہ ہماری تیسری نسل۔ کتنے کو آنگن نصیب ہوتے ہیں ان میں۔ صاحبِ حیثیت بھی ہوں تو بس کمرے، بالکونیاں، گیلریاں اور ان میں لگے ہوئے ایئرکولر۔ ایئرکنڈیشن۔ ہیٹر مصنوعی ہوائیں، مصنوعی ٹھنڈک اور گرمی۔ مصنوعی زندگی۔ ان سے وہ آنگن کی محرومی کا مداوا کرتی ہیں بیچاریاں سمجھتی ہیں کہ عیش و آرام کے سب سامان فراہم ہیں انھیں۔ آنگن! بھلا یہ مصنوعات آنگن کا مقابلہ کرسکتی ہیں؟"

اسی پس منظر میں موجودہ مصنوعی زندگی اور ایک دو نسل پہلے کی حرارت سے بھرپور زندگی کا تضاد پورے ناول پر پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ زینب کی زندگی میں آنے والے میکے کا آنگن کالج کا آنگن، پردیس کا آنگن، سسرال کا آنگن، پیا کا آنگن، بیٹے کا آنگن ان صفحات پر اپنی تمام تر لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں پرانی وضعداریاں، رشتوں کی تقدیس اور پھر ان کی شکست و ریخت کے تناظر میں ناول اس طرح سانس لیتا ہے کہ پڑھنے والے خود کو اس منظر کا ایک جزو سمجھنے لگتے ہیں اور آخر میں زینب کی موت کے دلگداز منظر کے ساتھ سالتواں آنگن یعنی دوسری دنیا کا ہلکا سا آنگن میں نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بلاشبہ "سالتواں آنگن" اپنی طرز کے ناولوں میں ممتاز ترین ہے۔

پچھلے دنوں ایک صاحب گلہ مند تھے کہ صالحہ آپا کے ناول میں اخلاقی اقدار پر بڑا زور ہوتا ہے، کاش انھوں نے موصوفہ کو قریب سے دیکھا ہوتا۔ پھول سے یہ شکایت کہ ہے وہ مہکتا کیوں ہے، عجیب سی لگتی ہے (ڈاکٹر مظفر حنفی)

پَر کٹی تتلی

ناول نگار: ہنسراج رہبر
پبلشر: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز جے ۶ کرشن نگر دہلی ۵۱
قیمت: تیس روپے

آج کل اردو ادب میں حسیت، اور حقیقت، کے پسندی کے الفاظ ہر قلم کار کے قلم سے بے محابا ٹپکنے لگے ہیں لیکن تخلیقی کارناموں پر جب کوئی تبصرہ نگار یا ناقد مذکورہ اصول کی روشنی میں تبصرہ یا تنقید کرتا ہے تو اردو کے اہل زہد کی جبیں پر شکن پڑ جاتی ہے۔ اسی ادا نے مصلحت کا ایک کشتہ ہنسراج رہبر بھی ہے۔ "غالب حقیقت کے آئینے میں" اس مصنف کی ایسی تصنیف ہے جس کو استدراج کی حد میں داخل کر کے بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیا گیا۔ پریم چند "ترقی پسند ادب۔ ایک جائزہ" بھی ایک عام روش سے ہٹ کر قاری کو سوچنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

ہنسراج رہبر نقاد، کہانی کار اور ناول نگار ہیں۔ اردو ہندی دونوں زبانوں میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہ مارکسی نقاد اور ترقی پسند ادیب ہیں۔ ان کا ناول "پرکٹی تتلی" ان کے مشاہدے اور حسیت کی دین ہے۔ اس کے بارے میں ناول نگار نے لکھا ہے:

ص ۶۔ "اصل مقصد موجودہ سماج کا تجزیہ کرنا اور اس کے متضاد رجحانوں کو اجاگر کرنا ہے مستقبل کی راہ ہموار کرنے والا صحت مند رجحان۔ بیمار رجحان سے مغلوب ہے۔ کیوں مغلوب ہے؟ شاید قاری کو اس ناول سے یہ بات سمجھنے میں مدد ملے۔"

اس ناول کے کرداروں میں ماہر اقتصادیات ڈاکٹر ہنسراج ہیں جو بائیں بازو کے دانش ور ہیں سبھدرا بیوی ہیں اور نریندر بیٹا۔ بان سنگھ ملازم۔ ان تمام کرداروں اور دوسرے جدیدیت پسند کرداروں کو حیرت میں ڈالنے والی ہیروئن مینا ہے جو لکھنؤ کے مشہور وکیل گھرانے کی چشم و چراغ ہے۔ ناول نگار نے کئی مقامات پر قاری کے ذہن کو جھٹکے دیے ہیں اور اسے ہوش دلایا ہے کہ سیکولرزم، قومی یک جہتی اور گنگا جمنی کلچر لکھنے کے لیے اور ہونٹوں پر سجانے اور گنگنانے کے لیے بڑے خوب صورت الفاظ ہیں مگر یہ نعرے یہ اقدار زندگی میں داخل نہیں ہو پاتے۔ روح میں سرایت نہیں کر پاتے۔ اسی لیے جب مینا اور انیس جیون ساتھی بننے کے لیے فرار ہو جاتے ہیں تو گنگا جمنی کلچر کے پروردہ اور علم بردار وکیل انیس کے خلاف مینا کو اغوا کرنے کی رپورٹ تھانے میں لکھوا دیتا ہے۔

حیرت کا عنصر ناول میں اس وقت داخل ہوتا ہے جب مینا اپنی یادداشت کھونے کا بہانہ کر کے نریندر کے گھر بہو بن جاتی ہے اور کہانی کا کلائمکس یہ کہ مینا نے نریندر، گرمیل اور انیس تینوں کو دام فریب میں مبتلا رکھا اور جداگانہ طور پر ازدواجی زندگی کو ٹکڑوں میں بانٹے رکھا یہاں ان کرداروں کی کہانی ان ہونی نہیں ہے۔ خام تہذیب، ہندستانی صحت مند روایات کی بے قدری اور مغربی ہپی ٹائپ رو کا بہاؤ نئی نسل کو گمراہ کر رہا ہے۔ نئی نسل اور پرانی نسل میں فاصلہ خربوزہ اور چھری کا رد عمل رکھتا ہے۔ سب سے خطرناک صورت حال یہ ہے کہ ملک کی دانش ور

جماعت اور سیاسی پارٹیوں میں تضاد اور تصادم کا عمل جاری رہے اس لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ذہن منتشر اور مذبذب ہیں۔

کتابت کی بعض غلطیاں دور کرنے کی ضرورت ہے۔ ص ۵۰، ۵۱ حامی اس کو "ہامی" لکھنا چاہیے۔ ص ۵۶ - کو "ہنی" "ذہنی" لکھنا چاہیے۔

ناول میں جدید شاعری، سیاست، ہندستانی اقدار اور نظریاتی مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ زبان اور اسلوبِ بیان میں دلچسپی کے تاثیر کے عناصر ہیں۔ ناول عمدہ چھپا ہے۔ سرورق رنگین ہے۔ ہیروئن اور تتلی کو آرٹ میں ابھارا گیا ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

ایک آنکھ والا ہرن

افسانہ نگار : اوم کرشن راحت

ملنے کا پتہ : ادبی سنگم ۱۵۲/۵.۷۔ فرید آباد ٹاؤن شپ

قیمت : پندرہ روپے

اوم کرشن راحت کا شعری مجموعہ "شفق زار" منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اردو اکاڈمی لکھنؤ سے انعام ملا تھا۔ اب ان کی ادبی شخصیت کا دوسرا پہلو سامنے ہے۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ افسانوی مجموعہ "ایک آنکھ والا ہرن" ہریانہ ساہتیہ اکیڈمی چندی گڑھ کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔

اس افسانوی مجموعے میں بارہ کہانیاں ہیں۔ کوئی کہانی کرتب دکھانے والی نہیں ہے یعنی ابہام کی گتھی ہے نہ علامت کا تماشا نہ اساطیری کردار نہ مغلق عبارت ۔ ہر کہانی کی فضا ہندستانی ہے۔ فرق تاریخی ادوار کا ہے۔ "ایک آنکھ والا ہرن" نواب اور مہاراجا کی زندگی کا عکاس ہے۔ "چراغوں کا دھواں" خان صاحب اور رائے صاحب وغیرہ کے دور کی یادگار ہے مگر اس کا غالب حصہ نئے ہندستان کی زندگی اور عبوری دور کی کشمکش لیے ہوئے ہے۔ "تیسرا گھر" تقسیم ہند کے سانحے کی روداد ہے۔ "یہ فاصلے یہ دوریاں" بھی اُسی سانحے کی بازگشت ہے۔ پاکستان کے ملٹری حکمراں نے دلوں کے رشتوں کو جنگ جوئی کے عمل سے کاٹنا چاہا مگر خورشید احمد کے بیٹے ارشد نے اپنے باپ کے دوست بابو پریم کرشن کے یہاں پناہ لی۔ چچا بھتیجے کا رشتہ اب بھی مستحکم تھا اور بابو پریم کرشن نے ارشد کی خاطر جو ایثار کیا وہ نہ صرف قومی یک جہتی کا نمونہ ہے بلکہ وطن، مذہب اور انسانیت کی تعریف کے دائرے میں ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔ "رشتہ" ایک نفسیاتی کہانی ہے۔ دوسری کہانیوں میں افسانہ نگار نے آزاد ہندستان کی غریبی، اقتصادی استحصال، سرمایہ دار طبقے اور موقع پرست سیاسی لیڈروں کی زندگی، ان کے ماحول اور ان کے ہتھکنڈوں کا مشاہدہ کیا ہے اور سماج میں پھیلنے والے مہلک جراثیم کا ذمہ دار سرمایہ دار طبقہ کو قرار دیا ہے اور "غریبی" کو اخلاقی گراوٹ کی بنیاد سمجھا ہے۔ چنانچہ "نخعہ" "دوسرا زخم" "برف کی سِل" وغیرہ کہانیاں سماج کے اس روگ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اب افسانہ نگار سے بھی تھوڑی دیر ملاقات ہونی چاہیے۔
دوکان کوئی لفظ نہیں۔ اصل لفظ (دُکان) ہے۔
جھاگ کو مونث نہیں مذکر لکھنا چاہیے۔
"چراغوں کا دھواں" اچھی کہانی ہے مگر افسانہ نگار نے اس کو قدیم اخلاقی معیار پر تیار کیا ہے۔ اسی لیے "خانۂ چہار باغ" کو "چراغوں کا دھواں" بنا دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کہانی Generation Gap کی کہانی ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت ہے۔ اخلاقی قدر سے اس زندگی کا جائزہ لینا دراصل تاریخی عوامل و محرکات سے راہِ فرار اختیار کرنا ہے اور اس کا انجام معلوم!
خاں صاحب آخر کار اپنے وفادار ملازم فقیرا کے جھونپڑے میں زندگی کے باقی دن گزارنے پر آمادہ ہوگئے یہ کہانی کی کمزوری اور کردار کی شکست ہے۔
افسانہ نگار کی دو کہانیاں افسانے کے آرٹ کی نمائندہ ہیں (۱) "ضمنی چناؤ" کہانی پن کے علاوہ صدیق اور عابدہ کے کردار بڑے جان دار ہیں۔ (۲) "بدھفتر" یہ کہانی اس مجموعے میں شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ کہانی کی تکنیک بھی الگ اور پسندیدہ ہے۔ ایک کردار اور ایک جام نے سماج کے متعدد کرداروں کا جائزہ پیش کر دیا ہے اس کردار میں ہمدردی ہے۔ سماج کی بہبود کا جذبہ ہے۔ دوست کی رفاقت ہے اور انسان دوستی کا گہرا رنگ ـــــ ایثار ـــــ کتاب عمدہ چھپی ہے سرورق رنگین ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

آخری رات

ناول نگار :- سلیمان زیدی
ناشر :- رنگ محل پبلی کیشنز، ۳۔اے ڈی، رام پورم مظفر نگر (یوپی)
قیمت :- ۶ روپے

سلیمان زیدی نے کہانیوں سے اپنے قلم کی جنبش کا آغاز کیا تھا۔ وقت اور مساولت کے سہارے اب وہ قلم ناول تک آ پہنچا ہے۔ ناول نگار کا ناول "آخری رات" قارئین کے سامنے ہے۔ سلیمان زیدی نے اس سے پہلے اپنی تصنیف "سادات بارہہ کا تاریخی جائزہ" پیش کی تھی۔
"آخری رات" میں تمام کردار شہنشاہیت کی یادگار ہیں۔ اس کا آغاز قبائلی زندگی سے کیا گیا ہے۔ پورا یہ ایک ایسا ملک ہے جس میں ریگستان اور پہاڑوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ بھیڑ بکری پالنا وہاں کا پیشہ اور ذریعہ معاش ہے۔ تنگ دستی کی زندگی قبائل کا مقدر ہے۔ بحران کی تقدیر چمکتی ہے۔ وہاں پیٹرول کی دولت میسر آتی ہے اور محل میں بادشاہ، وزیر، شہزادے، شہزادیاں اور کنیزیں اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ ابتدا میں دو قبیلے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں ایک قبیلہ نعود ہے اور دوسرا قبیلہ عشر ہے۔ پہلا قبیلہ اعتدال پسند اور دوسرا قدامت پرست تھا۔ اس ذہنی تضاد کے باعث بھی دونوں میں نبرد آزمائی رہتی ہے۔
قبیلہ نعود کی حکومت تھی۔ اس کا بادشاہ خرابی صحت کی بنا پر محل میں اپنا وقت گزارتا تھا اور سلطنت کا انتظام اپنے بھتیجے کے سپرد کر دیا تھا۔ نوجوان بھتیجے میں محل کی رنگینیاں لبریز

کرگئیں اور اس کا کردار بالکل قدیم داستانوں کے کردار سے ملتا جلتا ہو گیا۔ نشہ آور سفوف کھانے کے بعد اس کی جنسی جس نے وہ سب کچھ کیا جو محلوں کی زندگی میں ہوتا رہا ہے۔ آخر کار اس کا ردِ عمل سامنے آتا ہے۔ رابعہ دراصل شہزادے کی زندگی پر تابو یافتہ تھی۔ دربار کے امیروں میں تشویش کے آثار پیدا ہوئے اور سردار احمد نے ایک میٹنگ میں محمد علی کا تعارف کرایا۔ "الفتح" ایک باغی جماعت زیر زمین وجود میں آچکی تھی۔ محمد علی اس کا لیڈر تھا۔ محل کے رازِ درون کی معلومات کے لیے ایک سراغ رساں لڑکی مینو کی خدمات حاصل کی گئیں۔ نادرہ اور بہزاد دوسرے کردار ہیں جن کے سہارے ناول آگے بڑھتا ہے۔ اس ناول میں یورپین کردار بھی داخل ہیں جن کی موجودگی نے ناول کو قدیم داستانی اور شاہی محل کی فضا کے ساتھ قارئین کو آج کی سیاست سے بھی روشناس کرایا ہے۔

اس ناول کا انجام طربیہ ہے۔ پورا بیہ میں شہنشاہیت کی جگہ الفتح کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ سربراہ محمد علی ہے۔ حلال، بہزاد اور دیگر جانبازوں کو وزارت میں داخل کر لیا گیا۔ اس تبدیلی حکومت میں بڑا کارنامہ امینہ کا ہے۔ وہ اسپین میں سکونت پذیر تھی۔ اس کو پچاس ہزار ڈالر کی رقم معاوضہ خدمت کے طور پر پیش کر دی گئی۔

اس ناول میں جنگ کے علاوہ مہم جوئی، جنس اور سراغ رسانی کے عناصر ہیں۔ سرورق رنگین اور خوب صورت ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

نئے روسی افسانے

مترجم: منظر سلیم
ناشر: دارالاشاعت ترقی تاشقند شاخ
قیمت: بیس روپے

"سوویت یونین" میں بدلتی ہوئی خوش حال زندگی کے ساتھ اشتراکی نظریے کی روشنی میں ادب کی سطح اور جہت بدلتی رہتی ہے۔ فن کاروں میں درمیانی نسل کے افراد کو پوری آزادی اور ہر ممکن سہولت میسر ہے۔ اسی کا نتیجہ "نئے روسی افسانے" کی اشاعت ہے اصل میں یہ ۱۹۶۰ء کے بعد کی تحریروں کا انتخاب ہے۔ اس میں سات معروف افسانہ نگاروں کے سات افسانے بہ ترتیب ذیل شامل ہیں۔

۱۔ نشرگنی کرو تیلین (ابر گزراں) ۲۔ ولنتین رسپوتین (سبق) ۳۔ نکولائی ایودوکیموف (دل ناداں) ۴۔ یوری نگیبن (گلِ نغمہ) ۵۔ وکتور استافییف (واپسی کی پہلی رات) ۶۔ یوگینی نوسوف (یادجان نثاروں کی) ۷۔ میخائیل الکسییف (آخری سہارا)

روسی افسانے کا اہم عنصر خارجی حقیقت پسندی سمجھا جاتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے بھرپور فن میں زندگی کو پیش کرتا ہے اور زندگی کو عوام کی بہبود کے لیے بدلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہی جوہر ان افسانوں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ فسطائیت کے خلاف سوویت عوام نے پامردی سے کامیاب جنگ لڑی اور حبِ وطن کا نادر ثبوت پیش کیا۔ سوویت کے ان عظیم عوام کی

شخصیت، کردار اور مزاج نیز ذہنی سطح کے ان گنت روپ ہیں جن سے وہاں کی زندگی، نظام حکومت، ماحول اور نونہال بھی باغ و بہار ہیں۔ اسی باغ و بہار فضا میں افسانوں کے کردار متحرک اور فعال نظر آتے ہیں۔ دنیا کا محنت کش طبقہ ان افسانوں میں اپنی زندگی کے آثار دیکھ سکتا ہے۔ حوصلہ پا سکتا ہے اور اپنے مطمح نظر کے مطابق اپنی زندگی بنانے کے خواب دیکھ سکتا ہے۔ اور پھر ان خوابوں میں تعبیر و تعبیر کا رنگ بھر سکتا ہے۔ ان افسانوں نے درمیانی نسل کے ان افسانہ نگاروں کو قبولیت عطا کی۔ شہرت عطا کی اور ادب کی دنیا میں ناموری کا مقام عطا کیا ہے۔ اسی لیے سوویت یونین کی بہت سی قومی زبانوں میں ان تخلیقات کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ادبی انعام مرحمت کیے گئے ہیں۔ بلکہ بعض افسانوں سے فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔

"نئے روسی افسانے" کا اڈیشن انگریزی میں شائع ہو گیا ہے ان بکھرے ہوئے اشاروں سے مذکورہ فن کاروں کے افسانوں کی قدر و منزلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس افسانوی مجموعے میں ہر ایک افسانے سے پہلے افسانہ نگار کے مختصر مگر جامع حالات زندگی بھی درج ہیں۔ افسانہ نگار کے فن، محرکات اور تخلیقات پر تنقیدی اشارے کیے گئے ہیں۔

۵۹۲ صفحات کی یہ کتاب ٹائپ میں بہتر بن کاغذ پر چھپی ہے۔ سرورق کی سادگی اور جلد کی پائیداری دیدنی ہے۔ اس کے باوجود قارئین کا مشورہ درکار ہے۔

پتا: دارالاشاعت ترقی کی شاخ۔ ۳۰ لوائی اسٹریٹ، تاشقند (سوویت یونین)۔

عام قارئین کے علاوہ اردو افسانہ نگاروں کو "نئے روسی افسانے" کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ اردو ترجمے میں اصل کی روح کارفرما ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

آگ، الاؤ، صحرا

مصنف: قمر احسن
تقسیم کار: شب خون کتاب گھر الہ آباد
قیمت: ۲۵ روپے

جس طرح بجاطور پر شمس الرحمٰن فاروقی نے آگ الاؤ اور صحرا کے دیباچہ "قمر احسن۔ اثبات اور انکار کی کشمکش" میں یہ بات کہی ہے کہ انیسویں صدی میں "تاریخ کا جو میکانکی تصور عام ہوا تھا کہ تاریخ ہمیشہ تقریباً ایک سیدھی لکیر میں سفر کرتی ہے" وہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ امکانات یہ بھی ہیں کہ بعد میں آنے والا زمانہ پچھلے زمانہ سے بہتر نہ ہو، اسی طرح یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ بیسویں صدی میں جدید ادب کے بعض منفی اظہارات کا جو میکانکی تصور مغربی اثرات سے نشو و نما پا رہا ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ ادب کی ارتقائی شکل نہ ہو بلکہ محض اس کا ایک پیش خیمہ یا کیفیت معکوس، کیوں کہ زندگی اور اس کی تعبیرات جس میں یقیناً ادب بھی شامل ہے۔ ایک سیدھی لکیر کی شکل ہی ارتقا پذیر نہیں ہوتیں بلکہ ان کی کیفیت بڑی حد تک ای سی جی Electro-Cardiogram سے مماثل ہوتی ہے جس میں اتار چڑھاؤ برابر سے چلتے رہتے ہیں اور یہی مد و جزر زندگی کی ضمانت

بھی ہے اور زندگی کا ثبوت بھی۔ اشاریت اور ابہام کی طرف بڑھتا ہوا جدید افسانہ شاید اسی زمرہ میں شامل ہو لیکن ابھی سے کچھ حکم لگانا یقیناً قبل از وقت ہوگا۔ وقت بجائے خود سب سے بڑا پارکھ ہے، ہمیں یہ معاملہ فی الحال اسی پر چھوڑنا چاہیے۔

ایک معتبر قول کے مطابق افسانہ یا تو سماجی حقائق پر مبنی ہونا چاہیے۔ یا کردار کے داخلی نفسیات پر یا ان دونوں چیزوں پر۔ اگر اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر "آگ، الاؤ اور صحرا" کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں کچھ مخصوص تہذیبی اقدار اور ان سے ٹکراتی ہوئی سماجی تبدیلیوں کا نشیب و فراز اور ان میں ڈوبتی ابھرتی ہوئی شخصیتوں اور کشمکش میں مبتلا ذہنوں کی عکاسی جا بجا نظر آتی ہے۔ یہ عکاسی کہیں ساکت عکاسی Still Photography ہے کہیں عکاسی کے متروک طریقے Colour Transparency کی شکل اختیار کر لیتی ہے کبھی چلتی پھرتی تصویروں کے نقوش پیش کرتی ہے اور کہیں اور آگے بڑھ کر رنگین پاردرشی Photo Chronograph بن جاتی ہے۔

ہو سکتا ہے کچھ قارئین کو یہ احساس ہو کہ قمر احسن کے افسانوں میں اشاریت مقصود بالذات معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً اشاریت کا مقصد حقیقت کو مسخ کر کے پیش کرنا نہیں بلکہ پہلوداری اور رمز و معنویت کا لباس پہنانا ہی ہونا چاہیے مگر کیا کیا جائے کہ ہمارے کچھ نئے لکھنے والوں کو ابہام گوئی کچھ زیادہ ہی پسند خاطر ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے اپنے مقالہ "جدید افسانہ اور اشاریت" (شاعر: شمارہ ۴/۸۲) میں قمر احسن کے چند ایک افسانوں کو بلاشبہ اشاریت سے معمور پایا ہے۔ لیکن بیشتر افسانوں کو "کرتب بازی اور افسانوی ادب میں کارٹون نگاری کی بہترین مثال" قرار دیا ہے کیوں کہ ابہام اس قدر ہے کہ اہمال کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے، مضحکہ خیز اشاریت نے اس کو تجریدی ہی نہیں بے جہت اور بے منزل بھی بنا دیا ہے۔ ایسے ہی افسانوں سے اشاریتی افسانوں کا موقف مجروح ہوتا ہے۔ ان خیالات کی سر دست تردید یا توثیق سے قطع نظر صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ قمر احسن کی اشاریت کو سمجھنے کے لیے صرف مشرقی تہذیب سے روایتی واقفیت کافی نہیں بلکہ مشرقی علوم سے واقفیت بھی ضروری ہے کیوں کہ ان کی بہت سی علامتیں افہام و تفہیم کے لیے عربی زبان و ادب اور اسلامی اقدار و روایات سے آگاہی کا تقاضا کرتی ہیں۔

سولہ افسانوں اور ایک ناولٹ پر مشتمل اس مجموعے کے انتخاب و ترتیب کی ذمہ داری نیر مسعود نے انجام دی ہے اور یوپی اردو اکیڈمی کے جزوی مالی اشتراک سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

(سید محمود نقوی)

بند لبوں کی چیخ

مصنف: طاہر نقوی
پتا: ادارہ ممتاز مطبوعات کراچی
قیمت: بیس روپے

افسانے کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ پریم چند کا ہے۔ انھوں

نے پہلی بار ہماری روزمرہ زندگی کے مسائل کو افسانے کا موضوع بنایا ان کے یہاں خاص طور پر دیہات۔ اس کے گوناگوں مسائل، زمین دار کا ظلم و تشدد اور کسان کی بے چارگی، بے بسی اور زبوں حالی کو جس طرح لب اظہار ملا ہے اور دیہاتی زندگی جس طرح انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے اس کی مثال اس سے پہلے ہمارے افسانوی ادب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے افسانوں میں عینیت پسندی اور اصلاح کی کوششیں جھلکتی ہیں اور انقلابی رویے کی کمی محسوس ہوتی ہے، اس کے باوصف افسانے کو جدید رخ سے آشنا کرنے میں پریم چند کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ ان کے بعد آنے والے بیشتر افسانہ نگاروں کے یہاں ان کا اثر جابجا دیکھا جا سکتا ہے ایسے افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی، عزیز احمد، سجاد ظہیر، احمد علی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور قرۃ العین حیدر چند قابل ذکر نام ہیں۔ یہ وہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے نہ صرف پریم چند کی روایت کو تقویت پہنچائی اور آگے بڑھایا بلکہ جدید افسانہ نگاری کو نئے انقلابی رویوں سے ہم آہنگ کر کے اس کے اندر روشن امکانات پیدا کیے۔ ان امکانات سے ہمارے آج کے جن افسانہ نگاروں نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے ان میں ایک نام طاہر نقوی کا بھی ہے۔

طاہر نقوی کے افسانوں سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انھوں نے جدید افسانے کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے اس سے کما حقہ اکتساب فیض کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جدت کے پہلو بہ پہلو روایت کا نیازمندانہ احترام ملتا ہے۔ روایت کی چمک نے ان کی جدت طرازی کو ایک ایسی آن بان عطا کی ہے جو جدید افسانہ نگاری میں ان کے لہجے اور ان کی آواز کی پہچان کی ضمانت ہے۔ آج جب کہ علامت نگاری بے مقصدیت اور داوردول بینی نے ہمارے افسانے کو معمہ بنا دیا ہے اور قاری کے ذہن کو الجھنوں سے دوچار کر رکھا ہے۔ طاہر نقوی کے افسانوں کے مجموعے " بند لبوں کی چیخ" کی اشاعت ایک حوصلہ افزا اور خوش گوار امر ہے۔

روایت نے جہاں ان کی نظر بنانے میں اہم حصہ لیا ہے وہاں جدید زندگی کو سمجھنے کی کوشش نے ان کے شعور کی تہذیب و تربیت میں نمایاں کردار عطا کیا ہے۔ نتیجتاً ان کے افسانوں میں ہمیں جدید مسائل اور عصری تقاضوں کو سمیٹنے کا جو محتاط انداز ملتا ہے اس کی مثال نئی نسل کے یہاں بہت کم نظر آتی ہے۔ روزمرہ کے خام اور کھردرے واقعات کو افسانے کے روپ میں اس طرح ڈھال دینا کہ دلچسپی کے ساتھ ساتھ مقصدیت کا دامن کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ بڑا فنی سلیقہ چاہتا ہے۔ طاہر نقوی کے افسانوں میں اس سلیقے کا جابجا ثبوت ملتا ہے۔ وہ دور کی کوڑی لانے کے بجائے سامنے کے واقعات کو افسانے کا پیکر عطا کرتے ہیں جس کی وجہ سے اجنبیت کے بجائے ان پر سچائی کا گمان گزرتا ہے اور ہم ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کے مختلف ٹکڑے ہیں جنھیں اکائی کا اعتبار دیا گیا ہے اور کہانی میں یہ اعتبار زندگی پر مکمل اعتبار کے بغیر نہیں آتا۔

زندگی پر اعتبار اور واقعات کے "تناظر میں لمحوں، دنوں اور ماہ و سال کی زمانی تقسیم کو مکانی اکائی کی فکری و فنی صورت گری عطا کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لیے تجربے اور مشاہدے کی جو

ورا کی اور تیزی درکار ہے اس کا ثبوت طاہر نقوی کے افسانے فراہم کرتے ہیں۔ خارجی دنیا میں چھوٹے بڑے واقعات برابر رونما ہوتے رہتے ہیں اور ہماری زندگی پر اپنا عکس ڈالتے رہتے ہیں۔ ہم اپنے جن احساسات وجذبات کو خالص داخلی عمل کا نتیجہ سمجھتے ہیں وہ دراصل خارجی حالات کا پر تو ہوتے ہیں۔ داخلیت اور خارجیت کے عمل اور ردّ عمل اور دونوں کے باہمی تعلق کو سمجھے بغیر کوئی ادیب اپنی تخلیقات میں زندگی کی سچائیوں کی نشان دہی نہیں کر سکتا۔ وہ ادیب جو زندگی کے اس پیچیدہ عمل کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کا سلیقہ نہیں رکھتے وہ یا تو محض خارجیت نگاری کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس لیے اپنی نگارشات کو تخیل کی رنگینی عطا کرنے سے قاصر رہتے ہیں یا پھر دروں بینی کا شکار ہو کر خارجی دنیا کے بہاؤ سے کٹ جاتے ہیں اور اپنی ذات کے حصار میں قلعہ بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ ادیب جو پہلے خارجی دنیا سے اپنا موازنہ حاصل کرتے ہیں اور پھر اسے اپنے تجربے کا حصہ بناتے ہیں اور اس میں اپنے فن کا رنگ بھرتے ہیں تو ان کے اس شعوری عمل سے فکر وفن کا جو پیکر ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے اس میں ہمیں زندگی کی صداقتوں کا بھرپور احساس ملتا ہے اور ہم اسے اچھا ادب تسلیم کرنے میں کوئی پس وپیش نہیں کرتے۔ طاہر نقوی کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انھیں خارجیت سے کچھ لینے اور پھر اسے داخلی رنگ دیکر خارج کو واپس کرنے کا اچھا سلیقہ آتا ہے۔ خارجیت سے داخلیت اور پھر داخلیت سے خارجیت کی طرف یہی وہ سفر ہے جو طاہر نقوی کے افسانوں کو سچائی سے ہمکنار کرتا ہے اور ہمیں ان کے موضوعات کی شگفتگی اور تازہ کاری کا برابر احساس دلاتا رہتا ہے۔

ہر آن بدلتی ہوئی زندگی سے خام مواد کا صحیح انتخاب ہی ادب میں سب کچھ نہیں بلکہ اس کو بیانِ اظہار کی نئی خوبیاں عطا کرنا بھی ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس باب میں بھی طاہر نقوی کا فن ان کے سلیقے اور شعور کا واضح پتا دیتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ طریقِ اظہار کا انتخاب موضوع کی مناسبت سے ہونا چاہیے۔ خیال اپنے اظہار کے لیے خود الفاظ ڈھونڈ لیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

"جس لکھنے والے کے پاس خیال نہیں ہوتا۔ وہ پڑھنے والے کو الفاظ میں الجھانے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔ جب تک خیال ذہن میں واضح نہ ہوگا بیان میں اعتماد پیدا نہیں ہوگا۔ خیال کے ساتھ لفظ خود بخود ڈھلنے لگتے ہیں اور خیال کی غیر موجودگی میں الفاظ دھوکا دے جاتے ہیں۔"

موضوع اور اظہار کی یہی وہ مکمل ہم آہنگی ہے جو طاہر نقوی کی افسانہ نگاری میں توازن اور تناسب برقرار رکھتی ہے اور فکر وفن کا مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیتی۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ ان کے افسانوں کا مجموعہ "بند لبوں کی چیخ" جدید افسانہ نگاری میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔

(ناظر قادری)

شعلے بھڑک اٹھے

مصنف: نثار احمد صدیقی
ناشر: انڈین لینگویجز پبلیکیشنز میکلوڈ گنج گیا
قیمت: آٹھ روپے۔

اردو ادب میں ڈراما مشکل فن ہے۔ اس کے لیے خاص شعور اور خاص مزاج کی ضرورت ہے۔ ڈراما نگار کو عہد ماضی کی تاریخ، ادب کی روایات سے واقفیت، گردو پیش کے حالات پر گہری نظر رکھنی ہوتی ہے۔ مستقل محنت درکار ہے۔ یہ صبر آزما کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستند ڈراما نگار بہت کم ہیں۔ اور بہت اچھے ڈرامے بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ سید احتشام حسین نے ۱۹۳۷ء تک کے ڈرامے کا تجزیہ کیا اور لکھا تھا کہ جدید اردو ڈرامے کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی لیکن ڈرامے نے کوئی حالی، کوئی آزاد، کوئی نذیر احمد، کوئی شبلی، کوئی سرشار، کوئی اقبال اور کوئی جوش پیدا نہیں کیا۔ لیکن اب وہ بات نہیں۔ ڈراما نگاروں نے اس فن کو خونِ جگر سے سینچا ہے۔

ایک کاوش مصنف نے بھی کی ہے۔ یہ ڈراما ۱۹۷۶ء میں لکھا ہے اور سال ۱۹۸۳ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔ ایک گروہ ہے جو سماج دشمن عناصر پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک چودھری اور اس کا منیم ہے اور ایک پولیس افسر ہے جو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے زر جمع کرتے ہیں۔ دوسری طرف نوجوان لڑکوں کا ایک گروہ ہے جن کے دلوں میں سماجی اصلاح کی چنگاریاں ہیں۔ ان نوجوانوں کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک کو تو غنڈے ادھ موا کر کے چھوڑ جاتے ہیں لیکن وہ بچ جاتا ہے۔ آخر میں ان نوجوانوں کی کوشش سماج دشمن گروہ کو راہ راست پر لانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

یہ ایک خالص اصلاحی ڈراما ہے۔ مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ ڈراما میں حرکت ہے۔ عمل ہے۔ مکالموں میں برجستگی ہے۔ کردار اپنے موقف کی صحیح طور پر نمائندگی کرتے ہیں۔ البتہ موضوع بہت پرانا ہے۔ مخالف عنصر جو بہت کائیاں لوگوں پر مشتمل ہے، نوجوانوں کے سامنے ہتھیار ڈالتا نظر آتا ہے۔ کتابت طباعت اچھی ہے۔ قیمت مناسب ہے۔

(رام لعل نابھوی)

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں (ناولٹ)

ناول نگار: نقی تنویر
ملنے کا پتا: انگور گھر ۶۹۶-۱-۲۲ بازار نور خاں حیدرآباد
قیمت: دس روپے

نقی تنویر اردو ادب کی دنیا میں بہت معروف نہیں ہے۔ لیکن ان کا تازہ ناولٹ "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" عام ناولٹوں سے بہت مختلف اور بلند ہے۔ خوابوں کی ٹیڑھی میڑھی لکیروں کو اس طرح فن کا جامہ پہنانا کہ اس میں زندگی کی تلخیاں، اس کی شادمانیاں، اس کے تیکھے اور پھیکے نقوش بھر سماج کے نشیب و فراز ایک سانچے میں ڈھل جائیں، مشکل مرحلہ ہے لیکن اندری ترنین کی "سرریلزم" خوابوں کو سمیٹنے کے درپے رہتی ہے۔ ناول نگار یا ناول کے مبصروں نے سرریلزم کا حوالہ تو نہیں دیا ہے

لیکن کافکا کے ابہام سے اس کا رشتہ جوڑنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ دراصل آزاد طور پر سہی مگر تلازمے ایک کڑی سے دوسری کڑی ملاتے چلے جاتے ہیں اور یہی اس ناولٹ کی انفرادی کیفیت ہے اس ناولٹ میں خواب گوں اضطراری کیفیتیں ایک طرف تو ناولٹ نگار کی ذہنی اوڈیسی بن جاتی ہیں اور دوسری طرف سماجی رشتوں اور ناتوں کو رومانی آہنگ دے کر پرکیف بنا دیتی ہیں۔ یہ سب کچھ Association of Ideas کی تکنیک کو بروئے کار لانے سے ہی ممکن ہوا ہے۔

ناولٹ نگار کا ذہن بنیادی طور پر رومانی ہے۔ رومان پسندوں کی تخیل خاصی زرخیز ہوتی ہے، اس کا احساس اس ناولٹ سے بھی ہوتا ہے۔ "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں"، یقینی طور پر کوئی سفرنامہ نہیں ہے بلکہ رومانی ومادی رست وخیز کو ایک رفتار دے دی گئی ہے۔ اس لیے ناولٹ کی ٹوپوگرافی اگر بہت ابھرتی نہیں ہے تو اسے کوئی فنی ناکامی نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ مغرب کی عمومی یخ بستگی مکانی تصور کا نشان بن کر کئی علامتی ابعاد اختیار کرلیتی ہے۔

ناولٹ نگار نے تجریدی تصورات کو ٹھوس معنوی صورتوں میں پیش کر دیا ہے۔ حالاں کہ علامت نگاری عام طور سے غیر تجریدی عناصر کو بھی تجریدی بنا ڈالتی ہے۔

اس ناولٹ میں "قاری کے لیے فرحت کا سامان ہر جگہ موجود ہے"؛ اس کی ابتدائی مور بیڈ سٹی ناول نگار کے خوابی سفر کے ساتھ شادکامی میں ڈھل جاتی ہے، یہ ایک بڑی بات ہے میں اس ناولٹ کو نئے طرز کے خوابی سرریلی فکشن کے ذیل میں رکھنا چاہتا ہوں جس کے اسلوب سے بھی لطف اٹھایا جاسکتا ہے

کتاب کا سرورق عمدہ اور معنی خیز ہے مگر کتابت وطباعت نہ معلوم کیوں زیادہ بہتر نہیں۔ مجموعی طور پر میں نفی تنوبر سے اس طرح کی دوسری تخلیقات کی بھی توقع رکھتا ہوں اور قارئین کو اس تجربے سے شناسائی حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

آدھے ادھورے
(افسانے)

افسانہ نگار: خورشید عالم
ملنے کا پتا: کتاب منزل، تاتارپور روڈ۔ بھاگلپور (بہار)
قیمت: پندرہ روپے

خورشید عالم نئے افسانہ نگار ہیں اور "آدھے ادھورے" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ لیکن موضوعات کا جو تنوع اور احساس کی جو شدت اور صداقت خورشید عالم کے با ماجرا مختصر افسانوں میں موجود ہے، وہ ان کے روشن مستقبل کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر نریش، جوگندر پال، ستیش بترا، شاکر کریمی اور سراج نور نے مجموعے کی ابتدا میں جن نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے ان کے حقیقت میں تبدیل ہونے کا پورا امکان موجود ہے بشرطیکہ افسانہ نگار اپنا منفرد فنی اسلوب برقرار رکھ سکے۔

"آدھے ادھورے" میں ہر طرح کے افسانے شامل ہیں۔ کچھ ایسے افسانے بھی ہیں جو سماجی مسئلوں اور ٹوٹتے ہوئے رشتوں کے اسباب واثرات کو پیش کرتے ہیں۔ اور کچھ وہ افسانے ہیں جن میں بعض افراد

کے ذاتی احساسات و تجربات کی منظر کشی کی گئی ہے لیکن ان تمام افسانوں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان میں غیر ضروری توضیح و تشریح کہیں موجود نہیں۔ افسانہ نگار نے تقریباً ہر جگہ بے حد اختصار کے ساتھ اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو یہ احساس ہوتا ہے کہ کاش بات کچھ اور وضاحت کے ساتھ پیش کی جاتی۔

خورشید عالم کے اس مجموعے میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں، جن میں سے کچھ شاید فہرست میں اضافہ کرنے کے لیے شریک کر لیے گئے ہیں مثلاً صبح کا بھولا یا اسکائی لیب۔ لیکن چند افسانے ایسے بھی ہیں جو انسانوں کے لطیف ترین احساسات کو پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اس سلسلے میں "لمحے کا توازن" اور عمر کی دہلیز" کا نام لیا ہے۔ میں "احساس" کو بھی اسی زمرے میں رکھنا چاہتا ہوں۔ اس افسانے کا قصہ یوں ہے کہ ایک لڑکا کسی لڑکی سے پیار کرتا ہے مگر اس لڑکی کی شادی دوسری جگہ ہو جاتی ہے۔ وہ لڑکا اب بھی لڑکی کے لیے بے چین ہے۔ مگر محبت سے زیادہ انتقام کا جذبہ اس کے دل میں پرورش پا رہا ہے۔ وہ اس لڑکی کے جسم سے اپنے جسم کی آگ بجھانا چاہتا ہے۔ پھر یکایک وہ لڑکی اس سے ملنے آتی ہے اور اپنی دانست میں وہ اسے بہلا پھسلا کر اپنے اکیلے گھر میں لے جاتا ہے تاکہ اس کا جسم حاصل کر کے اپنے دل میں جلتی ہوئی انتقام کی آگ کو سرد کر سکے۔ مگر اسی وقت اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اب جو لڑکی اس کی گرفت میں ہے وہ ایک بے وفا نہیں بلکہ مجبور عورت ہے جو بے بس ہو کر پناہ کے لیے اس کے پاس آئی ہے۔ یہ احساس نہ صرف انتقام کی آگ کو سرد کر دیتا ہے بلکہ اس خوشی کو بھی غم میں بدل دیتا ہے جو اس سے بدلہ لینے کے تصور نے پیدا کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس نازک احساس کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے افسانہ نگار کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ اگر خورشید عالم اس طرح کے جذباتی مسئلوں کو آئندہ بھی پیش کر سکیں تو یقیناً کامیاب رہیں گے۔

"آدھے ادھورے" میں دو افسانے بھکاریوں سے متعلق بھی ہیں اور دونوں ہی بھکاریوں کی زندگی اور ان کے مخصوص مسائل کی بھرپور اور فن کارانہ عکاسی کے سبب دل کو چھو لیتے ہیں۔ "چاندنی رات کے مہجوار" اور "دردمند" جیسے تجربات کی فن کارانہ پیش کش بھی خورشید عالم کو افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک ممتاز مقام عطا کر سکتی ہے۔

مجموعی طور پر اس مجموعے کے زیادہ تر افسانوں کا پس منظر حزنیہ ہے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں یہ سماج کے افراد کی کہانیاں ہیں جو واقعی آدھے ادھورے ہیں مگر اپنے کرب کو سینے میں چھپائے ایک نارمل زندگی گزارنے کی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ خورشید عالم کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ بس انھیں انداز بیان پر توجہ دینی ہوگی تاکہ عبارت اس طرح خبط نہ ہو:

"لیکن کب تک؟ جب میلوں کے فاصلے، احساس خودداری کے طویل و فصیل اور خود اپنے احساسات کے ناقابل عبور خلیج ہمارے درمیان حائل ہو چکی ہیں"۔

خورشید عالم کے بہتر مستقبل کی توقع میں بھی کرتا ہوں۔ اور قارئین کو ان کے افسانوں کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہوں کیوں کہ ان افسانوں میں وہ زندگی کے کچھ نئے رخ بھی دیکھیں گے اور کچھ جانے پہچانے جلوے بھی۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

بازیافت

افسانہ نگار: عبید سیفی
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
قیمت: دس روپے

"بازیافت" جناب عبید سیفی کے ایک درجن، تین منی کہانیوں اور ایک طنزیہ کا مجموعہ ہے۔ مجموعے کی ابتدا میں پیش لفظ کے تحت افسانہ نگار کا تعارف کراتے ہوئے خالد عرفان نے بڑی سچی بات لکھی ہے کہ عبید سیفی کے افسانے دن بھر کی محنت کے بعد تفریحاً پڑھنے اور محظوظ ہونے کے لیے ہیں۔ ذہن کی ریاضت کے لیے نہیں۔ حقیقت بھی ایسی ہے کہ ابہام اور علامتوں کی پیچیدگی سے بے نیاز یہ افسانے دورِ حاضر کے دل شکستہ اور افسردہ انسان کے لیے ایک ایسے آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں وہ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات اور معصوم تمناؤں کے بنتے بگڑتے عکس دیکھتا ہے اور سکون کا احساس کرتا ہے۔ عبید سیفی کے بیشتر افسانوں کی بنیاد رومانی ہے مگر بدلتے ہوئے معاشرے کے حقائق پر بھی ان کی نگاہ ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ کہانی کہنے کا فن جانتے ہیں۔ اس لیے افسانے کے کسی بھی حصے میں قاری کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں آتی۔

عبید سیفی کے جن افسانوں نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ "پرستش" آئینہ کی پینٹ، فرار اور "بازیافت" ہیں۔ "الجھی ڈور" کی نفسیاتی کشمکش بھی اچھی ہے مگر اس کا انجام غیر متوقع ہے۔ البتہ "بازیافت" میں جس نفسیاتی کیفیت کو افسانہ نگار نے کہانی کے پیراہن میں سمیٹنا چاہا ہے وہ اہم ہے۔ آج کے حسن پرست سماج میں رحمت جیسی کتنی ہی لڑکیاں صرف اپنے معمولی خط و خال کے سبب لوگوں کی توجہ سے محروم جنسی خواہشات کی آگ میں تنہا جل رہی ہیں۔ ان کی نفسیاتی محرومی کیا کیا شکلیں اختیار کر سکتی ہے، اس کا اظہار بازیافت میں بڑی خوبصورتی سے ہوا ہے۔ اگر افسانہ نگار اس طرح کی نفسیاتی کیفیت کی گرفت میں لے سکے تو یقیناً کامیاب رہتا ہے۔ عبید سیفی سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔

عبید سیفی کے منی افسانے اچھے ہیں اور اس افسانوی مجموعے میں ان کی شرکت ایک حد تک مناسب بھی ہے لیکن طنزیہ مضمون "ڈسٹ بن" کی شرکت کا کوئی جواز میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس مضمون میں کہانویت ہے اور یہ ایک کامیاب طنزیہ مضمون ہے مگر اس کی اشاعت کے لیے کسی اور موقع کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

بہرحال میں عبید سیفی کو اس افسانوی مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اپنا ادبی سفر جاری رکھیں گے۔ اس مجموعے میں طباعت تو اچھی ہے مگر کتابت کی بہت ساری غلطیاں ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ قارئین کو یہ افسانوی مجموعہ ضرور پڑھنا چاہیے۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

وٹینگ روم

مصنف: ایس-ایم حیات
پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۲
قیمت: تیس روپے

اردو کے مرکزی علاقوں سے سیکڑوں میل دور جنوبی ہند میں رہ کر جو قلم کار اردو زبان و ادب کی تن دہی کے ساتھ مسلسل خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں ایس۔ ایم حیات کا نام انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی انفرادیت کا رمز یہ ہے کہ موصوف نے اپنے قلم کو تخلیق کی جگہ ترجمے کے وقف کر دیا ہے چنانچہ ہندو پاک کے متعدد ادبی رسالوں میں ان کے ترجمہ کردہ افسانے عرصے سے اہلِ نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے ہیں۔ تامل کے جے کانتھن اور اکھلن جیسے نامور افسانہ نگاروں کے فن پارے ایس۔ ایم حیات نے جس خوب صورتی اور مہارت کے ساتھ اردو میں منتقل کیے ہیں ان کا سبب غالباً یہ ہے کہ تامل ان کی مادری اور اردو دلپسندیدہ زبان ہے لیکن حال ہی میں ان کی کتاب "وٹینگ روم" منظرِ عام پر آئی ہے جس میں بنگالی زبان کے سبودھ گھوش، سمریش بسو، آنند شنکر رے، نریندر ناتھ مترا وغیرہ کے شاہ کار افسانوں کے کامیاب ترجمے شامل ہیں۔ پندرہ مختلف المزاج افسانہ نویسوں کے یہ افسانے براہ راست بنگالی سے نہیں، بلکہ انگریزی کے وسیلے سے اردو میں منتقل کیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود زبان کی روانی اور فطری پن میں کوئی فرق نہیں آیا اور یہ بات اردو پر مضبوط اور اہل زبان جیسی گرفت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے کتاب بہت خوب صورت انداز میں شائع کی ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

راگ بھوپالی

مصنف: صغرا مہدی
پتا: ناولستان، جامعہ نگر، نئی دہلی
قیمت: پندرہ روپے

"راگ بھوپالی" صغرا مہدی کا نیا ناول ہے جس کی ابتدا ناصر کاظمی کے اس شعر سے ہوتی ہے جو ناول کی تفہیم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

دہتے ہیں سراغ فصلِ گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

اس اعتبار سے ناول کا نام "جلے ہوئے بسیرے" بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن مصنفہ نے "راگ بھوپالی" جیسا غیر شاعرانہ اور غیر رومانی نام انتخاب کر کے نہ صرف پڑھنے والے کو اس کی معنویت پر سوچنے کا موقع عطا کیا ہے بلکہ اپنی ذہانت کا ثبوت بھی دیا ہے۔ راگ بھوپالی کا ذکر ناول میں شروع سے آخر تک کہیں بھی نہیں ملے گا۔ نہ اس میں کوئی کردار ایسا ہے جس کا تعلق موسیقی اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے ہو۔ پھر اس نام کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ وہ سوال ہے جو ہر قاری کے ذہن میں آ سکتا ہے۔ لیکن ناول کی ابتدا ہی میں راگ بھوپالی کی وضاحت اور اس کی اہمیت کی تفصیل ناول کی وجہ تسمیہ کے مسئلے اور کہانی کی تفہیم کو آسان کر دیتی ہے۔ لکھا ہے۔

"مدھوپ کلیان ٹھاٹھ سے نکلا یہ راگ، راگ بھوپالی کہلاتا ہے۔ یہ رات کے پہلے پہر کا راگ ہے۔ یہ ایک آزاد راگ ہے۔ اس میں صرف پانچ سر ہوتے ہیں۔ یہ راگ نامکمل ہوتے ہوئے بھی مکمل ہے۔ اس کے سارے سُر شدھ ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ایک راگنی ہے، راگ نہیں ہے۔"

چنانچہ ناول کے اختتام پر پہنچتے پہنچتے قاری کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ راگ بھوپالی دراصل ایک علامت ہے اس کردار کی، جو سارے ناول پر چھایا ہوا ہے اور بقول مصنفہ یہ راگ نہیں، راگنی ہے اور وہ راگنی ہے ناول کی ہیروئن رابعہ۔ جس کے گرد کہانی اور اس کے تمام کردار گردش کرتے نظر آتے ہیں۔

رابعہ شمالی ہند کے ایک معزز اور متمول گھرانے کی فرد ہے اور کئی بہن بھائیوں کی ایک بہن۔ جس کی آنکھ ایک ایسے گھر میں کھلی ہے جہاں صبح کا مٹ میلا اجالا پھیلتے ہی آنگن سے مرغ کے بولنے کی آواز آتی ہے اور بڑے سے تخت پر اماں نماز پڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور ابا دالان میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے چائے پیتے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں مختلف نوکر چاکر دست بستہ خدمت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے اپنی "بابیوں" یعنی مالک کی کمسن لڑکیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ جہاں زمین داروں اور تھانیداروں کے بچے بیل گاڑیوں میں بیٹھ کر علی الصبح تفریح کے لیے نکل جاتے ہیں اور گاؤں کے بوڑھے پیپل پر رہنے والے پیر جی کو بڑے احترام اور عقیدت سے سلام کرتے ہیں۔ اس خوف کے مارے کہ کہیں سلام نہ کرنے پر وہ انھیں اندھا یا لنگڑا بنانے کی سزا نہ دیں۔ لیکن قدیم تہذیبی روایات میں گھرے ہوئے ماحول میں پل کر بھی رابعہ روایت پسند نہیں بن پاتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی حساس فطرت اور باریک مشاہدے نے اکثر اسے ایسے منظر دکھائے ہیں کہ جن سے وہ ایک ہی نتیجہ نکالتی ہے اور وہ یہ کہ ہمارے معاشرے میں عورت صدیوں سے مرد کی غلامی کا شکار ہوتی رہی ہے۔ وہ چاہے شمشاد چا کی بیوی ہو، اس کی اماں ہوں، یا رقیہ پھوپھی یہی وجہ ہے کہ اسے شادی سے دلچسپی ہے نہ ازدواجی زندگی کا شوق۔ یہاں تک کہ جب اس پر جان نچھاور کرنے والے عادل سے اس کی شادی کی بات چیت ٹھہرتی ہے اور بہن بھائی اسے یہ یاد کرا دیتے ہیں کہ اب عادل جلد ہی اس کا مجازی خدا بننے والا ہے تو بے ساختہ اس کے پردۂ ذہن پر اپنے عزیزوں اور جاننے والوں میں سے کتنے ہی مجازی خداؤں کے چہرے ابھر آتے ہیں۔ اس کے ابا جو صابر و شاکر اماں کے ہوتے ہوئے بھی دوسری عورت میں دلچسپی رکھتے تھے، اپنی معصوم اور بے گناہ بیوی کو خون میں نہلاتے ہوئے شمشاد چا، خوب صورت، سلیقہ مند اور خوش مزاج رقیہ پھوپی پر چیختے چلاتے ہوئے عاصم پھوپا کہ جن کا تعارف پھوپی کے بھائی افسرِ اعلیٰ سے کروانا بھول گئے تھے۔ بخار میں جلتے ہوئے چھوٹے بیٹے ببیا کو باجی کی شفیق گود سے الگ کرکے، اپنے ساتھ لے جانے والے بے رحم دولہا بھائی۔ اور نہ جانے کون کون۔ جن کو وہ اپنی یادداشت کی سب سے بڑی تہوں میں دبا کر رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن پردۂ ذہن پر ابھرنے والا ہر منظر اسے صرف ایک حقیقت کا نقیب نظر آتا ہے۔ بس ایک حقیقت — کہ اس معاشرے میں ہر مرد، وہ کتنا ہی پڑھا لکھا، ذی ہوش اور انصاف پسند کیوں نہ ہو، عورت کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اور اسے اپنی مرضی سے جینے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود۔ رابعہ کو ایک ہلکی سی امید ہے کہ عادل اس قسم کے مجازی خداؤں میں سے نہیں ہو سکتا جو اس پر پابندی لگائے۔ وہ یقیناً آزادی سے اپنا کام

کر سکے گی۔

مگر شادی کے بعد عادل اور رابعہ کی فطرتوں کا یہ تضاد کبھی کبھی نظریاتی اختلافات کو بھی جنم دیتا ہے۔ خصوصاً ایسے موقعوں پر جب عادل چاہتا ہے کہ رابعہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت صرف اس کے ساتھ صرف کرے جب کہ رابعہ اپنے افراد خانہ کی خدمت میں مصروف رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ اسے اپنے والدین کی خدمت اور دیکھ بھال سے مسرت ہوتی ہے۔ لیکن عادل کا یہ نظریہ ہے کہ شادی کے بعد لڑکی کو اس کا حق نہیں رہتا کہ وہ اپنے ماں باپ سے محبت کرے۔ ان کی خدمت کرے اس لیے کہ وہ شوہر کی ملکیت ہو جاتی ہے۔

اختلافات بڑھتے ہیں اور روز بروز ان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس میں کچھ تو عادل کی غلط فہمیاں ہیں لیکن زیادہ دخل رابعہ کی خود رائی اور خود پسندی کو ہے۔ وہ اتنی خود سر ہے کہ عادل کے اصرار کے باوجود بھی اپنا نام نہیں بدلتی اور رابعہ ترمذی سے رابعہ انصاری بننے کو تیار نہیں بلکہ یہ کہہ کے ٹال دیتی ہے کہ "بھئی جب ہم نے خود کو ہی تمہارے حوالے کر دیا تو پھر نام وام میں کیا رکھا ہے!"

عادل مفاہمت پسند ضرور ہے لیکن رابعہ کی یہ حرکتیں اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ تعلقات کی ڈور کمزور ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک دن رابعہ کی خود رائی، کج بحثی، بدکلامی اور لڑائی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تعلقات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دراڑ پڑ جاتی ہے مگر رابعہ اب بھی ہار نہیں مانتی اور اپنی انا کو مقدم سمجھ کر ازدواجی زندگی کو خیرباد کہہ کے دوبارہ تنہائی کی طرف لوٹ آتی ہے۔

اس کے بعد کی رابعہ کی زندگی "تنہائی کی زندگی ہے جسے کبھی وہ اپنے ماں باپ کی خدمت میں صرف کرتی ہے اور کبھی بھانجے، بھتیجیوں کی پرورش میں۔ مگر

اماں اور ابا دونوں ہی بہت جلد داغ مفارقت دے جاتے ہیں۔ عرفی اور عرشی اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی الگ سے ہیں۔ اس کے اور ان کے درمیان ایک خلا ہے جسے Generation Gap کہا جا سکتا ہے۔

عرفی اور عرشی کے کردار اور ان کے خیالات و نظریات آج کی نئی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں آج کی مغربی نظریات کی پروردہ، آزادی پسند نسل کس انداز میں سوچتی ہے، کس رنگ میں جینا چاہتی ہے اس کا اندازہ ان دونوں کرداروں سے ہو جاتا ہے۔

ان سب سے الگ ایک کردار علی کا ہے۔ وہ رابعہ کی خواہش کے مطابق اس سے کبھی کھل کر اظہار محبت نہیں کرتا جب کہ عادل بے حد صاف گوئی سے اپنے جذبات کے اظہار کا عادی ہے۔ عادل سے علیحدگی کے بعد کئی مواقع ایسے آتے ہیں جب رابعہ یہ سوچتی ہے کہ علی کو اپنا لے لیکن اس دوران علی کی شادی تہما سے ہو جاتی ہے۔

زندگی کی اس منزل پر جب نہ ماں باپ اس کے ساتھ ہیں، نہ بہن بھائی اور نہ وہ بھانجی بھتیجے جن کو رابعہ نے اپنے بچوں کی طرح پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ تنہائی کے اس ویرانے میں اچانک ایک دن علی، عادل کے لوٹ آنے کی خبر دیتا ہے۔ جب وہ رابعہ جسے مثنوی زہر عشق پڑھ کر عشق کے نام سے چڑ ہوگئی تھی، "شکنتلا" اور "میگھ دوت" پڑھ کر جس نے سوچا تھا کہ آخر یہ عورتیں اتنی بے وقوف کیوں ہوتی

ہیں۔ جس نے اکثر اس بات پر غور کیا تھا کہ عورتیں ہی برہا کے گیت کیوں گاتی ہیں؟ شادی کے بعد عورتیں ہی اپنا نام کیوں بدلتی ہیں؟ جسے اُبٹن ملوا کر کونے میں بیٹھی شرمائی لجائی سی، روتی دھونی سکڑی سمٹی دلہنیں کبھی اچھی نہیں لگتیں۔ جسے بابل سن کر، بیلے کی کلیاں، کھونٹے کی گیّاں انگنا کی چڑیاں۔ جیسی تشبیہات سن کر غصہ آتا تھا۔ جو تنہائی کو زندگی کا لازمی جزو سمجھتی تھی۔ ایک دم سے ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ مردوں کی بنائی ہوئی دنیا میں عورتوں کی حیثیت آزادی، خودمختاری یہ ایک حد تک اس ملک یا شاید اس دنیا ہی میں عورت کو مل سکتی ہے اس کو کسی نہ کسی حیثیت سے مرد کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں خلا ہی خلا ہے۔ وہ تمام لوگ جو اس کے آس پاس میں، چاہے وہ عرفی ہو، عرشی ہو یا علی۔ اس کے مستقل ساتھی نہیں۔ یہ لوگ اس کی زندگی کو Share نہیں کر سکتے۔ جب وہ ٹوٹ کر عادل سے ملتی ہے اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہتی ہے۔

"عادل! تم سے دور رہ کر ہم یہ جان گئے ہیں کہ عورتیں ہی برہا کے گیت کیوں گاتی ہیں؟"

لیکن ــــ ع سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا ــــ کے مصداق رابعہ کو فیصلے کی اس منزل تک پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس وقت تک عادل دوسری شادی کر چکا ہے۔ اب وہ ایک سعادت مند بیوی اور تین بچوں کا باپ ہے۔ اس کی زندگی اب اپنے مختصر سے خاندان کے لیے وقف ہے۔ اسے رابعہ کی تشنگی کا افسوس بھی ہے اور اس سے ہمدردی بھی۔ لیکن وہ اپنی بنائی جنت چھوڑ کر رابعہ کے پاس واپس نہیں آ سکتا۔ وہ رابعہ کو حقیقت سے روشناس کرا دیتا ہے۔ رابعہ کی انا پسند طبیعت ایک بار پھر اس تشنگی میں بھی اپنی پارہ پارہ شخصیت کو سنبھال لیتی ہے۔ وہ ٹوٹ کر بھی مطمئن ہے۔ اب اس کے لیے یہی باتیں اطمینان کا باعث ہیں کہ وہ میوزولوجی میں ڈپلوما لے چکی ہے۔ میوزیم میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہے۔ سرکاری سفر پر مڈل ایسٹ کی سیر کر چکی ہے اور یورپ اور امریکہ بھی دیکھ لیا ہے۔ اب وہ شاعری بھی کرنے لگی ہے۔ اسی طمانیت بھرے احساس کے مظاہرے کے ساتھ وہ عادل کو رخصت کرتی ہے اور ہوائی اڈے سے واپسی پر بظاہر مطمئن نظر آنے والی رابعہ رات کاٹنے اور صبح کرنے کے لیے ہما کے ساتھ غپ شپ یا علی سے جولائی میں ہونے والی کانفرنس کے متعلق بات چیت کا سہارا لینا چاہتی ہے۔ لیکن علی کا، ایک مرد کا، تحکم بھرا لہجہ پہلی مرتبہ اس کی انا پسند زندگی میں داخل ہوتا ہے۔

"نہیں۔ آپ یہ چائے ختم کیجیے۔ اور یہ گولی کھا کر لیٹیے۔ سمجھیں۔ نہ کانفرنس کے بارے میں گفتگو ہوگی، نہ گپیں ٹھونکیں گی۔"

تب پہلی مرتبہ رابعہ محسوس کرتی ہے کہ اس تحکم آمیز ہدایت کو نہ ماننے کی سکت اس میں نہیں۔ یہیں آ کر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے اور وہ نامکمل آزاد، پہاڑی راگ جس کے سارے سُر شدھ ہوتے ہیں۔ جو رات کے پچھلے پہر کا راگ ہے، مکمل ہو جاتا ہے۔

صغرا مہدی نے اس خوب صورت ناول میں واقعات کی ترتیب کو ایسے حسن اور دلکشی کے ساتھ پرو دیا ہے۔ کہ پلاٹ میں افسانوی انداز پیدا ہو گیا ہے۔ ناول ایک بھرپور تاثر دیتا ہے اور قاری

آخر میں پہنچ کر ایک نامعلوم کسک کا شکار ہو جاتا ہے۔ زبان و بیان کی روانی اور صفائی اور کرداروں کے ذریعے نظریات زندگی اور فلسفہ حیات کا فن کارانہ بیان مصنفہ کے زورِ قلم کا غماز ہے۔

ناول کی تکنک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ عام بیانیہ ناول سے ہٹ کر ہے۔ کہیں فلیش بیک کا سہارا لیا گیا ہے اور کہیں شعور کی رو کی تکنک اپنائی گئی ہے۔ قصّے کا ہر نیا موڑ کسی کردار کی تحلیل نفسی یا خود کلامی سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں فلیش بیک کو بڑا دخل ہے۔ یوں پوری کہانی آگے بڑھتی ہے مگر اکثر پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی۔ اس لیے یہ عام ناول کے انداز میں نہیں بلکہ افسانے کے انداز میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ پرکشش اور تجسس آمیز ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تکنک کہیں کہیں سقم پیدا کر دیتی ہے اور کہانی کو الجھا دیتی ہے۔ قاری کو اکثر موقعوں پر سوچنا پڑتا ہے کہ اب واقعات کی ڈور کہاں سے کہاں ملائی جائے کہ کہانی کا سلسلہ برقرار رہے۔

ایک عیب اور بھی ہے۔ ہر چند کہ مصنفہ نے رابعہ کی انا پسندی کو نمایاں طور پر واضح کیا ہے لیکن پھر بھی اس کردار کے ذریعے عورت کی مظلومی اور مرد کی حکمرانی کی تشہیر و تبلیغ زیادہ ہی نظر آتی ہے۔

مجموعی طور پر "راگ بھوپالی" واقعی کسی دلکش راگ سے کم نہیں جس کا اثر دیر تک ذہن پر باقی رہتا ہے۔

(رفیعہ شبنم عابدی)

یادوں کے کھنڈر

ناول نگار: نند کشور وکرم
پبلشر: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز جے ۲ کرشن نگر، دہلی ۵۱
قیمت: تیس روپے

نند کشور وکرم نے تقسیم ملک کے دوران راولپنڈی سے ہندستان کا رخ کیا۔ اس سفر میں پیش آنے والے موانع اور حادثات کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ اس دور میں اردو ادب ان کا رفیق کار رہا۔ کان پور میں روزنامہ قومی اخبار اور امرت سے وابستہ رہے۔ ماہ نامہ "نئی کہانی" کی ادارت کی۔ عزم صمیم اور روشن مستقبل کی امید نے راجدھانی میں پہنچا دیا۔ یہاں ماہ نامہ "آج کل" کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ اور اب پریس انفارمیشن بیورو میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر ہیں۔ ناسازگار حالات پر فتح پانے کا یہ ایک تجربہ ہے۔ دوسرا تجربہ علم کی لگن اور کامیابی ہے ہندستان میں رہ کر اردو اور فارسی میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تیسرا تجربہ ادبی ذوق کی سیرابی اور کامرانی ہے۔ "نئی کہانی" کان پور میں ان کے ناول کی قسطیں "ٹھنڈی آگ" کے عنوان سے شائع ہوتی تھیں۔ ناول نگار کو ایک تلخ تجربہ اور ہوا۔ اردو کا کوئی پبلشر ناول کو شائع کرنے پر آمادہ نہ ہو سکا مجبوراً ۱۹۶۱ء میں "نوینگ پرکاشن" دہلی کے ذریعہ ہندی میں اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ پھر بھی دل میں خلش باقی رہی اور ناول نگار اپنے ناول "یادوں کے کھنڈر" کو اردو میں شائع کرنے کی سعی مسعود میں منہمک رہا۔ آخر کار بیس برس بعد تمنّا کے خاکے میں کامرانی

کا رنگ بھر گیا۔ انسانی جدوجہد کی یہ بھی ایک روشن مثال ہے۔

"بادول کا کھنڈر" سماجی، تاریخی، انقلابی، رومانی اور اخلاقی عناصر کے امتزاج کا ناول ہے۔

معروف نقاد ہنسراج رہبر نے رائے دی ہے:

"نندکشور وکرم کا یہ ناول ملک کی تقسیم کے واقعات پر مبنی ہے۔ لہٰذا فرقہ پرستی اور جنگ جو طاقتوں پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ ناول کا پلاٹ دلچسپ ہے اور کردار نگاری میں چابکدستی اور فنکارانہ خلوص سے کام لیا گیا ہے۔

ناول کی زبان اور اسلوب بیان میں صحت و اثرانگیزی ہے۔ کتابت کی بعض غلطیاں دور کرنے کی ضرورت ہے۔ ص ۲۹۔ رواکی کا مہورت (مہورت کو مونث لکھنا چاہیے)۔ ص ۱۳۱۔ سندھور داس لفظ کو سیندور لکھا جاتا ہے، ص ۳۲۔ دائم المریض (صحیح لفظ دائم المرض ہے) ص ۱۳۵۔ جمائی دستی یا کثرت بیداری کے موقع پر منہ کھول کر سانس لینے کے لیے "جماہی" مستعمل ہے)

اس ناول میں برہمن اور کشتری کی ذاتیں محبت میں دیواریں بن جاتی ہیں۔ تحریک آزادی کا جذبہ ہر دل میں موجزن ہے۔ مسٹر جناح کی دو قوم کی تھیوری نے فرقہ پرستی کی آگ کو ہوا دی۔ کوہ ری جامع مسجد میں اشتعال انگیزی پھیلانے میں دو بھائی سب سے آگے تھے۔ یہاں تک کہ مسجد کے بورڈ پر یہ لکھا تھا۔

خدام حال میں دو برادر عبدالنبی اسلام قادر

دوسری طرف ہندو مسلم ایکتا کا یہ حال تھا کہ کمل کانگریسی رہنما اور کرنل اختر ایک جان دو قالب" تھے۔ کمل کی زندگی میں سیاست اور رومان نے کتنے طوفان برپا کیے وہ مطالعے کی چیز ہیں۔ نشی، سنیتا اور خاص طور پر کمل کی بھابی کے کردار جاندار، مانوس اور کہانی پن کو روشن کرنے والے ہیں۔

کتاب عمدہ چھپی ہے۔ سرورق میں آرٹ کی بہتر نمائندگی ہے۔ شاعر کی تصویر چھپی ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

آنگن آنگن

افسانہ نگار: ظفر حبیب

ناشر: ظفر حبیب، دل کشا منزل، بھلوریہ بازار

بردنی ۸۵۱۱۱۲ (ضلع بیگوسرائے۔ بہار)

قیمت: بارہ روپے

بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے ظفر حبیب کا پہلا افسانوی مجموعہ "آنگن آنگن" منظر عام پر آیا ہے قاری کو سات کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی۔ حسن اور آئینہ، معجزۂ فن، یہ قربتیں، یہ فاصلے، مجھے مار ڈالا۔ پھول بھی کانٹا بھی، وقت کرتا جو وفا، یہ حسرت رہ گئی۔

"آنگن آنگن" سے قریبی تاثر یہی ملتا ہے کہ ملک کی کسی بستی یا شہر کے ماحول میں کہانیوں کے تانے بانے کا سادھن کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں آنگن کا تصور محض نہیں ہے بلکہ کہانیوں کے پلاٹ، کردار نگاری اور مکالمے کے ساتھ کہانیوں کے انجام نے خصوصاً منظر نگاری نے بڑی وسعت اختیار کرلی ہے۔

مختصر طور پر یوں سمجھیے کہ "آنگن آنگن" کا مطالعہ کرکے ایک قاری کسی ساتھی کی طرف کتاب بڑھا کر کہہ سکتا ہے۔ دنیا کی سیر کر لو۔ "حسن اور آئینہ" میں پیرس کی دل نواز اور بھرپور زندگی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کہانی میں روزی جتنی حسین ہے اتنی ہی نرم دل بھی ہے۔ پیرس کے بازار میں اسے ایک غریب لڑکی ملتی ہے مگر حسن و جمال میں وہ بھی روزی سے کم نہیں۔ روزی اس لڑکی کو اپنے گھر لے آتی ہے اور اس کی خاطر تواضع کرتی ہے۔ مالی امداد کرتی ہے۔ مگر واقعات کے سلسلے میں ایک مقام خلافِ معمول نظر آتا ہے۔ ص ۱۰۱ پر درج ہے کہ روزی شاپنگ کے لیے دوپہر کو نکلی۔ وہ غریب لڑکی اس کو ملی اور گھر لے آئی۔ ص ۱۰۵ "تھوڑی ہی دیر میں خادمہ چائے اور ناشتہ لے کر حاضر ہوئی۔ روزی نے اسے خوب سیر ہوکر ناشتہ اور کھانے کو کہا اور چائے بھی پلائی۔"

یہاں (ناشتہ) لفظ بڑی قباحت پیدا کرتا ہے۔

کہانی کے دوسرے کردار نلپ اور مس اسمتھ وغیرہ ہیں۔ اس میں عورت کی نطرت اور مرد کی نفسیات کو اچھے ڈھنگ سے دکھایا گیا ہے۔

افسانہ نگار کو زبان وبیان پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ افسانہ نگار کی کہانیوں میں یہ خوبی نظر آتی ہے کہ وہ نئی زندگی کو پیش کرتی ہیں۔ مکالموں اور کرداروں کی بھرمار نہیں ہے۔ بے ضرورت انگریزی کے الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ قاری کو اپنے ملک کے علاوہ یورپ کے رسم ورواج محبت کے معیار اور زن وشوہر کے تعلقات کا علم ہو جاتا ہے۔

کتاب اچھی خاصی چھپی ہے۔

(سیفی پریمی)

کس نام سے پکاروں

ناول نگار: بی۔ ڈی کالیہ ہمدم
ناشر: اجنتا پبلشرز بی ایکس ایکس ۱۲۔۹۵، اگرودلونگر لدھیانہ
ملنے کا پتا: مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات ۴/۱۰۸ اردو بازار، دہلی۔
قیمت: بیس روپے

یہ خوشی کی بات ہے کہ ہریانہ ساہتیہ اکاڈمی اردو شاعروں اور نثر نگاروں پر مہربان ہے کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی معاونت کرتی ہے اور نئے فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اسی قسم کی اعانت کا نتیجہ "کس نام سے پکاروں" بی ڈی کالیہ ہمدم کا ناول ہے۔

کالیہ ہمدم شاعر ہیں اور زار علامی سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔ ہمدم کا یہ پہلا ناول ہے۔ یہ ناول کولاہل کے پس منظر میں ابھرتا ہے۔ اور تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک ہیرو اور ہیروئن کی کشمکش گتھیاں ڈالتی ہے۔ سلجھنا ناممکن۔ ہیرو اور ہیروئن دونوں ہی اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز ہیں۔ معلوم نہیں اس محکمے کی اصلاح کا خیال سب سے پہلے کیوں ذہن میں آیا۔ کرشن پال ہیرو کو آدرش وادی سمجھا گیا ہے اور ہیروئن رادھا کو نئی تہذیب کی علامت یعنی ناول کا موضوع پرانی اور نئی تہذیب کا تصادم قرار دیا ہے۔

ناول کی زبان رنگین، شاعرانہ اور دل کش ہے۔ موقع کی مناسبت سے اشعار غزل اور نظمیں داخل کی ہیں۔ ہیرو خود شاعر ہے۔ مصوری اور سنگیت کا دلدادہ بھی۔ ہیروئن کو شاعری اپیل کرتی ہے اور اپنے سحر آگیں سنگیت کے سہارے وہ شعری تخلیق کو اعجاز بنا کر پیش کر سکتی ہے۔ مگر ہیرو پھر ہیرو ہے اس کا فن اور غضب کا ہے۔ حسن، شعر، سنگیت وغیرہ قدر مشترک کا کام دیتے ہیں۔ رومان ابھرتا ہے۔ اس کی لہریں پھیلتی ہیں اور عشق کا دریا بہنے لگتا ہے۔ ہیرو آدرش وادی ہے اس کا آدرش حسن، خیر اور حق ہونا ہی چاہیے۔ ہیروئن محض جمال پرست نہیں۔ وہ آسودہ زندگی گزارنا چاہتی ہے اس لیے صحت مند اور روشن خیال جیون ساتھی کی تلاش میں ہے۔ اقتصادی بہتری پر اس کی نظر ہے۔ کالج کے زمانے میں ایک سرمایہ دار کے فرزند راکیش پر نظر گئی ملازمت کے دور میں کرشن پال کے عہدہ اور ریاضت نے متاثر کیا۔ لکھنؤ کے ایک ٹریننگ سنٹر میں انسٹرکٹر راجا سلیم کی وجاہت، ثروت اور سنگیت کے فن نے اپنا جادو دکھایا اور بزرگوں کی اجازت سے شادی کی حامی ہو گئی۔ آدرش وادی ہیرو بھڑک گئے۔ لکھنؤ کے شاعر دوستوں سے مل کر راجا سلیم سے ملاقات کی۔ انھیں اپنا مہمان بنایا۔ ہیروئن کی زر پرستی اور بے وفائی کو بے نقاب کیا۔ یہ ردِّ عمل ہونا ہی چاہیے تھا۔ کرشن پال نے رادھا کو تاج محل کی سیر کرائی تھی۔ شعر سناتے تھے۔ کافی رقم خرچ کی تھی۔ علی گڑھ میں دونوں کسی سرکاری کام کے سلسلے میں ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ گلابی ساری پہلے سے خرید کر تحفہ پیش کر دیا تھا۔ رات کو رادھا نے گلابی ساری زیب تن کی۔ مگر ہیرو لیٹے ہوئے ویدانت پر ایک مضمون پڑھ رہے تھے اور رانی سامنے کھڑی رہی۔

رادھا نے میگزین چھین لیا کہنے لگی۔

"آدرش وادی جی کیا آپ صرف فلسفے کی ہی کھوج کے لیے اس دنیا میں آئے ہیں۔ آپ ایک نظر اپنی دلھن کو بھی دیکھنا پسند نہیں فرما سکتے۔

"ارے سبحان اللہ چشم بد دور۔ گلابی ساری میں آپ کے حسن کا جواب نہیں۔ گلابی جسم پر ساری قیامت پر قیامت! بھگوان نظر بد سے محفوظ رکھے۔ پال نے بڑے ہی انداز سے کہا۔ اس کے بعد بات بڑھ گئی اور یہ انکشاف ہوا کہ پال نے رادھا کی ناز برداری میں چار ہزار روپے خرچ کیے تھے۔ یہ رقم ہیرو نے بہن کی شادی کا قرض ادا کرنے کو جمع کی تھی۔

ایک مرتبہ رانی نے راجا سلیم کو خط لکھا تھا۔ پال کے دفتر میں بہادر چپراسی لے خط پوسٹ کرنے سے پہلے پال کو دے دیا۔ آدرش وادی نے خط کھول کر پڑھ لیا اور پھر لیٹر بکس میں ڈلوا دیا۔

ہیروئن کا کردار بڑا جاندار ہے۔ زندگی سے قریب ہے۔ مگر ہیرو نے سازش کر کے راجا سلیم کو بدظن کر دیا۔ شادی سے انکار ہو گیا۔ رانی کی حالت ابتر ہو گئی۔ اس کی چھوٹی بہن رجنی ضد کر کے رادھا کو پال کے گھر لے گئی۔ مکان خالی تھا۔ مکین لاپتا! ایک بند نامہ بہادر رانی کو دے دیا۔ اس نے خط پڑھا اور "رہ گزر کے خاموش میل کے پتھر کے ساتھ لڑھک گئی"

قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہیرو کے آدرش واد میں کون سی کار فرما تھی۔

تعارف انور علی دھلوی نے لکھا ہے زار دہلوی نے ناول پر عمدہ رائے دی ہے۔ آخر میں پانچ صفحے کا اغلاط نامہ چھپا ہے۔
سرورق رنگین ہے۔ ہیروئن کی علامتی تصویر ہے۔ ناول نگار کی تصویر بھی زینت اشاعت ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

اندھیری رات کا تنہا مسافر
(ناول)

مصنف: شہزاد منظر
ناشر: منظر پبلی کیشنز ۔ اے ۳۶ واجد اسکوائر بلاک ۱۶ ۔ کراچی
قیمت: تیس روپے

شہزاد منظر کے ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" کے بارے میں مصنف نے جب مجھے یہ بتایا کہ انھوں نے بیس یا بائیس سال قبل لکھا ہے تو میرا اندازہ نہیں تھا کہ یہ ناول اچھا ہوگا۔ ناول کے مورخین اور ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ ناول خواہ ادبی ہو یا محض تفریحی۔ فلسفیانہ ہو یا نفسیاتی، اس میں زندگی کے محض تجربات بیان کیے گئے ہوں یا فلسفیانہ نکات پیش کیے گئے ہوں، اچھے ناول کی بنیادی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ دلچسپ اور قابل مطالعہ ہو اور قاری جب ایک بار شروع کر دے تو آخر تک پڑھنے پر مجبور ہو۔ شہزاد منظر کا یہ ناول اپنے آپ کو پڑھوا تا ہے۔ مصنف نے کہیں بھی اس کی بنت میں جھوٹ موٹ کی صناعی اور رنگ آمیزی سے کام نہیں لیا۔ کہانی نہایت سادگی، خوب صورتی اور مہارت سے جوڑی گئی ہے۔ ناول کے بیانیہ کی میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ جیسا کہ رام لال کا خیال ہے "اندھیری رات کا تنہا مسافر" میلو ڈراما قطعی نہیں ہے۔ اور روایتی داستان سرائی کے باوجود کسی لحاظ سے ڈراما میلو قرار نہیں پاتا۔ مجھے خوشی ہے کہ شہزاد منظر نے اس بھولے بسرے ناول کو چھاپنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس لائق تھا کہ اسے چھاپا جاتا اس لیے کہ اس میں کچھ مبتدیانہ نہیں ہے۔ اس کے کردار اصلی اور قابل یقین ہیں اور لندن اور انگلستان کے مناظر پرکیف، مستند اور فطری ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے شہزاد منظر سمندر پار نہیں گئے۔ اس کے باوجود انھوں نے لندن کا ماحول نہایت مستند انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول کے تحیر خیز انجام نے تو مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے یہ اتنا خوف ناک اور حقیقی ہے کہ آدمی اسے بھول نہیں سکتا۔ ناول اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ ادبی شاہ کار تو شاید میں نہ کہوں مگر یہ ورک آف آرٹ یقیناً ہے۔

(محمد خالد اختر)

پہلو بہ پہلو

مصنف: شہاب عظیم آبادی
پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دلی
قیمت: بارہ روپے

"پہلو بہ پہلو" چھ کہانیوں کا مجموعہ ہے جس کے مصنف شہاب عظیم آبادی ہیں۔ ان سب کہانیوں میں نفسیاتی مطالعے کی گہرائی اور زندگی کے نشیب و فراز کی ترجمانی ملتی ہے۔ افسانوی دنیا میں یہ نام ہمارے سامنے پہلی بار آیا ہے مگر ان افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو فن افسانہ نگاری

پر پورا عبور حاصل ہے اور زبان پر غیر معمولی قدرت ہے۔ ہماری روزمرّہ کی زندگی میں جو اخلاقی کمزوریاں راہ پا گئی ہیں ان کو دور کرنے کا حل ان افسانوں میں سرِتا پا نظر آتا ہے۔ ان سب واقعات میں انسان دوستی کے نمونے اور ان میں دردمندی کا ایسا اظہار کار فرما ہے جو ہمارے جسم میں سنسنی پیدا کرتا ہے۔

اس مجموعے کی پہلی کہانی "واپسی" ہے جو شمشاد اور سمیہ کے گرد گھومتی ہے۔ ان دونوں کی محبت مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

مجموعے کی دوسری کہانی "قرض" ہے، پلاٹ کی خوب صورتی نے کہانی میں جان پیدا کر دی ہے۔ کہانی بظاہر سیدھی سادی ہے لیکن ڈاکٹر کا برتاؤ، سماجی کارکن کی ایمان داری اور قرض کی ادائیگی کا انداز یہ سب اخلاقی قدریں ہیں دوسری کہانیوں میں کم ہی نظر آتی ہیں۔

اس مجموعے کا ایک اور افسانہ "وہ لڑکا" ہے جس میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ اگر آج کل کی عدالتیں پولیس کی غلط گواہیوں کی خفیہ طور پر تفتیش کرا کے فیصلے صادر کریں تو انصاف کا کبھی خون نہیں ہو سکتا اور بہت سے بے گناہ سزاؤں سے بچ سکتے ہیں۔ اس مجموعے کی باقی تین کہانیاں بھی پلاٹ اور کردار کے لحاظ سے قاری کو پڑھنے کی دعوت دیتی ہیں۔

شہاب صاحب کے افسانوں میں کئی خوبیاں ایک ساتھ جمع ہو گئی ہیں ان میں سب سے بڑی کہانی بیان کرنے کا فن ہے جس پر وہ پوری مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے اثرات کا پرتو نظر آتا ہے جس طرح راجندر سنگھ بیدی کے یہاں مشاہدہ اور غور و فکر کے میلانات ان کے افسانوں میں حقیقت بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح شہاب عظیم آبادی کے افسانوں میں حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے۔ عصمت چغتائی نے زندگی کے واقعات کو افسانہ بنایا ہے۔ شہاب صاحب کے افسانے زندگی کے واقعات سے بہت قریب ہیں۔ ان واقعات میں انسان دوستی، اخلاق، دیانت اور دردمندی کا اظہار ملتا ہے دوسری اہم بات یہ ہے کہ قومی یک جہتی کا تصور ان کے فن کی ایک اور خوبی ہے۔

کتاب خوب صورت چھپی ہے سرورق سادہ مگر دیدہ زیب ہے۔ البتہ کتاب کی افادیت کو دیکھتے ہوئے قیمت کم ہے۔

(دایم حبیب خاں)

آنگن (مع مقدمہ)

مصنف: خدیجہ مستور
پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج دہلی
قیمت: تیس روپے

خدیجہ مستور کا پیشِ نظر ناول پاکستان میں کئی سال پیشتر شائع ہوا تھا اور وہاں کے بڑے ادبی انعامات حاصل کرنے کے علاوہ اس ناول نے اردو دنیا میں خاصی گونج پیدا کی تھی۔ ہم ہندستان

کے اردو والوں کو موڈرن پبلشنگ ہاؤس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس عمدہ ناول کو مقدمے کے ساتھ خوش سلیقگی سے شائع کر دیا ہے۔ مقدمہ ڈاکٹر اسلم آزاد نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

غالب کے گنجینۂ معنی کی طرح اس ناول میں بھی کتنے جہان آباد ہیں۔ ہر چند کہ زمانی اعتبار سے ناول کا کینوس تقسیم ہند کے پندرہ بیس سال پہلے اور چار پانچ سال بعد تک کا احاطہ کرتا ہے لیکن اس کم و بیش ربع صدی کی داستان میں بھی تین چار نسلوں کی ٹھاٹھیں مارتی وسیع زندگی کوزے میں دریا کی طرح سمٹ آئی ہے۔ زوال آمادہ جاگیردارانہ نظام، جدوجہد آزادی کے پرتاثیر مرقعے، ہندو مسلم اتحاد و فرقہ وارانہ فسادات، داستان حسن و عشق، مختلف طبقات کی آویزشیں، اگلی پچھلی نسلوں کے درمیان جنم لیتی خلیجیں، انسانی فطرت کے روشن اور تاریک پہلو، الغرض اس ربع صدی کی، جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ ایسی سچی تصویر اس ناول میں ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اس کی مثال کسی دوسرے ناول سے نہیں دی جا سکتی۔ میرے خیال کے مطابق جدیدیت کے اثرات فکشن، خصوصاً افسانے پر منفی انداز میں رونما ہوئے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی دوران اردو میں کئی بڑے ناول بھی وجود میں آئے ہیں۔ تیزی کے ساتھ بدلتی زندگی کے خارج اور باطن کی ایسی زندہ تصویر پیش کرنا خدیجہ مستور کا وہ کارنامہ ہے جسے تاریخ ادب ہمیشہ یاد رکھے گی۔ بلاشبہ "آنگن" اردو کے پانچ سات بڑے ناولوں میں سے ایک ہے۔

۳۶۸ صفحات کی آفسٹ پر چھپی ہوئی اس کتاب کی قیمت تیس روپے یقیناً سستی ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

گلاگ مجمع الجزائر (تین جلدوں میں)

مصنف: الیگزینڈر سولنسٹین (مترجم: ڈاکٹر مظفر حنفی)
ناشر: نیشنل اکاڈمی۔ ۱۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی ۲
قیمت: عام اڈیشن ۱۰ روپے فی جلد۔ لائبریری اڈیشن ۲۰ روپے

یہ کتاب عالمی شہرت اور نوبل انعام یافتہ ادیب الیگزینڈر سولنسٹین کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے جس میں کل سات ابواب ہیں۔

سوویٹ روس میں ناپسندیدہ اور غیر معتقد افراد کی جلاوطنی کے لیے ایک جزیرہ نما پر کیمپوں کی تشکیل دی گئی ہے۔ جس کا نام گلاگ مجمع الجزائر ہے۔ اس کتاب میں یہیں کے آلام و مصائب کی روداد اور سوویٹ حکمرانوں کے سنگ دلانہ رویے کا بیان ہوا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے ایسے ایسے واقعات کا ذکر آتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سولنسٹین نے کتاب میں ان تمام واقعات اور ظالمانہ رویوں کا ذکر پوری جزئیات کے ساتھ کیا ہے جو خود ان کو درپیش آتے ہیں یا جن کا ذکر ان سے قابل بھروسہ اور معتمد شخصیتوں نے حلفیہ طور پر کیا ہے۔ الیگزینڈر نے اپنی عمر عزیز کے بیس پچیس بہترین سال جیلوں میں کاٹے ہیں اور اب اس سے رہائی کے بعد دنیا کے باشعور اور ذہین قارئین کے سامنے اصل صورت حال رکھی ہے اپنی سچائی کی وجہ سے یہ داستان حیرت ناک دل کو دہلا دیتی ہے اور یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے

کہ کیا انسان کے لیے مارکسزم سے زیادہ عذاب بھی دنیا میں ہو سکتا ہے۔

کتاب بہت صاف ستھری اور سلیقے سے شائع ہوئی ہے۔ اور قیمت بہت واجبی ہے منظر حنفی نے ترجمہ بامحاورہ، سلیس زبان میں کیا ہے۔ اور کہیں بھی ترجمے کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ کتاب اسی زبان میں قلم بند ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ترجمے کی بہت بڑی خوبی کہی جا سکتی ہے۔

(دلنواز دل راج ڈھینگرہ)

حسرتِ عرضِ تمنّا مصنفہ: فرخندہ لودھی

حسرتِ عرض تمنّا، کی مصنفہ فرخندہ لودھی اردو کی ممتاز اور شہرت یافتہ ادیبہ ہیں، میں انھیں ایسے خوش قسمت لوگوں میں شمار کرتا ہوں جن پر شہرت کی دیوی پہلی تخلیق پر ہی مہربان ہو جاتی ہے۔ جنوری ۱۹۶۲ء میں "رسالہ اوراق" میں ان کا افسانہ "پاربتی" چھپا تو وہ اچانک شہرت کا ہفت آسمان عبور کر گئیں اور انھیں ایک ممتاز افسانہ نگار تسلیم کر لیا گیا ان کے افسانے "شرابی" "شہر کے لوگ"، "ہوا کی موج"، "بوٹیاں" "معجزہ" وغیرہ جیسے تو ان کی شہرت کا گراف مزید بلندیوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غلام الثقلین نقوی، سشنا ورڈوگرا اور انور سدید نے ان کے فن اور شخصیت پر مضامین لکھے، ان کے افسانوں کی کتاب "شہر کے لوگ" کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

"حسرتِ عرضِ تمنا" خواب اور شکستگیِ خواب کا ناول ہے۔ اس کا بنیادی کردار سپنا معاشرے کی راندی ہوئی عورت نہیں بلکہ وہ عورت ہے جسے ایک ہموار معاشرے سے اغوا کر کے دوسرے ناہموار معاشرے میں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا۔ سپنا عورت سے طوائف بن جانے کا مثالی کردار ہے لیکن یہ حوا نہیں جس نے بنیادی گناہ کی طرف آدم کو ترغیب دی۔ وہ پنڈورا بھی نہیں کہ پرومتھیس کے لیے دامِ فریب بچھائے۔ اس ناول کی سپنا تو ایک ایسی عورت ہے جو حوادثِ زمانہ کا شکار بنا دی گئی۔ لیکن جس کے دل میں گھریلو عورت بننے کی آرزو کبھی زائل نہ ہوئی۔ وہ قدم قدم پر بھٹکتی رہی۔ اپنے سے دھوکا کھاتی رہی۔ وہ کمزور تھی، معصوم تھی، اس لیے ہر مقام پر درغلائی گئی۔ لیکن وہ ترغیب کی علامت نہ بن سکی۔ اور اس کی پازیب کی جھنکار سے وہ نغمہ نہ ابل سکا جو مرد کو اپنا اسیر بنا لے۔ اس ناول میں گناہ کے بجائے معصومیت کا کفارہ ادا کیا گیا ہے۔ فرخندہ لودھی نے فرد اور معاشرے کے اس تصادم میں سپنا کو انتہائی کرب اور اذیت سے گذرتے ہوئے دکھایا ہے اور المیہ اس حقیقت سے اجاگر کیا ہے کہ مردوں کے اس حاکم معاشرے میں عورت کمزور ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ سپنا کی شخصیت ایک گہری پراسرار ندی کی طرح پراسرار رہی ہے۔ حوادث کے پتھر تو باہر سے آتے ہیں اور اس ندی کے سکون کو درہم برہم کر ڈالتے ہیں۔ اس المیے کو ابھارنے کے لیے فرخندہ لودھی نے دیہات اور شہر کے معاشرے کو تخلیقی آنکھ سے دیکھا اور حسبِ ضرورت انھیں اس ناول میں زندگی جاوید دے دی۔

طوائف اردو افسانے اور ناول کا ایک مقبول و مرغوب موضوع ہے۔ مولوی نذیر احمد کی "ہریالی"، "بادی رسوا کی"، "امراؤ جان ادا" اور قاضی عبدالغفار کی "لیلا" اس طوائف کے مختلف روپ ہیں۔

سعادت حسن منٹو نے اس طوائف کے باطن سے اس عورت کو تلاش کیا جو ہرجائی اور لعنتِ بازار ہونے کے باوجود ایک بیوی اور ماں تھی۔ اس طوائف کا ایک متوازن روپ غلام عباس کے بعض افسانوں مثلاً "حمام میں" اور "اس کی بیوی" میں بھی نظر آتا ہے۔ رحمان مذنب کے افسانوں کا موضوع وہ طوائف ہے جس نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر رکھا ہے اور طوائفیت کو زندگی کی ایک مخصوص قدر کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ طوائف کے یہ سب روپ منفرد انوکھے اور مختلف ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک قدرِ مشترک یہ بھی موجود ہے کہ ان ادبا نے اس قسم کی عورت کو ترغیبِ گناہ کا آلہ تصور کیا ہے اور مرد اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے تو اس میں نفسانی ہوس کی فراوانی نمایاں نظر آتی ہے۔ فرخندہ لودھی کے ناول "حسرتِ عرضِ تمنا" کی سپنا بھی ایک طوائف ہے لیکن یہ نہ تو تسکینِ نفس کا وسیلہ ہے اور نہ ترغیبِ گناہ دیتی ہے۔ بلکہ مصنفہ نے اسے ایک ایسی عورت کے روپ میں پیش کیا ہے جو حوادث کا شکار ہو جانے کے باوجود بنیادی نیکی سے منہ نہیں موڑتی اور نہ صرف مرد کے وجودی خلا کو پُر کرنے کی آرزو مند ہے بلکہ اس کی روح کا عکس بننے کی کوشش بھی کرتی ہے۔

اس ناول کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں صرف ایک کہانی پیش نہیں کی گئی بلکہ ایک کہانی کے بطون سے متعدد کہانیوں کو جنم دیا گیا ہے۔ اور ہر کہانی سے زندگی کا ایک نیا روپ نکھارا گیا ہے۔ شہر اور دیہات کے تہذیبی فاصلے اس ناول کا موضوع نہیں لیکن ناول ان اقتباسات کو پوری فنی آراستگی سے منظر پر لاتا ہے اور ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے۔

یہ ناول زندگی کی تین منازل یعنی وصال، گیان اور نروان کی یاترا کرتا ہے۔ فرخندہ لودھی نے زندگی کے اس طویل سفر کو صعوبت نشان قرار دیا ہے۔ اور موت نروان کی آخری منزل ہے۔ پس ناول کا بیانیہ شبنم سے دھلے ہوئے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ قاری ناول نہیں پڑھتا بلکہ ندی کی متوازن لہروں میں بہتا چلا جاتا ہے۔ واقعات اور کرداروں کے جنگل میں بالآخر اس کی سوچ کو بھی مہمیز لگ جاتی ہے۔ اور زندگی حقیقت کا پردہ اٹھا دیتی ہے۔ مجھے اس ناول کی بازیافت پر بے انتہا خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ اس کے مطالعے نے مجھے تازگی کا نیا احساس دیا ہے۔ فرخندہ لودھی۔ اردو ادب آپ کا ممنون ہے کہ آپ نے یہ ناول لکھا۔ (انور سدید)

دشتِ سُوس

مصنفہ: جمیلہ ہاشمی
پتا: رائٹرس کلیا، لاہور
قیمت: سو روپے

کوئی ناول خواہ وہ معاشرتی ہو یا تہذیبی، سیاسی ہو یا تاریخی، تخیل کی رنگ آمیزی کے بغیر اپنے فنی تقاضے پورے نہیں کرتا اور آرنلڈ بنٹ Arnold Bennett نے تو لکھا ہے کہ "تاریخی ناول میں تخلیق کار تخیلی طور پر اس عہد کو تخلیق کرتا ہے جس میں اس نے زندگی نہیں گزاری۔" جمیلہ ہاشمی نے بھی منصور حلاج کے عہد کو اپنے تخیل کی معاونت سے حیاتِ نو عطا کی ہے اور ناول کے فنی نقطۂ نظر سے یہ اتنا مکمل نظر آتا ہے کہ قاری اس کے حسن میں یکسر گم ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ناول

"دشتِ سوس" ایک مضطرب اور سیماب آسا شخصیت کے کردار کو ایک مخصوص فکری تناظر میں ابھارتا ہے۔ اس ناول میں دو طرح کے موسم ہمارے سامنے آتے ہیں، ایک موسم اپنا تلاطم سطح کے اوپر ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا موسم اپنی یلغار بطون دل میں پیدا کر رہا ہے۔ ان دونوں کا تصادم ناول کا مرکزی موضوع ہے۔ چنانچہ بعض اوقات جب باہر کی دنیا شدید دھوپ سے جل رہی ہوتی ہے تو داخل کی دنیا پرسکون اور اطمینان بخش نظر آتی ہے۔ دوسری طرف جب داخلی اضطراب جسم کی دیواروں کو شکستہ کرنے کے درپے ہوتا ہے تو بیرونی دنیا میں انتشار کے آثار تک نظر نہیں آتے۔ جمیلہ ہاشمی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے متلاطم جذبات پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہے۔ اور ناول کا بیانیہ اس خوب صورتی سے مرتب کیا ہے کہ منصور حلاج اپنی تمام تر معنویتوں کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور اس کی شخصیت کے گرد پھیلا ہوا دبیز اسرار مزید پراسرار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ناول کا تاروپود اس فن کاری سے بنایا گیا ہے کہ صداقت کی سادگی نے ناول کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ حتیٰ کہ وجدانی کیفیات بھی عقلی توازن کو قائم رکھنے میں مناسب معاونت کرتی نظر آتی ہیں۔

"دشتِ سوس" بنیادی طور پر کردار کا ناول ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اس عہد کے کتابی مطالعے سے اس کردار کی زندگی کے مختلف گوشے اور اس کی تعلیمات کے مختلف زاویے تاریخ کے اوراق سے تلاش کیے ہیں۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ ان سب کو ناول میں ڈھالتے وقت انھوں نے منصور حلاج کی تعلیمات کو فروغ دینے کا فریضہ سرانجام نہیں دیا بلکہ جمیلہ ہاشمی نے اپنی تمام تر توجہ اس کردار کے اسرار کو اجاگر کرنے اس کے بارے میں جو رائے عامہ مرتب ہوئی تھی اس کے مثبت اور متضاد زاویوں کو ابھارنے، اور منصور حلاج کی روح کی یاترا کو تاریخی حقائق سے نمایاں کرنے میں صرف کی ہے۔ بالفاظ دیگر منصور حلاج کی متذکرہ بالا حکایتِ حیات کے اجمال کے گرد بقیہ تمام مصوری جمیلہ ہاشمی کے قلم اور خیال کا اعجاز ہے اور اس میں وہ ناکام نہیں ہوئیں۔

جمیلہ نے اپنے دلکش، مرصع اور خوب صورت اسلوب میں ایک ایسا ناول تخلیق کیا ہے جس میں تخیل کی مناسب پرواز کے لیے فضا کشادہ نہیں تھی لیکن وہ ہمیں منصور حلاج کے عہد میں اس طرح لاکھڑا کرتی ہیں کہ ہمارے گرد و پیش میں اس دور کے عوام و خواص سانس لینے لگتے ہیں اور اس دور کا فکر ہمارے اضطراب کو دوچند کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے بلاشبہ ماضی کے اندھیروں پر کمندیں پھینکی ہیں لیکن اپنے پرزور تخیل سے انھوں نے اس اندھیرے کا پردہ چاک کیا اور ایک اچھوتی کہانی مرتب کی ہے۔ انھوں نے تاریخ کی ایک متنازعہ شخصیت کو اس کے متصوفانہ زاویوں سے اجاگر کیا ہے اور اس اسرار میں قاری کو دلچسپی لینے پر مائل کیا ہے جس کا دھندلکا آج بھی اتنا ہی گہرا ہے جتنا منصور حلاج کے دور میں تھا۔ یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے "تاریخ" نہیں لکھی بلکہ تاریخ کے بطون سے ناول کا مواد حاصل کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مدار سے ایک قدم باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی اور اس حدِ امتیاز کو قائم رکھا ہے جو تاریخ اور ناول کے درمیان فنی طور پر قائم رکھنا ضروری ہے۔ جو لوگ اس ناول کو تاریخ کے نعم البدل کے طور پر مطالعہ کریں گے وہ شاید جمیلہ ہاشمی کے جمالِ فن کا پورا لطف اٹھانے سے قاصر رہیں گے۔ (انور سدید)

رنگِ بہاراں

مرتب : شمس قدر
پتا : قمر آزاد اردو لائبریری، پٹنہ ۴
قیمت : پندرہ روپے

قمر آزاد اردو لائبریری کے اشاعتی منصوبے کی پہلی کاوش ہے جس میں نئے اور غیر معروف ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی غرض سے ان کے منتخب افسانے شائع کیے گئے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں صبیحہ بانو، سہیل جامعی، تبسیر واحدی، شمیمہ شعلہ، گردیو سنگھ، مقصود دانش، شعیب رومی، سیف احسن، پرویز بن ناظم، نفیسہ سحر، مطبن اشرف، رفیق شاکر اور احسان تابش کے نام شامل ہیں۔ ہر افسانہ نگار کے اپنے بیان کردہ حالات زندگی اس کے تعارف کے طور پر شریک ہیں۔ یہ افسانے چونکہ نئے لکھنے والوں کی کاوشیں ہیں۔ اس لیے اکثر مقامات پر زبان و بیان کی اغلاط کی نشان دہی کی جاسکتی ہے لیکن یہ بات بہر حال لائقِ اطمینان ہے کہ ہندستان کے مختلف علاقوں میں مختلف اقوام کی ذہین لوگ، جن میں عورتیں بھی شامل ہیں، اردو کے تخلیقی سفر میں شامل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس نوع کے اشاعتی پروگرام ہماری زبان کی ترقی و ترویج اور فن کاروں کی نئی نسل کی تربیت و حوصلہ افزائی کے لیے بہر طور مفید ہے اور شمس قدر کی اس کاوش کو سراہنا چاہیے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

آزادی

مصنف : چمن نہل (مترجم : شجاع الدین صدیقی)
پتا : ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی
قیمت : ساٹھ روپے

چمن نہل کے اس انگریزی ناول پر ۱۹۸۴ء کا ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ مل چکا ہے اور اب اکاڈمی نے اس کا اردو ترجمہ نہایت خوب صورت کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ چمن نہل انگریزی کے خاصے معروف قلم کار ہیں اور تا حال ان کی بارہ کتابیں منظرِ عام پر آکر خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ پیشِ نظر ناول تقسیمِ ہند کے وسیع پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ ناول دراصل فرقہ پرستی کا شکار ہونے والے ان افراد کا المیہ ہے جن پر متعصب اور ظالم معاشرہ انسانیت سوز مظالم روا رکھتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ مصنف کا قلم اس نازک موضوع کے پل صراط کو غیر جانب داری کے ساتھ طے کرنے میں کامیاب ہوا ہے اور آزادی کے فوراً بعد سرحد کے دونوں طرف ہندو، مسلم، سکھ فرقہ واریت اور ہر فرقے کے مظلومین کی پر تاثیر ترجمانی کی گئی ہے۔ بلاشبہ "آزادی" احساسِ تحفظ، جذبہ امید و بیم، خوف و دہشت اور فرقہ وارانہ کشاکش کی متاثر کن تصویر ہے۔

ترجمے کی زبان رواں دواں اور سلیس ہے جس کے لیے شجاع الدین صدیقی کو داد ملنی چاہیے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

پنجرے کے پنچھی

مصنف: مانک ٹالا
پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی
قیمت: ۳۵ روپے

مانک ٹالا اردو کے معروف افسانہ نگار ہیں قبل ازیں ان کے کہانیوں کے مجموعے ("پیاسی بیل" اور "گناہ کا رشتہ") شائع ہو چکے ہیں۔ پیش نظر کتاب میں موصوف کی اٹھارہ نئی کہانیاں یکجا کر دی گئی ہیں۔ آج کا اردو افسانہ عام طور پر تجریدیت اور علامت پسندی کے بھیر میں پڑ کر جس طرح کہانی سے کٹ گیا ہے اور نتیجے میں قاری کی دلچسپی سے محروم ہو گیا ہے، مانک ٹالا جیسے چند افسانہ نگاروں نے اس سیلاب پر باندھ کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ باماجرا افسانے لکھتے ہیں۔ اس طرح نہ ان کے افسانوں میں ترسیل کی ناکامی کا المیہ جنم لیتا ہے نہ وہ خشکی اور سپاٹ پن جو قاری کو کہانی کے نام سے بیزار کر دے۔ زبان و بیان پر مضبوط گرفت اور انسانی نفسیات پر گہری نگاہ مانک ٹالا کو اس عہد کے قابلِ ذکر کہانی کاروں میں شامل کرتی ہے مجھے بطورِ خاص ان کے افسانے "گھر یاد آیا" اور "پنجرے کا پنچھی" زیادہ پسند آئے۔

کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر انوار احمد کا بصیرت افروز مقدمہ بعنوان اردو کہانی اور موتیوں کا تاجر بھی شاملِ اشاعت ہے۔ (ڈاکٹر مظفر حنفی)

تیسری دنیا کے لوگ

مصنف: ابن کنول
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵۔
قیمت: ۲۰ روپے

کہانیوں کا یہ چھوٹا سا مجموعہ نوجوان افسانہ نگار ابن کنول کے تخلیقی رویے کی تازگی کا آئینہ دار ہے۔ عام انسانوں اور عام انسانی تجربوں کی روداد انھوں نے خاصی مہارت کے ساتھ بیان کی ہے۔ ان تجربوں کی ترسیل میں زبان و بیان اور تکنیک کہیں مانع نہیں ہوتے۔ تصنع اور پوز سے عاری ہونے کے سبب یہ کہانیاں اپنی عمومیت کے باوجود اپنی دلچسپی قائم رکھتی ہیں (نسیم حنفی)

جنم کنڈلی

ناول نگار: نہیم اعظمی
ناشر: ادیب سہیل الباقر پبلی کیشنز، کراچی
قیمت: ۵۴ روپے

نہیم اعظمی کی ادبی زندگی کے کئی پہلو ہیں مثلاً جرنلسٹ، ادیب، شاعر، افسانہ نویس اور ناول نگار۔ لیکن اردو فکشن نے نہیم اعظمی کو اپنا بنا لیا ہے اور اعظمی نے خلوص کے ساتھ اپنی حیثیت علم، تجربات، مشاہدات اور افکار و ادبی عقائد کے لیے اردو فکشن ہی کو پیرایۂ اظہار کا سرمایہ تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۸۲ء میں بارہ افسانوں کا پہلا مجموعہ "پھر کیا ہوا" چھپا پا گیا۔ یہ روایت معروف ہے کہ افسانہ کی آشنائی فن کار کو "ناول کا عشق" عطا کرتی ہے۔ نہیم اعظمی کا پہلا ناول — بہت دیر

ہو چکی" ۱۹۶۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

ناولسٹ کا زیر نظر ناول "جنم کنڈلی" اس وقت ادبی دنیا میں موضوع بحث بنا ہوا ہے اس کو پہلا تجرباتی ناول بھی کہا گیا ہے۔ پروفیسر انجم اعظمی نے اس ناول کی تکنک، مرکزی کردار اور بعض ایسے کرداروں پر تفصیل سے لکھا ہے جن کی آگہی فن کار کا ہم وطن ہونے کے ناتے ان کو حاصل ہے۔ تکنیک کی بارے میں ان کی رائے ہے کہ تلازم خیال، ار یشنل اور ایبسرڈ عناصر ثلاثہ کا امتزاج ہے۔ واضح طور پر لکھا ہے "یہ ناول بیسویں صدی کے اس آدمی کی جنم کنڈلی ہے جس کا مقدر مسلسل بھٹکنا ہے۔

اس ناول میں تاریخی وتہذیبی عہد تقریباً ڈیڑھ سو برس کو محیط ہے لیکن گیان دھیان، قبائلی اور زراعتی زندگی نیز عقیدے کے ہزار داستانی رنگ کا کینوس قطعی مکمل ہے۔ وید، اپنشد، راماین مہا بھارت، توریت، زبور، انجیل، قرآن سب کا فیض شامل ہے۔ ہندو دیو مالا اور اساطیر کے علاوہ یونانی مفکرین اور مغربی ومشرقی مجددین کے افکار واحوال کی جلوہ سامانی ہے۔ ناول میں ایک لفظ کشکول ہے۔ اس کی دس معنوی سطحیں درج ہیں۔ اس کو علامت قرار دیا جائے یا تشبیہ؟ جنسی تلذذ کے لیے بھی کشکول کا استعمال ہوا ہے۔ اس سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کے ہر فرد کا کشکول خالی ہے؟ اگر ایسا ہے تو استحصال کنندہ اور استحصال زدہ کے درمیان "لچھمن ریکھا" کہاں ہے؟ فن کار کی ہمدردی کس کے ساتھ ہے۔

بہر حال "جنم کنڈلی" پر قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" سایہ فگن ہے۔ فہیم اعظمی نے مرکزی کردار کے سفر میں ہر سنگِ میل پر کسی مغربی مفکر کا قول درج کیا ہے۔ وہ انگریزی میں ہے اور اس کے اوپر خطوط میں عنصرِ حیات کی توضیح ہے۔ بظاہر سارترے کا اثر غالب ہے۔ (سید احمد ولی)

سمت سفر

افسانہ نگار: ناوک حمزہ پوری

ملنے کا پتا: قوس اردو لائبریری، حمزہ پور ۸۲۴۲۱۱ (ڈیری گھاٹی)

قیمت: بارہ روپے

ناوک حمزہ پوری کا نام ادبی دنیا میں جانا پہچانا ہے، شاعری، انشائیہ نگاری اور تحقیق وتنقید کے باب میں ان کی کاوشیں اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہی ہیں۔ اب پچھلی دو دہائیوں کے دوران شائع شدہ ان کے ایک درجن افسانوں کا مجموعہ "سمت سفر" کے نام سے سامنے آیا ہے، جسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔

سن ۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے نے جس طرح علامت نگاری اور ابہام سے اپنا رشتہ جوڑا ہے، اس کا اثر ناوک صاحب کے افسانوں پر دکھائی نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے ان کی افسانوں کی پہلی انفرادیت تو یہ ہے کہ وہ بامجرا افسانے ہیں اور قاری کے سامنے ترسیل کا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرتے۔ ان افسانوں کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان افسانوں کی نوعیت صرف تفریحی نہیں، اخلاقی اور مقصدی بھی ہے۔ ان دونوں خصوصیات کی موجودگی بعض ذہنوں میں یہ شبہ پیدا کر سکتی

کہ افسانہ نگار کا نقطۂ نظر قنوطی اور فرسودہ ہوگا' لیکن یہ بات بھی غلط ہے۔ ناوک نے عصرِ جدید کے بعض اہم مسائل سے متعلق حقیقت پسندانہ رویّہ اختیار کر کے اپنی روشن خیالی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے مقابلے میں ناوک کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے دورِ حاضر کے جن مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے ان میں سے بیشتر ذاتی اور انفرادی نہیں' اجتماعی ہیں۔

محمد اشرف علی نے جو اس کتاب کے مرتب بھی ہیں' ناوک کی افسانہ نگاری کے بارے میں ایک اہم بات یہ کہی ہے کہ ان کے قریباً تمام افسانوں میں کسی نہ کسی روپ میں ہم عورت کو موجود پاتے ہیں اور وہ عورت کبھی نہ تو چاٹی جانے والی مٹھائی ہے اور نہ گھر کے اندر کھونٹے سے بندھی رہنے والی گائے' بلکہ وہ اپنے معاشرے سے پوری طرح پیوستہ رہ کر اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ میں اشرف علی صاحب کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے صرف یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ناوک کے افسانوں میں ہم جن عورتوں سے متعارف ہوتے ہیں وہ عصرِ حاضر کے مطالبات اور اپنی ذمہ داریوں سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ انھیں نبھانے کے لیے برسرِ کار بھی ہیں۔ اس کے باوجود ان کا رویّہ عام طور پر انقلابی نہیں احتجاجی ہے۔

مجموعی طور پر زبان و بیان کی شگفتگی' تعمیرِ ماجرا کی دلکشی اور عصری مسائل سے آگہی کے سبب ناوک حمزہ پوری کے یہ افسانے بھی ان کی دوسری تخلیقات کی طرح جاذبِ نظر اور قابلِ تحسین ہیں۔ کتابت کی بعض غلطیاں گراں گزرتی ہیں مگر طباعت صاف ستھری اور قیمت بے حد مناسب ہے۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

مسکراتا ہوا شخص

قیوم راہی
ناشر: سید عاصم محمود شاہکار بک فاؤنڈیشن۔ کراچی
قیمت: تیس روپے

"تیسری آپا" اور "روشنی کا پتھر" سے گزرتا ہوا قیوم راہی "مسکراتا ہوا شخص" تک آپہنچا ہے۔ تخلیق کی اس تیسری منزل تک پہنچنے کی بظاہر آسان مسافت حقیقت میں تجربات اور مشاہدات کا ایک طویل سفر تھا جو قیوم راہی نے بڑے کرب سے طے کیا ہوگا یعنی ذہنی کرب جسے ہم "کربِ احساس" کا نام دے سکتے ہیں۔ قیوم راہی کے قلم نے حقیقت آشنا افسانوں کو جنم دیا ہے ورنہ اس مشینی دور میں افسانے کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ ذہنی بے راہ روی انتشار اور دھندلکوں کا ایسا گنجلک اظہار ہے جس کا مفہوم "دربطنِ تخلیق کار" کے مصداق ہوتا ہے۔ ہمارا عہد یوں بھی کمپیوٹر کا عہد ہے۔ ادبی تخلیقات کو اب ریاضی کے فارمولوں کے مطابق چلنے کی تربیت لینی ہوگی اور کمپیوٹر کی تخلیقات میں دماغ کی کار فرمائی جس حد تک بھی ہو دل نہیں دھڑکتا۔ قیوم راہی بسا غنیمت ہیں کہ ہمیں گوشت پوست کے انسانوں کی کہانیاں سناتے ہیں۔ سچی کہانیاں ہمارے آپ کے گھروں میں رونما ہونے والے چھوٹے بڑے واقعات قیوم راہی کے ذہن میں کہانی بن جاتے ہیں جسے وہ سیدھے سچے اور فطری انداز میں کاغذ پر اتار لیتے ہیں۔ یہی کہانیاں قاری کو دلاسا دیتی ہیں کہ خدا کی اس ٹھوس زمین پر تمھارے علاوہ اور بھی لوگ "کربِ احساس" میں مبتلا ہیں۔ "مسکراتا ہوا شخص" کی کہانیوں میں ایک عام قاری جب اپنے جیسے بہت سے چہرے دیکھتا ہے تو اس کا "احساسِ تنہائی" دور ہو جاتا ہے۔ یہی ان کہانیوں کی فتح ہے۔

(خالد محمود)

پت جھڑ میں خود کلامی

مصنف: رشید امجد
ناشر: اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی
قیمت: تیس روپے

رشید امجد کا شعری لہجہ علامتی اظہار اور تجریدی ڈھانچہ سب مل کر اس کے فن کی ایک نمائندہ جہت اور اس کا منفرد تشخص قائم کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ رشید امجد تجربوں کے سیلاب رواں میں بہہ کر ٹھوس کہانی کو گرفت میں نہیں لیتا بلکہ اس تاثر کو پکڑتا ہے جو سیّال صورت میں تجربے کے مرکز میں موجود ہوتا ہے اور صرف تخلیقی افسانہ نگار کے ذہن کی طرف خود بخود لپکتا چلا آتا ہے۔ "بے زار آدم کے بیٹے"، "ریت پر گرفت"، "سہ پہر کی خزاں" سے لے کر "پت جھڑ میں خود کلامی" تک رشید امجد نے خاصا طویل سفر طے کر لیا ہے۔ اس تمام سفر میں اس نے اظہار و ابلاغ کے چند بے حد نادر تجربے اور اپنے تخلیقی ذہن کی جدت سے مشاہدے کی تقلیب کی، وہ موضوع سے لپٹنے کے بجائے اس جوہر کو تلاش کرتا ہے جو بالعموم فنکار کی نظر سے اوجھل ہوتا ہے اور بعض اوقات افسانہ تخلیق ہو جانے کے بعد ہی قاری پر منکشف ہوتا ہے۔

"پت جھڑ میں خود کلامی" کے افسانے تجریدی افسانے ہیں اس میں استعارہ ٹھوس صورت اختیار کرنے کے بجائے تجریدی انداز میں صرف اپنی چھاپ دکھاتا ہے اور جگنو کی طرح روشنی کی ایک چھوٹی سی جھلک کے بعد منظر سے روپوش ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تماشا عکس تماشا" میں زندگی کو دوسرں کی آنکھ سے دیکھنے کی جو کاوش نظر آتی ہے اس میں کربلا اور حضرت موسیٰ کی زندگی کے واقعات کو استعارہ بنایا گیا ہے اور ان کی تقلیب میں رشید امجد کا فن پوری طرح اس کا معاون ہے۔

ٹرانسفارمیشن کا یہ عمل رشید امجد کی اپنی اختراع ہے اور یہ بندر کتنے یا مکھی میں منتقل ہو جانے کے عمل سے یکسر مختلف ہے۔

پچھلے دنوں عذرا اصغر اور اظہر جاوید کے رسالہ "تخلیق" کے مذاکرے میں انیس ناگی نے کہا تھا کہ تجریدی افسانہ انور سجاد کی شرارت ہے اور اس نے راولپنڈی کے افسانہ نگاروں کو گمراہ کیا ہے نیز بلراج مینرا انور سجاد کا بھارتی ایڈیشن ہے۔" موخرالذکر بات سے قطع نظر مجھے یہاں اس بات کی وضاحت بھی کرنا ہے کہ تجریدی کی قدر مشترک کے باوجود رشید امجد اور انور سجاد کے فن کی حدود مختلف ہیں رشید امجد کا معجزۂ فن سیّال صورت سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ انور سجاد نے ٹھوس حقیقت کو تجریدی صورت دے کر اسے کھوکھلا کرنے کی سعی کی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جدید اردو افسانے میں رشید امجد کا ایک ذاتی تشخص تسلیم کیا جا چکا ہے۔ افسانے کا ذہین قاری اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اس کے افسانوں کے عنوان یاد رکھنے میں قاری سخت جوکھم سے گزرتا ہے۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، انتظار حسین، اشفاق احمد اور غلام الثقلین نقوی کے معروف افسانے اپنے عنوان کے حوالے سے لوحِ دماغ پر فوراً ابھر آتے ہیں۔ لیکن رشید امجد کے افسانوں کی بازیافت کے لیے لوحِ دماغ کو یوں کھرچنا پڑتا ہے جیسے غزل کا پورا شعر تلاش کر رہے ہوں۔

(انور سدید)

فنکاری

مصنف : انورخاں
ناشر : معیار پبلی کیشنز ۲۰۰/۷ کاشیخ سرائے، نئی دہلی
قیمت : پچیس روپے

انورخاں ۷۰ء کے بعد ابھرنے والی نسل کے صف اول کے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "راستے اور کھڑکیاں" آج سے دس برس پہلے شائع ہوکر اردو کے افسانوی ادب میں ایک معتبر مقام حاصل کرچکا ہے۔ فنکاری، ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جس میں اکیس افسانے شامل ہیں۔

ایجاز و اختصار انورخاں کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی کہانیاں واشگاف انداز میں قاری پر منکشف ہونے کے بجائے اس کے احساس کو اس طرح چھوتی اور جگاتی چلتی ہیں کہ ذہن میں معنی کے کئی رنگ لہرانے لگتے ہیں۔

فنکاری، شام رنگ، اپنائیت، لمحوں کی موت، بانسری کی آواز، لمس، عرفان، روزن اور گونج ان کی کامیاب ترین کہانیاں ہیں۔ جن کے مطالعے کے بعد بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ افسانے اپنی فنی خوبیوں کے اعتبار سے اپنی ایک الگ شناخت بناتے ہیں

(سلام بن رزاق)

رت جگوں کا زوال

مصنف : مشتاق مومن
ناشر : نیو رائٹرس پبلی کیشنز، کرلا، بمبئی
قیمت : بیس روپے

"رت جگوں کا زوال" مشتاق مومن کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں چودہ افسانے شامل ہیں۔

مشتاق مومن اپنے آس پاس کی زندگی اور ماحول ہی سے اپنے افسانوں کے مواد اور کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں۔

انھوں نے چالو فیشنوں، بلند بانگ نعروں اور برخود غلط تجربوں سے متاثر اور مرعوب ہوئے بغیر افسانے لکھے ہیں۔ ایک بہت لمبی قبر، آسیب، کریم لگا بسکٹ اور چیونٹیاں رت جگوں کا زوال اور رموز جیسے افسانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کے افسانے کسی بھی ازم، تحریک یا فارمولے کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہیں۔

ان کے افسانے قاری کے لیے ابلاغ کا مسئلہ پیدا نہیں کرتے۔ وہ زندگی کی ہولناکیوں کو علامت اور استعارے کی عینک سے دیکھنے کی بجائے ننگی آنکھوں سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔

(سلام بن رزاق)

طنز و مزاح

آنکھیں میری باقی اُن کا

مصنف: ڈاکٹر رام آسرا راز
پتا: مکتبہ جامعہ اردو بازار دہلی
قیمت: ۳۲ روپے

ڈاکٹر راز اردو کے جانے پہچانے انشا پرداز ہیں۔ ان کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کو اردو زبان و ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ اور اب ان کا شمار اردو کے ان اہلِ قلم میں ہوتا ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ وہ اپنی تصنیف "اردو و ہندی کا لسانی رشتہ" پر علمی دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب موصوف کے تیرہ مضامین کا مجموعہ ہے بیشتر مضامین میں طنز و مزاح کا کچھ رنگ جھلکتا نظر آتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے طنز و مزاح کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک اچھا رجحان ہے۔ حالاں کہ یہ راہ بہت دشوار گزار ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر شریف احمد نے پیش گفتار میں لکھا ہے کہ:

> "میں، راز صاحب اور آپ سب ہی جانتے ہیں کہ طنز و مزاح ایک طرح سے تلوار کی دھار پر چلنے کا نام ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی' یہ ایک سنگلی عمل ہے۔ یا تو تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا یا پھر بوم رنگ ہوکر تیر انداز کو اپنا نشانہ بنا لیتا ہے یعنی یا تو قلم کار مولیئر' بنتا ہے یا مارک ٹوائن یا مرزا غالب یا اکبرالٰہ آبادی یا پھر رشید احمد صدیقی یا پھر ان گنت بے نام لکھنے والوں کے مجمع میں گم ہو جاتا ہے۔"

راز صاحب نے اس راہ میں قدم رکھا ہے تو یقیناً مشق و مزاولت سے وہ مستقبل میں قابلِ ذکر منزل پر پہنچ جائیں۔ ان مضامین میں انھوں نے عہدِ حاضر کے سماجی بگاڑ اور معاشرے کی خامیوں کو اپنے ایک خاص انداز میں پیش کیا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کو زندگی کی تلخیوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور انھوں نے اپنی قلبی کیفیات اور جھن کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش ہے اور موجودہ دور کی بے اعتدالیوں پر اپنے انداز میں طنز کیا ہے۔ جا بجا مزاحیہ فقروں نے مضامین کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ اسلوب تحریر بہت شگفتہ ہے۔ مجموعی طور پر سب ہی مضامین دلچسپ ہیں اور علمی ادبی معلومات کے اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہیں۔ بعض مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ حوا کی بیٹیاں۔ پردہ۔ پڑے گر بیمار۔ آنکھیں میری باقی ان کا۔ کتاب صوری حیثیت سے بہت اچھی ہے۔ (امیر حسن نورانی)

دیوارِ قہقہہ

شاعر: محمد یوسف پاپا
ناشر: نئی آواز جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
قیمت: پندرہ روپے

یوسف پاپا کی ظریفانہ شاعری کے اس مجموعے میں ہر طرح کی چیزیں ہیں۔ غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، آزاد نظمیں بھی ہیں اور کنڈلیاں بھی۔ کنڈلی کا ہندی شاعری میں کافی رواج ہے اور شاعر نے مجموعے کی ابتدا میں ملفوظات کے تحت اس صنفِ شاعری پر اس طرح روشنی

ڈالی ہے۔

"کنڈلی ہندی شاعری کی ایک صنف ہے۔اس میں چھ مصرعے ہوتے ہیں پہلے دو مصرعے دوہا اور بقیہ چار مصرعے رولا کہلاتے ہیں۔ دوہے کے ہر مصرعے میں دو حصے ہوتے ہیں جن کو چرن کہتے ہیں۔ پہلے چرن میں تیرہ ماترائیں اور دوسرے چرن میں گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں... کنڈلی کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ جس لفظ سے شروع ہوتی ہے اسی لفظ پر ختم ہوتی ہے۔"

اتنی پابندیوں کے ساتھ شعر کہنا ویسے بھی مشکل ہے اور اس میں ظرافت پیدا کرنا تو مشکل ترین کام ہے۔ مگر یوسف پاپا اس صنفِ سخن کے ذریعہ سماجی ناہمواریوں کی طرف اشارہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اردو کی ظریفانہ شاعری میں پاپا نے پہلی بار اس صنف سخن کا نمونہ پیش کیا ہے۔ مگر "دیوارِ قہقہہ" میں صرف کنڈلیاں ہی تعریف کے قابل نہیں، غزلیں اور نظمیں بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پاپا کا فن نظموں کے پیراہن میں زیادہ شائستہ نکھرے اور اثر انگیز انداز میں جلوہ گر ہوا ہے۔

یہ غزلیں یقینی طور پر مشاعروں میں شریک ہونے والے قارئین کی ذہنی سطح اور ادبی ذوق کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں اور شاید ان ہی غزلوں کے پیش نظر فکر تونسوی صاحب نے اپنے پرلطف "دیباچے" میں پاپا کو نظیر اکبرآبادی سے تشبیہہ دیتے ہوئے عوامی شاعر کہا ہے۔ در اصل پاپا کی غزلوں کے موضوعات محدود ہیں۔ وہ بیشتر عشق و محبت کی گزرگاہ اور گھر کی چہار دیواری کے آس پاس چکر لگاتے رہتے ہیں۔ روایتی قسم کے عشق کا موضوع اب سنجیدہ شاعری کی طرح ظریفانہ شاعری میں فرسودہ ہو گیا ہے۔ مگر پاپا کی غزلوں کا یہی خاص موضوع ہے۔ مثال کے طور پر ابتدائی تین غزلوں کو ہی دیکھیے ؎

کچھ نئے نقش محبت میں ابھار دیا رو | سر کسی شوخ کے بلڈ آگ سے مار دیا رو
دل کے فٹ پاتھ کو ہموار بنانے کے لیے | اس سے دس بیس حسینوں کو گزار دیا رو

اس کا شوہر نہ لگے ہے مجھے | یہ کوئی دل جلا لگے ہے مجھے
اپنی بیوی سے خود ہی پیار کروں | یہ تو اک مرحلا لگے ہے مجھے

جس دن سے بن گیا ہوں میں ہڈی کباب میں | وہ شوخ پڑ گیا ہے عجب پیچ و تاب میں

ظاہر ہے کہ یہ موضوعات زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے سکتے اس لیے دورِ حاضر کے کئی ظرافت نگار شعرا کی طرح پاپا بھی عصری آگہی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، مگر بہت کم۔ البتہ نظموں میں نئے زمانے کے نئے مسائل پر وہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں۔ پابند نظموں میں "بگا رجا معہ" "عاق کر دوں گا" "ہم کو دیکھیے جو آنکھ ڈالا ہو" "موڈرن گرل عرف حیائی ٹیٹی" اور ریت کے ناخدا وغیرہ بڑی خوب صورت نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں جو گہرا طنز ابھرتا ہے وہ بلاشبہ اعلا ظریفانہ شاعری کی پہچان ہے۔ کم از کم ان کی ایک نظم "ریت کے ناخدا" ایسی

ہے جو اردو کی اہم ترین ظریفانہ نظموں کے پہلو میں رکھی جا سکتی ہے۔ اگر وہ ظریفانہ شاعری کے وسیع میدان میں اس طرح کے نقش ابھارتے رہے تو اردو کے اہم ظریفانہ شاعروں میں ان کا شمار ہو گا۔ جہاں تک ان کی آزاد نظموں کا تعلق ہے ان میں سے بعض گہرے طنز کی حامل ہیں

مجموعی طور پر "دیوارِ قہقہہ" اسم مسمّیٰ ہے۔ یوسف پاپا نے ہمیں ہنسانے اور شرم دلانے کے لیے حقیقت نگاری کی راہ اپنائی ہے اور مبالغہ آرائی سے کہیں کام نہیں لیا۔ جیسا کہ انھوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے محاوروں کی الٹ پھیر اور لفظی تحریفات سے بھی کام لیا ہے۔ بعض ایسے الفاظ جو خالص عوامی ہیں مثلاً ڈسکارڈ، پکپکا، کٹر کیبٹ وغیرہ ان کے یہاں بے تکلفی سے استعمال ہوتے ہیں۔ کتاب کی طباعت اچھی ہے اور سرورق عمدہ۔ کتابت کی بعض غلطیاں موجود ہیں مگر ایسی نہیں جن سے مواد کی شیرینی متاثر ہوئی ہو۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

عطائیے

شاعر: عطاء الحق قاسمی
پتا: غالب پبلشرز، لاہور
قیمت: نہ معلوم

"عطائیے" پاکستانی ادیب وصحافی عطاء الحق قاسمی کی تصنیف ہے جسے غالب پبلشرز لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی جو بات سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کا دلچسپ نام ہے جو اپنے مصنف کے نام کی رعایت سے ایک لطیف معنویت کا حامل ہے۔ اس نام سے فخر و افتخار کا جو پہلو نکلتا ہے اس کا مصنف کو بھی احساس ہے "عطائیے کے نام سے جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے یہ دراصل مجھ عطائی کی تحریریں ہیں اور یوں اگر اس کتاب کا نام "عطائیے" ہے تو یہ افتخارِ فن کا اظہار نہیں عجزِ فن کا اعتراف ہے۔"

اس کتاب میں سولہ خاکے اور چوبیس دیگر ہلکے پھلکے مضامین شامل ہیں جنھیں کوئی مخصوص عنوان نہیں دیا جا سکتا ہے۔ خود مصنف نے اپنی ان تحریروں کو "سفرنامہ نما" کہانی نما، رپورتاژ نما، انشائیہ نما اور خاکہ نما" کہا ہے۔ ان مضامین میں یہ سارے انداز کہیں الگ الگ اور کہیں یک جا نظر آتے ہیں۔ بہر حال آسانی کے لیے ان مضامین کو ایسے انشائیے کہا جا سکتا ہے جن میں طنز و مزاح کا عنصر اور قصہ گو کا انداز غالب ہے۔

احمد ندیم قاسمی سے متعلق خاکہ "قاسمی اور قاسمی" اور امجد اسلام پر لکھا گیا خاکہ 'مخولیا' خاکہ نگاری کی اچھی اور کامیاب مثالیں ہیں کہ ان سے خاکہ نگار اور اس کے ممدوحین کے درمیان مکمل قربت کا احساس ہوتا ہے جس کی بدولت اس نے ان کی شخصیت کے مختلف خدو خال بڑی خوب صورتی کے ساتھ اجاگر کیے ہیں۔ محمد طفیل پر جو خاکہ "محمد طفیل اور محمد نقوش" کے عنوان سے لکھا گیا ہے اس میں قربت کا انداز نہیں پایا جاتا۔ نتیجتہً یہ خاکہ دلچسپ عنوان کے باوجود اچھا اور موثر خاکہ نہ بن سکا۔ انشائیوں میں "گھوڑوں کے شہر میں"، "اب اور تب"

اور اللہ دین کے جن کا زوال" اچھے ہیں۔
مجموعی طور پر "عطائیے" میں قاری کی دلچسپی کا وافر سامان موجود ہے۔ (حنیف کیفی)

دراصل

مصنف: شکیل اعجاز
رابطہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔
قیمت: بارہ روپے

شکیل اعجاز آج ایک مشہور و معروف فن کار کا نام رہا ہے۔ یہ قابلِ رشک شہرت اس کی مختلف الجہات منفرد فنی صلاحیتوں کی دین ہے۔ مختلف ادبی کتابوں کے معنی خیز ٹائٹیل، صفِ اول کے ہم عصر شعراء و ادباء کے علاوہ متقدمین کی نایاب تصاویر نیز فلمی اور سیاسی شخصیتوں کی تصاویر بنا کر یہ نوجوان اور ہونہار فن کار شہرت و ناموری حاصل کر چکا ہے۔ شکیل اعجاز نے برش کے ساتھ قلم کی جولانیوں کے مظاہرے بھی شروع کر دیے ہیں۔ پچھلے دو تین برسوں میں اس کے مضامین شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ "دراصل" شکیل اعجاز کے مضامین اور انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے جو معنی خیز سرورق میں لپٹے ڈیمائی سائز کے ۱۰۶ صفحات پر محیط ہیں۔ عنوانات سیدھے سادے لیکن مواد میں ایسی پہلو داری کہ پرتیں اٹھاتے جائیے اور مفاہیم کے نئے نئے جہانوں کی سیر کیجیے۔ تمام مضامین نہ صرف عنوانات سے بلکہ ذائقہ سے بھی جدا جدا ہیں۔ ان میں رشید احمد صدیقی شوکت تھانوی۔ کنہیا لال کپور۔ نکر تونسوی۔ مجتبیٰ حسین۔ یوسف ناظم وغیرہ کے رنگوں کی جھلکیاں تلاش کرنا بھی بے سود ہے۔ شکیل اعجاز کا طرزِ تحریر اس کا اپنا ہے اس لیے منفرد ہے۔ تحریروں میں کہانی در کہانی کا لطف اور گرد و پیش کے مسائل پر دلچسپ چوٹیں ہیں۔ طنز کا ہدف زیادہ تر شاعر۔ ادیب اور مدیرانِ رسائل ہیں اس کے علاوہ اپنے عزیز ترین دوستوں۔ قریبی لوگوں حتیٰ کہ خود پر بھی طنز کر کے دیانت داری کا ثبوت دیا گیا ہے۔ دراصل سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"پہلی کتاب کا پیش لفظ تو مجھے دیوانے کی بڑ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے پوچھا بھی نہیں اور میں نے بتانا شروع کر دیا کہ سب سے پہلا مضمون میں نے کب لکھا (یا ابھی تک لکھا ہی نہیں) ابتدائی تحریک کہاں سے ملی (یا پہلے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ تحریک بعد میں ملی)" (خود پیش لفظ)

"شریف النفس نظر آنے والوں میں سے بیشتر کے دلوں میں مجرمانہ خیالات کبھی نہ نکلنے والے کرائے داروں کی طرح مقیم ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے دماغ میں یہ خیال سانپ کی طرح سرسرانے لگا ہو کہ کسی کے ساتھ دغا فریب کریں اور قانون سے بچے رہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ لیٹر پیڈ چھپوا لیجیے۔" (لیٹر پیڈ)

یہ شکیل اعجاز کی پہلی کتاب ہے اور وہ خود ملک کا سب سے کم عمر طنز و مزاح نگار ہے اس کے باوجود اس کی یہ خود اعتمادی قابلِ تعریف ہے کہ کتاب میں کسی بڑے ادیب یا نقاد کا ایک بھی جملہ شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری۔ خواجہ احمد عباس۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ رام لعل نکر تونسوی۔ ڈاکٹر مظفر حنفی۔ یوسف ناظم اور جوگندر پال وغیرہ نے اس کتاب پر پسندیدگی کے

خطوط لکھے اور بعض نے شکیل اعجاز کے طرزِ تحریر کو بہت سراہا ہے۔ میں اپنے تبصرے کا اختتام پاکستان کے معتبر نقاد انور سدید کے ان جملوں پر کرتا ہوں کہ :

"سالِ نو کے دوران مجھے ہندوستان سے خفیے تحفے ملے یہ کتاب ان میں سب سے زیادہ قہقہہ افروز ہے۔ شکیل اعجاز کے مزاج کی لطافت تہذیبی حدود کے درمیان رہتی ہے اور طنز، جراحت کے بجائے شگفتگی پیدا کرتا ہے وہ لفظ کو فطری انداز میں مس کرتے ہیں لیکن لفظ کے بطون میں گدگدی سی محسوس ہوتی ہے اور قاری مسکرانے لگتا ہے۔ میں نے کتاب ایک ہی نشست میں پڑھی ہے اور ختم کر چکا تو افسوس ہوا کہ اتنی جلدی ختم کیوں ہو گئی۔" (محبوب راہی)

چنانچہ

مصنف: مسیح انجم
پتا: شگوفہ ۱۳ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد ۱
قیمت: بارہ روپے

مسیح انجم اردو ظرافت نگاری کی دنیا میں ایک معتبر مقام کے مالک ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے ۲ دو مجموعے درپردہ (۱۹۷۶ء) اور سائیڈ سے چلیے (۱۹۷۲ء) اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ "چنانچہ" ان کا تیسرا مجموعۂ مضامین ہے جس میں دس ظریفانہ مضامین اور تین خاکے ہیں۔ ویسے "بیش لفظ" بھی ایک علاحدہ مضمون کا لطف رکھتا ہے۔ "تعارف نما" کے عنوان سے کتاب کی ابتدا میں سید مصطفیٰ کمال، مدیر شگوفہ کی ایک تحریر شامل ہے جس کے مطابق :

"مسیح انجم کے مزاج میں بلا کی سنجیدگی ہے، چہل اور چلبلا پن نام کو نہیں۔ لیکن مزاج کے اس کھارے پن کے برخلاف ان کی تحریروں میں بے حد شگفتگی اور ظرافت ملے گی... لطف یہ ہے کہ اپنی تحریر کو لطیفوں، مسخرگی اور مبالغہ سے بوجھل نہیں کر دیتے۔ اس معاملے میں مسیح انجم کا مزاج "باکس آفس" پر نہ تو ناکام ہے اور نہ ضرورت سے زیادہ کامیاب... مبالغہ ان کے ہاں ضرور ہے لیکن اس قدر نہیں کہ تحریروں کی تاثیر وقتی اور لمحاتی نوعیت حاصل کر لے۔"

"چنانچہ" کے مضامین کا مطالعہ ان خیالات پر مہر تصدیق لگاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طنز و مزاح میں میانہ روی مسیح انجم کا شعار ہے۔ ان کے بیشتر مضامین ایسے ہیں جن کا مطالعہ کرتے وقت قاری کا ذہن ایک لطیف اور خوش گوار کیفیت سے دوچار رہتا ہے اور ایک میٹھی میٹھی مسکراہٹ اس کے لبوں پر رنگینی رہتی ہے مگر یہ مسکراہٹ قہقہے میں بہت کم تبدیل ہوتی ہے۔ یہ کیفیت دراصل انشائیے کے ساتھ مخصوص ہے لیکن مسیح انجم کے مضامین میں واقعات کا تسلسل اور بھرپور بہاؤ انھیں انشائیے سے دور لے جاتا ہے اور وہ ایک انفرادی رنگ کے مالک بن جاتے ہیں۔ انھوں نے مبالغے سے کم اور حقیقت سے زیادہ کام لیا ہے۔

"چنانچہ" کے مضامین میں موضوعات کا تنوع نمایاں ہے۔ سماج، سیاست، مذہب

اور ادب میں خوش خوراکی کا مظاہرہ کرنے والے بھی ان کی نگاہوں سے نہیں بچ پائے ہیں۔ بدلتی ہوئی تہذیبی و سماجی قدروں کے اسباب و علل پر وہ گہری نظر رکھتے ہیں اس لیے چھوٹے چھوٹے اور اکہرے جملوں میں بڑی دور رس باتیں کہہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ایک مضمون کا "میں" ایسا دسترخوان خریدنے نکلتا ہے جس پر اردو کے خوب صورت شعر لکھے ہوں۔ دکان دار اس طرح کا دسترخوان دکھانے کے بعد یہ اطلاع دیتا ہے کہ اب وہ "انگلش میڈیم" کے دسترخوان چھپوا رہا ہے چوں کہ اس کی ڈیمانڈ زیادہ ہے۔ دکان دار کے اس جواب سے جو صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ خاصی دلچسپ ہے۔

مسیح انجم واقعات سے مزاح پیدا کرنے میں ماہر ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ جملہ بازیاں نہیں کرتے یا الفاظ کی قطع و برید اور محاوروں کی توڑ پھوڑ سے ظرافت پیدا نہیں کرتے۔ یہ ہنر بھی انھیں خوب آتے ہیں لیکن ان کے مزاح کا انفرادی رنگ اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب وہ کسی خاص واقعے کو چٹکیاں لے لے کر بیان کرتے ہیں اور قاری ہر قدم پر ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ جہاں تک "چنانچہ" میں شریک اشاعت خاکوں کا سوال ہے عزیزہ کارٹونسٹ کا خاکہ مختصر مگر پرتاثیر ہے۔ مجتبیٰ حسین کے خاکے سے "ملاقات مانات" کی کیفیت اکثر جھانکتی نظر آتی ہے اور بھارت چند کھنّہ کا خاکہ اوسط درجے کا ہے (اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خود کھنّہ صاحب بھی ایسے ہی ہیں) میرا خیال ہے کہ اس میدان میں ابھی مسیح انجم کو مجتبیٰ حسین یا یوسف ناظم کے مقام تک پہنچنے کے لیے خاصی محنت کرنی پڑے گی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ مسیح انجم "پرانی ٹاکیز پرانی فلم" قسم کے مضامین کم لکھیں (یا نہ لکھیں) تو بہتر ہے۔

مجموعی طور پر "چنانچہ" ایک ایسی کتاب ہے جس کے پڑھنے کے لیے بلاخوف و خطر سفارش کی جا سکتی ہے۔ مسیح انجم مزاح نگار ضرور ہیں لیکن ان کی تحریروں کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ اس سے اربابِ ذوق اور اربابِ ادب و تنقید دونوں کا بھلا ہوگا۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

دشنامے چند

شاعر: ناوک حمزہ پوری
پتا: قوس لائبریری، حمزہ پور، گیا
قیمت: پچیس روپے

قوس حمزہ پوری کی ادبی خدمات کثیرالجہات ہیں انھوں نے شاعری بھی کی، تنقیدی مضامین بھی لکھے، بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا اور ترتیب و تدوین کے کچھ کام بھی سرانجام دیے۔ پیشِ نظر کتاب "دشنامے چند" کے ذریعے موصوف نے طنز و مزاح کے نئے میدان میں قدم رکھا ہے اور اس مہارت کا مظاہرہ کیا ہے کہ اس میدان میں بھی نئے نہیں معلوم ہوتے۔ زبان کے پینترے اور لفظوں کے الٹ پھیر سے مزاحیہ صورتِ حال کو نمایاں کرنا ان کا خاص وصف ہے آس پاس کی ناہمواریوں اور معاشرے کے نشیب و فراز پر ان کی نگاہ گہری ہے اور وہ خلوص کے ساتھ

ان پہلوؤں کی اصلاح کے متمنی نظر آتے ہیں۔ مزاح کی شگفتگی، اس جذبہ اصلاح سے آمیز ہوکر ان کی طنزیہ تحریروں کی خوش گوار اور دل چسپ بنا دیتی ہے۔ مضامین کے اس مجموعے میں مجھے "ملاگنر بدہ"، "مشاعرہ" "انتقال اُن کے ابا کا" اور "دشنا ئے چند" بطور خاص پسند آئے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

چند ادبی شخصیتیں

مصنف: شاہد احمد دہلوی
پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۲
قیمت: پینتیس روپے

خاکہ نگاری بے حد نازک اور خطرناک فن ہے ایسا خطرناک کہ ذرا دار ترچھا پڑا کہ یا تو متعلقہ شخصیت مجروح ہوتی ہے یا خود خاکہ نگار زخمی نظر آتا ہے یہاں شخص کو اندر سے الٹ کر اس کی فرشتہ خصلتی میں پوشیدہ شیطنیت اور کمینگی میں دبی ہوئی نیک صفات کو تلاش کرنا ہوتا ہے اردو میں اس پل صراط سے توازن اور سلامت روی کے ساتھ گزرنے والوں میں شاہد احمد دہلوی کا نام سرفہرست ہے۔ "چند ادبی شخصیتیں" میں ان کے قلم بند کردہ سولہ خاکے شامل اشاعت ہیں جن میں ڈپٹی نذیر احمد، منٹو، جگر، عظیم بیگ چغتائی، جوش، میراجی اور جمیل جالبی کے مرقعے مجھے زیادہ پسند ہیں کیوں کہ یہ تصیدے اور ہجو کے درمیان سے کشید کیے گئے ہیں۔ یہ خاکے بڑے فطری انداز میں آگے بڑھتے ہیں اور متعلقہ شخصیتوں کی کم و بیش تمام بنیادی خصوصیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ دہلی کی ٹکسالی اور با محاورہ اردو پر شاہد احمد کو جو مہارت حاصل ہے یہ تحریریں اس کی روشن مثالیں ہیں۔ زبان کے چٹخارے، نفسیاتی دروں بینی اور بے باکی فکر کی آمیزش نے ان تحریروں کی ادبی قدر و قیمت بہت بڑھا دی ہے۔ یہ کتاب یقیناً اس لائق ہے کہ اسے ہر اچھی لائبریری میں رکھنے کی سفارش کی جائے۔ پیش کش کی خوش سلیقگی بھی داد طلب ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

آم کے آم

مصنف: رام لعل نابھوی
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵..۱۱
قیمت: تیس روپے

رام لال نابھوی کا مزاج طنز و مزاح اور صنفِ انشائیہ سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسی لیے ۱۹۷۹ء میں طنزیہ مزاحیہ خاکوں پر مشتمل ان کی تصنیف "تبسم" منظر عام پر آئی۔ شرف قبولیت ملا۔ اپریل ۱۹۸۳ء میں دوسرا اڈیشن اشاعت پذیر ہوا۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۳ء میں ایک اور رنگ لہرایا۔ "آم کے آم" (انشائیہ) شائع کیا گیا۔ یہ کتاب ہریانہ ساہتیہ اکاڈمی کی مالی امداد سے شائع ہوئی۔ آفسیٹ کی چھپائی ہے۔

"آم کے آم" ایسا نام ہے کہ قاری اس تصنیف کی نفع رسانی کو خود بخود پہیلی کے بقیہ ٹکڑے میں بنا دے گا۔ یہ بات بغیر مطالعہ کہی جاتی تھی اور مطالعے کے بعد قاری کو محسوس ہوگا

کہ اس کے دِل میں خوشی کی ترنگ اور ذہن میں روزمرّہ کی زندگی کے تجربوں کی روشنی ہے۔ کہاوت سچّی ہے۔

اس کتاب میں ایک مضمون صنف انشائیہ پر ہے اور ۱۶ طبع زاد انشائیے شامل ہیں۔ مضمون معلومات افزا ہے۔ مثلاً انشائیہ کا رواج انگریزی کے (ایسّے) کی بدولت ہوا۔ فرانس میں (ایسّے) کا موجد مونتین اور انگلینڈ میں اس کا موجد فرانسس بیکن ہے۔ اس صنف ادب کو برتنے والے تمام مغربی اربابِ قلم کے نام دیے ہیں۔ اقتباسات پیش کیے ہیں۔ مذکورہ صنف کی تعریفیں درج ہیں۔ خصوصیات کا بیان ہے۔

رام لال نابھوی کی تصنیف "آم کے آم" کا مطالعے کے بعد یہ کہنا آسان ہے کہ مصنّف بہ اعتبارِ مزاج وذہن اس صنف پر اظہارِ خیال کے لیے قطعی موزوں ہے۔ عملی نفسیات، حسّیت، پرواز تخیّل۔ موڈ کے بدلتے الوان نیز واضع اسلوب کی بنا پر انشائیہ نگاری کو فرحت آفریں اور کامیاب کہا جائے گا۔

میرے نزدیک درج ذیل پانچ انشائیے اس تصنیف کا بہتر سرمایہ ہیں۔ ان کو پنجاب کہا جا سکتا ہے۔

۱۔ انتظار ۲۔ مسکرانا۔ ۳۔ گالی۔ ۴۔ لغزش ۵۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔

ایک انشائیے کے چند اشارات ملاحظہ کیجیے:

۱۔ گالی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ سکھانی نہیں پڑتی . . .

۲۔ گالیوں کی سطح عالمی ہے۔ دنیا بھر کی جتنی زبانیں ہیں سب میں گالی دی جا سکتی ہے۔ اور دی بھی جاتی ہے۔

۳۔ گالیوں کی بہت قسمیں ہیں۔ یہ بھی آپ کو کسی لغت میں نہیں ملیں گی۔ یہ علم سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ غبی سے غبی شخص کو یہ حفظ ہو جاتی ہیں۔ گالیاں نازک، لطیف، نرم بھی ہوتی ہیں اور گالیاں وزنی اور موٹی بھی ہوتی ہیں۔

۴۔ بعض گالیاں بہت پُرلطف، شوخ اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ بعض گالیوں میں ترنّم اور رقص چھپا ہوتا ہے۔ بعض گالیوں میں شعلہ کی لپک ہوتی ہے۔ انھیں سن کر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

۵۔ پنجابی گالیاں سب گالیوں سے ممتاز ہیں۔ اس میدان میں جو تخلیقی سرگرمیاں پنجابیوں نے دکھائی ہیں اور اس میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ کون نہیں جانتا۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے مصنف پر ایک نظم کہی ہے۔ ایک بند پیش ہے:

مجھے خبر نہیں عالم ہے یا کہ عامل ہے — یہ نا خدا ہے یہ کشتی ہے یا یہ ساحل ہے
ہزار نقصوں کے ہونے ہوتے یہ کامل ہے — مزاح وطنز سے کیا چیز اس کو حاصل ہے
ہو کچھ بھی لوگ اسے رام لال کہتے ہیں

سر سوتی سرن کیف نے فارسی نظم میں اظہارِ خیال کیا ہے:

مطلع اور ایک شعر ملاحظہ فرمائیے :

یارب مرا عطا بکنی صد دو صد زباں — تا وصفِ رام لعل بخوبی کنم بیاں

محتاط بول سادہ خورش سادہ پوشش است — الّا برائے علم و ادب حانم ز ماں

مصنّف کی فکر، موضوعات کی تلاش اور ان کا ذکر خیر رخشِ خیال کی رد۔ اور مانوس و بے تکلف اسلوب سے لطف اندوز ہونے کے لیے پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ (ڈاکٹر سینئی برہمی)

سماج کا آپریشن

شاعر: دلکش بدایونی

پتا: دلکش بدایوں۔ محلّہ سرائے نو، بدایوں۔ یو پی

قیمت: دس روپے

دلکش بدایونی کا تیسرا مجموعہ کلام "سماج کا آپریشن" بنیادی طور پر طنز و مزاح کے رنگوں سے مزیّن ہے۔ ابتدا میں کچھ سماجی اور مذہبی شخصیتوں، شراب نوشی وغیرہ سے متعلق اشعار ملتے ہیں۔ حصّہ دوم میں زیادہ تر سرکاری محکموں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ حصّہ سوم میں کرپشن کے منبع اور مخرج کی تلاش کی گئی ہے اور اس سلسلے میں لیڈروں اور منتریوں کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے ؎

یہ منسٹر، یہ حاکمانِ قوم — خود کو کہتے ہیں خادمانِ قوم

خوب سکار حصول کرتے ہیں — روز ڈالی قبول کرتے ہیں

یہ کرپشن ہے ان کی پیداوار — اس کرپشن کے یہ ہیں ذمّہ دار

حصّہ چہارم میں مختلف مزاحیہ نظمیں ہیں۔ اس کے بعد کچھ قطعات ہیں اور آخر میں جدید نظمیں" کے عنوان سے ایک درجن سنجیدہ نظمیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ایک سو چوالیس صفحے کے شعری مجموعے میں درجن میں سے تقریباً چالیس صفحات دیگر کاموں کے لیے مخصوص ہیں) شریکِ اشاعتِ شاعری کے یہ مختلف النوع نمونے شاعر کے مزاج اور آہنگ سے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں قائم کرنے دیتے۔ طنز و مزاح کو ان کے کلام کی بنیاد بھی میں نے صرف اس لیے قرار دیا ہے کہ بیشتر نظر کتاب کے بیشتر صفحات پر اسی نوعیت کا کلام موجود ہے۔

جہاں تک دلکش بدایونی کے کلام کا تعلق ہے، اس میں دلکشی بھی ہے اور وقتی طور پر دلوں کو مسحور کر لینے کی صلاحیت بھی۔ ایسا لگتا ہے کہ سماج کے مختلف طبقوں کا مطالعہ بھی انھوں نے انہماک کے ساتھ کیا ہے لیکن اعلا قسم کی ظریفانہ شاعری سے سماج اور قوم پر جو دور رس اثرات مرتب کیے جا سکتے ہیں، وہ دلکش بدایوں کے بس میں نہیں چوں کہ ابھی نہ تو ان کا شعور بالیدہ ہوا ہے نہ اندازِ بیان میں پختگی آئی ہے۔ اصل میں اکبر الہ آبادی مرحوم ظریفانہ شاعری کو جس مقام پر چھوڑ گئے تھے اس سے آگے اسے کوئی نہ لے جا سکا۔ تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں پاکستان میں کثرت سے اور اور ہندستان میں خال خال ایسے شاعر پیدا ہوئے جو اکبر کے مقام تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے اور بعض اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے لیکن مشاعروں کی بھرمار اور اس میں مزاحیہ شاعروں

کی مقبولیت نے اردو کی ظریفانہ شاعری کا رنگ زیادہ نکھرنے نہ دیا۔ آج اس طرح کی شاعری کی مقدار خواہ جو بھی ہو اس کا معیار کسی طرح تسلی بخش نہیں۔ اور مزاحیہ شاعروں کی ایک پوری نسل سماج کے نشیب و فراز کو عام انداز میں نمایاں کر کے وقتی دلچسپی اور تفریح کا سامان فراہم کر رہی ہے۔ دلکش بدایونی بھی اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی بعض انفرادی خصوصیات کے باوجود موضوع اور بیان کے ایک محدود دائرے میں چکر کاٹتے ہیں۔

دلکش بدایونی مشاعروں میں کامیاب ہوتے ہوں گے، اس کا مجھے یقین ہے۔ جو لوگ طنز و مزاح کی چاشنی سے اپنی زندگی کی تلخیوں کا وقتی طور پر مداوا کرنا چاہتے ہوں ان کو میں "سماج کا آپریشن" کے مطالعے کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔ لیکن جو لوگ ظریفانہ شاعری میں معیار کے متلاشی ہیں انھیں مجموعی طور پر دلکش بدایونی کے مجموعۂ کلام سے مایوسی ہوگی۔ چند اشعار یقیناً دل کو چھو لیتے ہیں مثلاً

کورٹ میں افسران آتے ہیں — اہل کاران سر جھکاتے ہیں
کیس ہوتے ہیں کیس چلتے ہیں — اور فریقین ہاتھ ملتے ہیں
پیشیاں پڑتے پڑتے کیسوں میں — مدعی کیس بھول جاتے ہیں

یا — اک معلم کی سرگذشت لکھوں — اور اسے قابل بہشت لکھوں
اپنے پیشے میں ہوشیار بھی ہے — اس پہ ٹیوشن کا کاروبار بھی ہے

لیکن ایسے اشعار ان کی نظموں میں بس اسی طرح آتے ہیں جیسے تاریکی میں بجلی چمک جائے۔

میں دلکش بدآیونی کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ ان کی شاعری میں وہ چنگاریاں موجود ہیں جو شعلہ بن سکتی ہیں۔ پھر یہ کہ ان کی نیت بخیر ہے اور مطالعہ وسیع۔ مگر ابھی انھیں شاعری پر مزید خونِ جگر صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ (ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

گٹر بٹر گھٹالہ

شاعر: پاگل عادل آبادی
تقسیم کار: شگوفہ حیدرآباد
قیمت: پندرہ روپے

"الم غلم" اور "چوں چوں کا مربہ" کے بعد عوامی مقبولیت کے حامل مزاح نگار شاعر پاگل عادل آبادی کا یہ تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ پاگل مشاعروں کے توسط سے ہندستان گیر شہرت اور مقبولیت کے حقوق اپنے نام محفوظ کروا چکے ہیں۔

کتاب کا دلچسپ اور معنی خیز سرورق ہی علامت ہے اس بات کی کہ پاگل اپنے فن کے اظہار کے لیے مشاعرے کو ایک کامیاب اور موثر ترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کتاب کا انتساب انھوں نے حق بحق دار رسید کی مصداق اپنے پیر و مرشد شاہ محمد سلطان صاحب مخدومی قادری کے نام کیا ہے۔ پیر و مرشد نے بھی تبرکاً کتاب پر اپنے مشفقانہ تاثرات عنایت فرمادیے ہیں۔ پاگل نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی اپنی بات ہے اس لیے اسے داخل بحث کرنا لایعنی ہے۔ ہاں پیش لفظ میں

قطب سرشار ایم اے کی اس دلیل کی روشنی میں کہ۔
"ایک سنجیدہ شخص احمد شریف نے اپنے لیے پاگل تخلص چن کر گویا سماج کے ان تمام کرداروں کو آئینہ دکھایا ہے جو نہایت سنجیدگی کے ساتھ حماقتوں میں جذب ہو گئے ہیں"
دیکھیے اس آئینے میں ہمارے معاشرے کے کن کن کرداروں کے چوکھٹے کس کس روپ میں دکھائی دیتے ہیں ؂

ہر ایک چہرے پر چہرہ دکھائی دیتا ہے نظر جو آئے گدھا اس کو شیر نر سمجھو

پاگل نے روزمرہ کی عوامی بول چال کی زبان کو اپنے فن کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا جو بالآخر ان کی عوامی مقبولیت کا ایک نسخۂ کیمیا ثابت ہوئی۔ علاقائی بولی کے الفاظ مثلاً دعا رکاری، دھنتری، الال منڈی، دو ربطے ٹھبئی، تالو، موزہ، پھکٹ، ٹپانا، نکٹا، بھجانا، نیفا، بوم ٹپارہ، کھٹارا، جنوائی تھوبڑا، بومابوم، لوٹا مان، ڈزن، مرچی کی دعانس، ہولا، بھکا، ڈھٹبال، خالی پیلی، جھبو، پوٹے، کٹے، ستیل، گھڑسی، نبڈی وغیرہ نہایت بے تکلفی سے استعمال کیے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کے اپنی شاعری میں جابجا انگلش الفاظ استعمال کرنے کا مقصد انگریزی تہذیب کی تضحیک تھا۔ بعد میں تقریباً سبھی طنز و مزاح نگاروں نے اسے چلن کے طور پر اختیار کر لیا۔ پاگل کی شاعری میں بھی عام فہم انگلش الفاظ ایسے استعمال ہوتے ہیں کہ اردو ہی کا حصہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً مٹن، پاکٹ ملٹیر، پوز، سٹ اپ، کچن، کیو، پکچر، آئیڈیا، فائر بریگیڈ، ایڈوانس بکنگ۔ مدر، سیکنی کلز، اپوزیشن، ہائی پاور، ففٹی پرسنٹ، بلف، ایوارڈ، نالج، ڈینجر B.P وغیرہ طنز کی کاٹ کو تیز کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ گڑبڑ گھٹالہ کے مزاحیہ اشعار میں جابجا محاورہ بندی، زبان کے چٹخارے اور بیان کی برجستگی کی خوب صورت مثالیں ملتی ہیں۔

میں نے کالے کو کہہ دیا کالا وہ تو غصے سے لال ہے بھائی
غم ہائے روزگار نے نقشہ بدل دیا کل تک جو گل تھے آج وہ گلدان ہو گئے
سیر ہو نہیں سکتے، بیجو دی نہیں ملتی گر جناب مفتی کو مفت کی نہیں ملتی

پاگل مسائل کی تہوں میں اترنے سے کتراتے ہیں۔ اوپر ہی اوپر ڈبکیاں لگا کر کنارہ پکڑ لیتے ہیں۔ طائر فکر کو اونچا اڑنے نہیں دیتے زمین کے آس پاس ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جاتے ہیں اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ وہ عوامی شاعر ہیں اور ہر قیمت پر عوامی مقبولیت کے لڈو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے ہیں اس کے لیے انھیں فن کے مروّجہ اصولوں کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ قواعد و ضوابط کی گردنیں کیوں نہ توڑنا پڑیں۔ یہ ساری افراط و تفریط پاگل کی سہل پسندی کا نتیجہ ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ تین کتابوں کے مصنف کے کلام میں اکثر مصرعے ساقط الوزن اور خارج از بحر دکھائی دیں۔ جابجا شتر گربگی اور صحت الفاظ میں اسقام پائے جائیں۔ ثبوت کے لیے چند اشعار دیکھیے۔

دادا سے نکلے پوتے تلک شاعر اعظم اس واسطے ہیں لغتیں اس خاندان پر
نازک کمر پہ جن کی زمانہ فدا ہوا ہے کم سے کم پہ چار میٹر دیکھ رہا ہوں

اور یہ مصرعے دیکھیے... "ہنستے ہی ہوگئی ہے شروع بھونکنے کی جنگ" انھیں ایوارڈ دیجیے ان کی تلمیح ہے وسیع کتنی"

"ہر سودائے خلوص کے دھندے ہیں آج کل
میں پلٹن لے کے اپنی نکل جاتا ہوں تفریح کو"

اسی طرح صحتِ الفاظ سے لاپرواہی بھی ملتی ہے۔ مثلاً قبرا ور شہر کو قبَرا ور شہَر بروزن نظر اور نگر، اور نظم کو نظَم بروزن قسم۔ ہندی اور انگریزی الفاظ کے ساتھ اضافتیں مثلاً غمِ باوا، وغدِ لیڈر وغیرہ۔ واقعی گڑبڑ گھٹالا ہے جس کا اعتراف انتہائی سادگی اور خلوص کے ساتھ پاگل نے بھی کیا ہے۔

یہ مانا شاعری پاگل کی عین غین سہی
ملی ہے پبلسٹی اس کو مغنبر دیکھو

واقعہ یہ ہے کہ پاگل کو یہ مغنبر پبلسٹی ان کے خلوص اور سادگی ہی کی بدولت ملی ہے۔ گڑبڑ گھٹالہ میں ننانوے غزلیں (بہ شمول پانچ دکنی غزلیں) ایک حمد اور ایک نعت شامل ہے۔ اس ہوش ربا گرانی کے بے کیف دور میں ایسی چٹخارے دار تفریح کہ ہر شعر پر قہقہہ نہ سہی کم از کم ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور کھیلنے لگتی ہے۔ پندرہ روپے بھیج کر مصنف کے پتے اردو محل کالج کالونی عادل آباد (اے۔پی) یا ماہ نامہ شگوفہ حیدرآباد سے رجوع کیجیے (محبوب راہی)

بالکلیات

مصنف : یوسف ناظم
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
قیمت : اٹھارہ روپے

"اپنے اعزاز میں اپنے ملک سے باہر نگر نگر استقبالیے منعقد کروانے کا فن صرف چند لوگوں کو آتا ہے۔ ان لوگوں سے شخصی طور پر ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ ہے تو بس اتنی کہ یہ اپنے وطن واپس آجاتے ہیں۔"

"نقادوں کی فنونِ لطیفہ میں اس لیے گنجائش ہے کہ خود تنقید بھی ایک فنِ لطیفہ ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لطیفہ گوئی سے ملتا جلتا فن ہے، لیکن یہ غلط ہے کیونکہ لطیفہ گوئی ابھی مردم آزاری کی حد تک نہیں پہنچی ہے۔"

"محبوب و مقبول خواتین کے سراپا کے سلسلے میں جو تراکیب اور تشبیہیں شاعروں نے استعمال کی ہیں ان میں سب سے عمدہ تشبیہ صراحی دار گردن کی ہے۔ یہ شاعرانہ نہیں ایک حقیقت پسندانہ تشبیہ ہے۔ صراحی کا منہ کبھی بند نہیں ہوتا۔"

"کچھ شرفاء اپنی جیبوں سے ہولڈال کا کام لیتے ہیں۔ ان جیبوں میں گنجائش ہی گنجائش ہوتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ لوگ اپنی جیبوں میں پتلون لگواتے ہیں"۔

"معلوم نہیں تمھیں یہ کس نے لکھ دیا کہ یہاں لوگ اخبارات کی ردّی جلاکر کھانا پکاتے ہیں۔ میاں ہوش کی دوا کرو۔ اخبارات کی ردّی بھی کیا کوئی کلیات ہے جو یوں ضائع کی جائے۔"

مندرجہ بالا اقوالِ زریں یوسف ناظم کے ہیں جن کی "بالکلیات" ایسی جزئیات سے پٹی پڑی ہے اور 'بل' کے ساتھ 'کلیات' ہونے کے باوصف اخبار کی ردّی سے زیادہ قیمتی ہے۔

پیروی مغرب کی رو میں انگریزی SATIRE کی طرح اردو میں بھی طنز کے ساتھ مزاح کی آمیزش کا جو رجحان عام ہوا اس میں توازن کی کمی نے ایسے گل کھلائے کہ طنز و مزاح نگار بفائے دوام کے دربار میں بھانڈ بن کر رہ گئے اور ان کا کام محض اہل دربار کو ہنسانا رہ گیا اور نتیجۃً طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب سمجھا جانے لگا۔ مثال کے طور پر اکبر الہ آبادی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے بادشاہ ہیں لیکن آج تک کسی نقاد نے انھیں میرؔ غالبؔ تو کجا ذوق اور داغ کے درجے کا فنکار تسلیم نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں یہ بدنظمی طنز و مزاح میں ظرافت کی بڑھی ہوئی لے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے جو بقول شوکت سبزواری طنز کی دھار کو کند کر دیتی ہے۔ مقام شکر ہے کہ شاعروں میں رضا نقوی واہی اور نثر نگاروں میں یوسف ناظم کے ہاں طنز و مزاح آمیز ہو کر ایک دوسرے کے اثرات زائل نہیں کرتے بلکہ باہم تقویت حاصل کرتے ہیں۔

یوسف ناظم اپنی تحریروں میں طنز و مزاح کے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں ان کے ہاں کہیں لفظوں کی الٹ پھیر سے مزاحیہ فضا تشکیل پاتی ہے تو کہیں مضحک صورت حال کے بیان سے طنز کی کاٹ وجود میں آتی ہے۔ زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں سے ان کی گہری آشنائی ہے چنانچہ اس آہن کو موم کی طرح موڑ توڑ کر بڑی دلچسپ اور مضحکہ خیز مورتیں تیار کرتے ہیں جو اپنے معاشرے کے خام پہلوؤں اور کمزور گوشوں کی طرف صرف اشارے ہی نہیں کرتیں سماج کی دکھتی رگیں بھی ٹٹولتی ہیں البتہ یوسف ناظم طنز کے نشتروں سے بیمار سوسائٹی کا فاسد مادہ نکالنے کے بعد زخم پر مزاح کا کافوری مرہم بھی استعمال کرتے ہیں اس طرح ان کی تحریروں میں مقصدیت کے ساتھ ادبی لطافت بھی آمیز ہو جاتی ہے۔

'بالکلیات' میں پیش لفظ کے علاوہ (جو اپنی جگہ خود ایک مزاحیہ مضمون ہے) اکیس طنزیہ و مزاحیہ مضامین شامل ہیں جن میں سے چند (فیصلے، صراحی، لاٹھی، گوند، غذا نامہ وغیرہ) میں وزیر آغا والے انشائیہ کی صفات بھی پائی جاتی ہیں ویسے مجھے ان تحریروں میں بطور خاص " انتساب "، " فنون لطیفہ "، " مرغ و ماہی "، " کرکیٹ سیزن " اور " نتیجہ غالب شناسی کا " زیادہ پسند ہیں۔

یوسف ناظم کی اکثر تحریروں میں شاعروں کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے شاید اس لیے کہ یوسف ناظم خود بھی شاعر رہے ہیں اور اچھا طنز وہ مانا جاتا ہے جس کا وار اپنی ہی ذات پر ہو یا شاید اس لیے کہ یوسف ناظم کی شاعری سے نبھ نہیں سکی اور انھیں اس سے تائب ہونا پڑا۔ حقیقت جو بھی ہو انھیں بھولنا نہیں چاہیے طنز و مزاح کے حربوں سے لیس شاعری کے میدان میں ابھی کچھ لوگ باقی ہیں مثلاً رضا نقوی واہی!

یوسف ناظم اکثر احتجاج کرتے رہے ہیں کہ ادب میں طنز و مزاح کو ثانوی درجے کی چیز کیوں سمجھا جاتا ہے لیکن میں بھی طنز نگار ہوں اور یہ عرض کرکے پانچوں سواروں میں شامل ہونا چاہتا ہوں کہ معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے یوسف ناظم ہندستان میں فکر تونسوی کے بعد دوسرے اہم ترین طنز و مزاح نگار ہیں

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

انشائیے
سفرنامے
مکاتیب وغیرہ

افاداتِ آزاد

مولفہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری
ناشر: ادارہ تصنیف وتحقیق پاکستان ۸،۶۸ ا کراچی ۳۴
قیمت ۲۵ روپے

ہندو پاک میں مولانا آزاد کے مکاتیب وملفوظات کے کم وبیش دس مجموعے مختلف ناموں سے شائع ہوئے ہیں۔ پاکستان سے شائع ہونے والی زیرِ تبصرہ کتاب " افاداتِ آزاد" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ دراصل اس کتاب کے اکثر وبیشتر مندرجات ہند میں شائع شدہ " ملفوظاتِ آزاد" اور " مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط وجواباتِ آزاد" نامی دو مجموعوں پر مشتمل ہیں یہ مذہبی احکام ومسائل اور زبان وادب سے متعلق مختلف سوالات کے جوابات پر مبنی مجموعے ہیں جن کو مولانا اپنے پرائیوٹ سکریٹری محمد اجمل خاں مرحوم (۱۸۹۷ء – ۱۹۶۹ء) کو زبانی تیار دیتے یا لکھوا دیتے تھے اجمل خاں کے پاس یہ یادداشتیں محفوظ تھیں جن سے یہ مجموعے تیار ہوئے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے مذکورہ دونوں مجموعوں کو " افاداتِ آزاد" کے نام سے نئے انداز اور نئی ترتیب دے کر پاکستان سے شائع کیا ہے۔ ان ملفوظات وجوابات کو مزید درجہ پر لانے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ممکن حد تک انھیں اصل سے ملانے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں۔

> "یہ دونوں مجموعے محمد اجمل خاں صاحب نے مرتب کیے تھے اور چوں کہ ہندستان سے شائع ہوئے تھے اس لیے پاکستان کے بیشتر اہلِ علم وذوق کو ان کی اشاعت کی خبر تک نہ ہو سکی۔ ضرورت تھی کہ مولانا کے ملفوظات وجوابات پاکستان میں بھی شائع کیے جائیں۔ لیکن سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ دینی وادبی ملفوظات وجوابات کی تلاش میں سعی کی جائے اور موضوع سے متعلق تمام چیزیں اس میں شامل کرلی جائیں تاکہ مجموعہ زیادہ سے زیادہ مفید اور جامع ہو سکے چنانچہ یہ اہتمام کیا گیا کہ ملفوظات وجوابات میں جن مستفسرین کے پتے موجود تھے، انھیں خطوط لکھے گئے اور ان سے مولانا کے اصل خطوط یا ان کی صحیح نقلیں مہیا کرنے کے لیے گزارش کی گئی... جن حضرات کے نام مولانا کے اصل جوابات یا ان کی صحیح نقلیں فراہم ہوگئیں ان کی تصحیح فراہم شدہ جوابات کے مطابق کردی گئی اور جن حضرات کے نام مولانا کے جواب دست یاب نہیں ہوتے ان کی تصحیح میں خان محمد اجمل خاں کی یادداشتوں پر اعتماد کرنا پڑا اور اس میں حد درجہ احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔

مولانا کے پرائیوٹ سکریٹری۔ جو مولانا کے تعلق سے نامعلوم کتنی کہی اور ان کہی روایات کے امین رہے ہیں۔ محمد اجمل خاں مرحوم کا ایک مقدمہ بھی کتاب کے شروع میں ہے جس سے اس مجموعہ کی اہمیت وافادیت دوچند ہو جاتی ہے۔ یہ مقدمہ مولانا آزاد کے ساتھ خاں صاحب کی رفاقت کے تذکرہ اور اس مجموعے کے تعارف پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں "حرفِ ناگزیر" اور "دیباچہ" کے نام سے مرتب کتاب ڈاکٹر شاہ جہاں پوری کے دو مقدمے بھی شامل ہیں

جن میں مولانا کے مکتوبات و ملفوظات کے دوسرے مجموعوں کا تعارف کراتے ہوئے اس مجموعہ کی خصوصیات بتائی ہیں اور اس کی اشاعت میں پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر کیا ہے۔

یہ مجموعہ دینی و ادبی اول و دوم دو حصّوں پر مشتمل ہے، اس میں اجمل خاں مرحوم کے مرتب کردہ مذکورہ دونوں مجموعوں کے برعکس مستفسرین کے خطوط شامل نہیں کیے گئے ہیں بلکہ مولانا کے ہر جواب سے قبل متعلقہ استفسارانہ خط کا خلاصہ دے دیا گیا ہے، مکاتیب مختلف عنوانوں کے تحت ترتیب دیے گئے ہیں، اس طرح ایک موضوع سے متعلق متعدد مکاتیب یکجا ہو گئے ہیں۔ جوابات کا انداز عالمانہ شان لیے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے "دیباچہ" میں تذکرہ کیا ہے کہ مجموعہ کے دینی و ادبی دونوں حصّوں کے شروع کی جگہ آخر میں پوری کتاب کا اشاریہ دیا گیا ہے۔ لیکن اس زیر تبصرہ کتاب میں اشاریہ موجود نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس مجموعے کے دوسرے اڈیشن کی اشاعت کے وقت اس خامی کے ازالہ کے ساتھ ساتھ کتابت اور بائنڈنگ کی ان غلطیوں کے ازالہ کی طرف پوری توجہ فرمائیں گے جو اس کتاب میں چاند کے دھبّوں کی طرح نمایاں ہیں۔ ان چند معمولی فروگذاشتوں سے قطع نظر زیر تبصرہ مجموعہ ظاہری و باطنی تمام خوبیوں سے آراستہ ہونے کی وجہ سے ہر حال میں اس بات کا مستحق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے اور اسے لائبریریوں میں افادۂ عام کے لیے رکھا جائے۔ (مشیر الحق)

خوش نفساں

مصنف: ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ
ناشر: ادارہ شعر و حکمت ۸۶۵-۶-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴
قیمت: پندرہ روپے

"خوش نفساں" ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کے تحریر کردہ بارہ خاکوں کا مجموعہ ہے جن کی اہمیت ادبی سے زیادہ سوانحی اور تاریخی ہے۔ شاید اسی لیے جناب عابد علی خاں مدیر روزنامہ "سیاست" نے "حرف آغاز" کے تحت انھیں سوانحی مضامین قرار دیا ہے اور ان کی سوانحی اور تاریخی اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ ان خاکوں کی دوسری انفرادیت یہ ہے کہ ان میں بالعموم ایسی شخصیتوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو اردو زبان و ادب سے براہ راست دلچسپی نہیں رکھتیں گویا بقول پروفیسر گیان چند جین:

> "اس بزم عمائد میں اعلا عہدیدار، انجینیر، کلکٹر، جج، سائنٹسٹ، مصور، پروفیسر وائس چانسلر وغیرہ سب ہی ہیں لیکن ایک بھی ایسا نہیں جو محض اردو کی روٹی کھاتا ہو۔"

کسی بھی سماج میں ایسے لوگ خاصی اہمیت رکھتے ہیں جو غیر ادبی پیشوں اور مصروفیتوں کے باوجود علم و ادب کی خدمت کا ذوق رکھتے ہوں اور اس کے لیے وقت بھی نکالتے ہوں۔ اس کتاب میں زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر سید ہاشم علی اختر سائنس کے طالب علم رہے ہیں اور طالب علمی کی زندگی گذارنے کے بعد وہ پہلے لکچرر پھر آئی اے ایس افسر اور آخر کار وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے ہیں۔ اس دوران مختلف سائنسی اور سماجی مسائل کے علاوہ اردو

زبان وادب سے بھی ان کی دلچسپی برابر قائم رہی ہے۔ ایسی رنگا رنگ شخصیت یقیناً اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کے آئینے میں ہم اس کے عہد، اس کے ماحول اور سماج کی بھی جھلکیاں دیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح جناب باقر امانت خانی بنیادی طور پر مصور ہیں مگر ان کی ذات میں اردو زبان وادب کے کتنے جلوے پوشیدہ ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ان حضرات کی خاکہ نگاری کے پس منظر میں ہم حیدرآباد کی سیاسی وسماجی اور ادبی زندگی کے نقوش بھی دیکھتے ہیں۔ پھر یہ کہ جن لوگوں پر یہ خاکے لکھے گئے ہیں، ان کے علاوہ بھی بعض شخصیتوں کے متعلق کچھ معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔ کچھ ایسی کتابوں رسالوں اور مقالوں کا بھی پتا چلتا ہے جو اپنی وسیع افادیت کے باوجود زیادہ معروف نہیں ہیں۔ حیدرآباد میں اردو زبان وادب سے متعلق کافی کام ہوا ہے اور مختلف جدید وقدیم علوم و زبان پر اردو میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے چند کا تذکرہ یہاں ضرور ملتا ہے مگر کاش کہ ان تصنیفات کی کوئی فرہنگ تیار ہو سکتی۔

بہر حال ڈاکٹر بیگ کے یہ خاکے دلچسپی اور معلومات کے اعتبار سے گراں قدر ہیں۔ چند معمولی لغزشوں کی طرف میں اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وہ بھی اس لیے کہ ڈاکٹر بیگ ایک محقق ہیں اور مرزا علی لطف "حیات اور کارنامے"، کے عنوان سے ایک اچھا تحقیقی مقالہ پیش کر چکے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض لوگوں کا سنِ پیدائش عیسوی میں درج ہے تو دوسرے لوگوں کے ہجری میں۔ جن خاکوں کی بنیاد سوانحی مواد پر ہو ان میں یہ کمی کھٹکتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جملوں کی ساخت میں بعض جگہ بے ترتیبی پیدا ہو گئی ہے مثلاً صفحہ ۱۰ سے شروع ہونے والا جملہ "ہاشم علی صاحب کا تقرر محکمہ کروڑ گیری ..." اس طرح ختم ہوتا ہے کہ "جیسے جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے"۔ یہ صورت الجھن کا سبب بنتی ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر بیگ کے ان خاکوں کی اہمیت وہی ہے جو جناب عابد علی خاں، ڈاکٹر غلام عمر خاں اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے کتاب کی ابتدا میں ہی بیان کی ہے۔ یعنی یہ خاکے حیدرآباد کے سیاسی سماجی اور ادبی ماحول کی دستاویز ہیں اور ان میں کسی شخصیت کے نفسیاتی یا اخلاقی تجزیے سے زیادہ سوانح کی پیش کش پر زور دیا گیا ہے۔ انداز بیان سادہ اور دلکش ہے۔

کتابت وطباعت اچھی اور سرورق عمدہ ہے۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

سلسلۂ روز وشب

مصنفہ: صالحہ عابد حسین
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت: ۶۵ روپے

خود نوشت کا فن خاصا دلچسپ ہے جس میں راوی کے قدم قدم پر بہک جانے، غیر دلچسپ ہو جانے یا حقائق کی پردہ پوشی سے اصل مقصد خبط ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے، اردو میں دلچسپ غیر دلچسپ اور روایتی انداز کی خود نوشتوں کی کمی نہیں۔

سلسلۂ روز وشب ان سب سے انحراف اور جدت کی تازہ مثال ہے۔ صالحہ عابد حسین اردو

کی کہنہ مشق، ممتاز ناول نگار، فسانہ گو، ناقد، اور محقق سے مرثیہ گو تک ہیں۔ انھوں نے مزاحیہ افسانے خاکے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ جملہ اصنافِ ادب پر اس قدرت کا اظہار انھوں نے "خودنوشت" میں کیا ہے۔ جدت یہ کی ہے کہ آپ بیتی یا داستانِ حیات کے لیے ناول کی تکنیک اختیار کی ہے جس کا وسیع کنوس ان کی پرمسرت اور کرب انگیز زندگی کے وسیع افق تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے گھرانے، خاندان احباب، شعروادب جس میں سماجی، ثقافتی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی دائروں سے ابھرتی ہوتی زندگی کی خاموشی، ہلچل، ہنگاموں، حادثوں، خوشیوں اور محرومیوں کے گھرے بادلوں میں سے ان کی زندگی کا چاند بار بار ابھر کر چمکتا اور گھٹاؤں میں چھپتا رہتا ہے۔

"سلسلہ روز وشب ان کی ذات کے گرد گھومتا ہے۔ کردار جنم لیتے ہیں، ابھرتے اور تاروں کی طرح ٹوٹتے اور زمین سے ابھرنے والے آسمان میں غائب ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کردار بڑے جانے پہچانے عالمی اور قومی شہرت کے حامل کردار ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی کی پرنواسی صالحہ عابد حسین غلام الثقلین، خواجہ غلام السیدین، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر عابد حسین، صغرا مہدی، ڈاکٹر ذاکر حسین، بیگم انیس قدوائی، کرنل بشیر حسین زیدی، پروفیسر شِل، بیگم عبداللہ زیدی سسٹرز، صفیہ اختر، رضیہ سجاد ظہیر، صدیقہ قدوائی، قدسیہ زیدی، آصف مجیب، حمیدہ سلطان، شائستہ اکرام اللہ، مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، مہدی نواز جنگ جیسی مشہور، ممتاز اور عظیم ہستیوں سے قاری کی ملاقات ہوتی ہے۔ قاری گھریلو بے تکلف روپ میں وہاں انھیں دیکھتا ہے۔

روز وشب کا یہ سلسلہ ۱۹۱۳ء میں مصنفہ کی پیدائش سے پانی پت میں شروع ہوتا ہے، پھر علی گڑھ، داعی پور، میرٹھ، جرمنی یورپ اور امریکہ تک خاندانی زندگی کی ادبی اور مذہبی جھلکیاں، حالی کا گھرانہ، مصنفہ کی ڈاکٹر عابد حسین جیسے فاضل اجل عالم، ادیب اور معمارِ قوم سے شادی ہونا، اس رشتہ کا مصنفہ کی ادبی زندگی پر خوش گوار اثر، ادبی زندگی کی مسلسل جدوجہد، ناول اور افسانوں کی تخلیق اور ڈرامے، خاکے، ریڈیائی تقاریر، علمی ادبی تصانیف جن کی تعداد ۴۰ سے زائد ہوجاتی ہے۔ ناولوں کی مقبولیت، فنی ترقی، یادگار حالی، تصنیف کرنے کا کارنامہ اور شہرت پانا۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ ادبی اور سماجی سرگرمیاں اپنے گھرانے، شوہر، خاندان، سسرال سے بے نیاز خلوص و محبت سوتیا جاہ، خدمت۔ بیماریاں، تیمارداری، ایثار، قربانیاں، ہر عزیز پر اپنی ہستی مٹا دینا، اولاد کا صدمہ اور غم ایک ایسا مسلسل رزمیہ ہے جس نے ان کی زندگی کو " Epic " اور خود انھیں اس کی ہیروئن بنا دیا ہے۔ جس کے پاس بے پایاں خلوص اور حوصلہ ہے۔ اس خلوص نے سلسلۂ روز وشب کو فنی حیثیت سے بے حد بلند کر دیا ہے۔ اسی خلوص اور حوصلے نے دکھ اور سکھ کے ہر واقعہ میں جان ڈال دی ہے اور کتاب زندگی کے ہر کردار کو اس کے اصلی آب ورنگ میں پیش کر دیا ہے۔

خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین، پانی پت، سسرال، داعی پور، جامعہ، تخلیقات، بھائی بہن، خاندان، سہیلیوں اور صغرا مہدی کے مرقع لازوال ہیں، شادیوں، ثقافتی ہلچل، بیماریوں اور غمی کا جو پیا ثر البم، "سلسلہ روز وشب" میں نظر آتا ہے۔ اس میں ہنستی ہوئی زندگی سے بھرپور تصویریں بھی ہیں اور کرب ناک مناظر بھی ہیں۔

قاری کبھی ہنستا ہے، کبھی ان کی خوشیوں میں شریک ہو جاتا ہے تو کبھی ان کے ساتھ رو کر ان کا دکھ بانٹ لیتا ہے۔ شروع ہی سے ایک گہری اپنائیت اور ہمدردی کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے جو آخر تک چھایا رہتا ہے۔

"سلسلۂ روز و شب" کی راوی کی یہ دیانت داری ہے کہ وہ کامیابیوں کے ساتھ ناکامیوں کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ ان کا مذہب سے شغف، علم و ادب سے عشق، شوہر اور بیٹی سے بے پناہ محبت، ایک ایک کو بلک بلک کر اور ٹوٹ ٹوٹ کر یاد کرنا، ہر واقعہ کا ذکر قدر دانی کے ساتھ اپنوں اور "اغیار" کی سیاست ناقدری۔ اپنی خوبیوں کے ساتھ کمزوریوں کا بھی بڑی دلیری اور بے تکلفی سے محاسبہ "خود نوشت" کے فنی مرتبے میں اضافہ کرتا ہے۔

"سلسلۂ روز و شب" مصنفہ کی ۱۷ سالہ زندگی اور ۳۶ سالہ ادبی زندگی پر محیط ہے۔ حالات کے بیان، واقعات و اشخاص کی منظر کشی میں بلا کی آمد، سہاؤ، اثر و تاثیر نے "سلسلۂ روز و شب" کو ایک شاہکار "خود نوشت" کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ جو اپنے پڑھنے والوں کو ہمیشہ صالحہ عابد حسین سے متاثر کرتی رہے گی جو اردو کی ایک ممتاز ناول نگار اور عالمِ ادب ہیں جنھیں انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے اور قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ مگر عجب اتفاق ہے کہ آج سے ۳۲، ۳۳ سال پہلے صالحہ عابد حسین کی شہرت کا آغاز "یادگارِ حالی" سے ہوا تھا۔ اور ادبی و علمی حلقوں میں اس کی اور ان کی دھوم مچ گئی تھی۔ اور اب جب کہ ان کا فن اور شہرت اپنی بلندی پر ہے انھوں نے خود اپنی سوانح "سلسلۂ روز و شب" پیش کی ہے۔ یوں تو وہ ۱۹۲۵ء سے لکھ رہی ہیں مگر ان کی عظمت کی ابتدا اور انتہا کا مشترک نقطہ سوانح نگاری ہے اور نقطۂ عروج "سلسلۂ روز و شب"

(احمد جمال پاشا)

سفرِ زندگی کے لیے سوز و ساز

مصنفہ: صالحہ عابد حسین
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت: اٹھارہ روپے

۱۸ روپے کوئی خاص قیمت نہیں ہے۔ اب اس سے کم قیمت پر کوئی اچھی کتاب مل ہی نہیں سکتی۔ مکتبہ جامعہ دہلی کو اچھی کتابیں چھاپنے کا پرانا تجربہ اور دیرینہ سلیقہ ہے۔ اور صالحہ عابد حسین تو جیسے مکتبہ جامعہ سے چھپنے والی گلڈ کی رکن خاص ہیں بلکہ لائق ممبر۔ موصوفہ اس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جس میں علم و ادب کو غیر معمولی چیز نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے اوڑھنے بچھونے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

صالحہ عابد حسین اس سے پہلے کتنی ہی کتابیں لکھ چکی ہیں اور داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ لیکن زیرِ نظر کتاب خالص ان کی اپنی کتاب ہے کیوں کہ اس میں صرف ان کا حسنِ تحریر ہی نہیں ان کی داستانِ حیات کی روشنی بھی ہے۔ یہ ان کی سوانح حیات کا ایک حصہ ہے اور ایک لحاظ سے ایک ذی علم اور باوقار خاندان کی تاریخ بھی۔ سفرنامے تو اردو میں کئی ہیں لیکن اس نہج کی کتابیں کم۔ جہاں تک سفرناموں کا تعلق ہے جمیل الدین عالی کی ایک کتاب "تماشا میرے آگے" جو بڑے سائز کے کوئی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ ساری دنیا کی سیر کرا دیتی ہے لیکن صالحہ عابد حسین نے گھر

کی چہار دیواری میں ہی وہ تصویریں کھینچی ہیں کہ کہیں دل میں انبساط کی کلیاں کھلتی ہیں تو کہیں دل پر چوٹ سی پڑتی ہے۔ محمد حسن ہادی کا ایک خوب صورت شعر یاد آگیا۔

میرے بیتے ہوئے برسوں کے لمحے ہیں کہ جو مل کر
مجھے انجام ماہ و سال تک پہنچانے آتے ہیں

اس کتاب کی گھریلو فضا قاری کو اپنے اندر یوں چھپا لیتی ہے جیسے وہ اس کا ہی ایک حصہ ہو حالاں کہ کتاب میں جا بجا ایسے بڑے بڑے نام آتے ہیں کہ ادب مانع قربت ہوتا ہے۔ ذرا اس اپنائیت کو دیکھیے:

"یوں تو کشمیری حسینائیں ہر جگہ نظر آتی ہیں مگر یہاں (وادی لولاب) یہ حسن کچھ اور ہی بڑھا ہوا ہے۔ ایک بچی یہاں ایسی دیکھی جس کی موہنی صورت آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔ کوئی سات آٹھ برس کی بچی، میلا ساڈ ھیلا فرن پہنے۔ کانوں میں بالیوں کے گچھے لٹکائے اور ٹوپی میں چاندی یا گلٹ کے کشمیری چاند سورج اٹکائے ہماری کار کے پاس کھڑی ہو گئی اور بچے "پوسہ" "پوسہ" مانگ رہے تھے اور وہ خاموش کھڑی تھی۔ نہایت حسین، کھلتا ہوا گیہواں رنگ۔ سیاہ غزالی آنکھیں، آدھے چاند کا سماں تھا۔ کشمیری سیب کے سے سرخ بال اور گلاب کی پنکھڑی سے ہونٹ، کیا پیارا چہرہ تھا۔ کتنی معصومیت اور ساتھ ہی وقار تھا اس حسن میں اسے دیکھ کر بے اختیار یہ جی چاہا کہ اسے گود میں اٹھا کر موٹر میں بیٹھ جاؤں اور اسے اغوا کر لاؤں۔ کاش یہ میری بچی ہوتی۔ گدڑی کے اس لال کی آج تک یاد آتی ہے۔"

صالحہ عابد حسین کیا جانیں کہ اس بچی نے کیسی زندگی گزاری ہوگی۔ کشمیر تو وہ جگہ ہے جہاں لوگ یا تو تنہا ہنی مون منانے جاتے ہیں یا ایک ایسی بیوی کے ساتھ جسے واپس نہیں لاتے۔ بھوپال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "اگر بھوپال کے تال نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے ہیں تو اس کے محل ریاض منزل نے اس کی اہمیت اور احترام کو بڑھا دیا ہے جس میں میرے دو محترم بزرگ سر راس مسعود اور ڈاکٹر محمد اقبال رہے تھے اور جہاں میرے بھائی جان نے اپنے ان دو محترم دوستوں کی رفاقت کا لطف اٹھایا تھا۔" کتاب کے صفحہ ۱۷ اور ۱۸ پر ایلورا کے غاروں کا ذکر ہے اور یہاں انھوں نے وہ خوب صورت نثر لکھی ہے کہ میں جو وحید کی نظم ایلورا کا عاشق ہوں مخمصے میں پڑ جاتا ہوں کہ اپنے پروانۂ پسندیدگی کو ادھر بھیجوں یا ادھر۔

شخصی محبت حدود کی پابند نہیں ہوتی، مگر اپنے پیارے بھائی مہدی نواز جنگ کے بعد حیدر آباد ایسا لگتا ہے جیسے آگرہ بے تاج محل کے ہو جاتے۔ محبت کی اس فراوانی کو مبالغہ کہنا ہی مناسب نہیں ہے۔

حمیدہ سلطان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بھی سن لیجیے کہ مختصر ہے لیکن دلچسپ۔

"حمیدہ سلطان کو ایک شوق یہ تھا کہ وہ ہر ایک سے کہتیں "میں جانشین غالب ہوں اور یہ (صالحہ) جانشین حالی۔ کئی بار جب ایسا ہوا تو میں نے چڑ کر کہا۔

"وہ بھی تم غالب کی جانشین سہی کہ ان کے کوئی تھا ہی نہیں۔ مگر حالی کے جانشین خدا کے فضل سے بہت سے موجود ہیں۔ تم یہ مت کہو۔ لوگ بہت محظوظ ہوتے مگر بھولی حمیدہ مسکراتی رہیں"

اس سوانح حیات کے مختلف رنگ ہیں حسین یادوں کی دھوپ بھی ہے اور کہیں کہیں غموں کا سایہ بھی۔ عابد صاحب مرحوم کا جہاں بھی ذکر آیا ہے ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے کی بات پیدا ہوگئی ہے۔

عراق، کربلا، نجف اشرف اور کوفہ کے مقاماتِ مقدسہ کا ذکر نہایت ہی والہانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ خدام کے ذکر میں انداز ذکر و فکر میں وہی انداز ہے جو رشید احمد صدیقی کی اس تحریر میں ہے جو انھوں نے درگاہوں کی زیارت کے تعلق سے لکھی ہے صفحہ ۲۲ ضرور پڑھنا چاہیے۔ نثر میں اقتباسات دیے جائیں تو مشکل یہ ہوتی ہے کہ تبصرہ نگار کے لکھنے کے لیے جگہ نہیں بچتی۔ کرنا تو مجھے بھی یہی چاہیے تھا لیکن تبصرہ میں کچھ اپنا بھی تو ہونا چاہیے خواہ وہ اقتباس کے مقابلے میں کمزور ہی کیوں نہ ہو۔

کتاب حسبِ معمول اچھی چھپی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پروف ریڈنگ پر بھی کافی محنت کی گئی ہے اور یہ بات طے ہو چکی ہے کہ پروف ریڈر اور ریڈر کی اہمیت میں بس انیس بیس کا ہی فرق ہوتا ہے۔

صالحہ عابد حسین اپنی کاوش سے یقیناً مطمئن نہ ہوں گی کیوں کہ یہ کتاب کتابِ دل ہے اور ایک مطمئن اور آسودہ زندگی کا عکس ورنہ ویسے تو

تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو بارِ غم گسار کی بات

(یوسف ناظم)

غالب کے خطوط
(جلد اول)

مرتب : ڈاکٹر خلیق انجم۔
پتا : غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی
قیمت: پچھتر روپے

غالب نے کہا تھا:

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے، مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

لطف کی بات یہ ہے کہ مرنے کے بعد حسینوں کے خطوط غالب کے گھر سے برآمد نہیں ہوئے البتہ خود غالب کے خطوط کے مجموعے ہر صاحبِ ذوق کے گھر میں پائے جاتے ہیں۔

مکاتیب غالب کی ترتیب و اشاعت کا سلسلہ نامۂ اردو کی شکل میں ان کی زندگی میں ۱۸۶۵ء سے شروع ہو گیا تھا اور "عودِ ہندی" ۱۹۳۸ء میں غالب کی زندگی میں شائع ہوا اور اب تک بلا مبالغہ درجنوں مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان خطوط کے مرتبین میں مولانا حالی، امتیاز علی عرشی

مولوی مہیش پرشاد اور غلام رسول مہر کے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے باوجود ترتیب متن اور جدید تحقیقی اصولوں کی روشنی اور سائنٹفک انداز میں خطوطِ غالب کی ترتیب و تدوین کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر غالب انسٹی ٹیوٹ نے غالب کے خطوط کو چار جلدوں میں ترتیبِ نو کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کی پہلی جلد نہایت سلیقے اور اہتمام کے ساتھ منظرِ عام پر آگئی ہے

غالب کے خطوط کی ترتیبِ نو کا فریضہ ڈاکٹر خلیق انجم نے انجام دیا ہے۔ خلیق انجم کا نام اردو دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ کروڑی مل کالج میں اردو کے استاد اور گجرال کمیٹی میں ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر کام کرنے کے بعد پچھلے دس گیارہ برسوں سے وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان سے قبل اس عہدے پر علامہ شبلی نعمانی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار اور پروفیسر آل احمد سرور جیسے ممتاز اہلِ قلم فائز رہے ہیں۔ لیکن خلیق انجم نے ان سب کی بہ نسبت کم عمر میں یہ ذمہ داری قبول کی لیکن خدمات کی انجام دہی میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ گذشتہ تین دہائیوں میں خلیق انجم کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ غالبیات سے ان کی دلچسپی کا ثبوت ان کی تصانیف "غالب کی نادر تحریریں" اور "غالب اور شاہانِ تیموریہ" سے ملتا ہے۔ متنی تنقید Textual Criticism پر بھی ان کی ایک کتاب موجود ہے۔ ان دونوں خصوصیات اور مہارتوں سے غالب کے خطوط کی ترتیب میں خلیق انجم نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں غالباً پہلی بار غالب کے مختلف مکتوب الیہوں کے نام تمام خطوط تاریخ وار مرتب ہو گئے ہیں۔ ان چار جلدوں میں غالب کے تقریباً سو ایسے مکاتیب بھی شامل ہوں گے جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے تھے لیکن تاحال انھیں کسی مجموعے میں جگہ نہ مل سکی تھی خیال ہے کہ تاحال دست یاب مکاتیب غالب میں سے کوئی خط ان جلدوں سے باہر نہ رہے گا۔ غالب کے خطوط میں جن لوگوں، رسالوں، کتابوں اور مقاموں کا ذکر آیا ہے۔ فاضل مرتب نے ان پر مفید حواشی اور اشارے بھی تحریر کیے ہیں۔ کئی افراد کی کمیاب تصاویر کے عکس بھی مجموعے میں شامل ہیں اس طرح یہ کتاب یقیناً غالبیات کے سلسلے میں ایک قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ (ڈاکٹر مظفر حنفی)

پیرس و پارس

مصنفہ: ثریا حسین
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
قیمت: ۲۷ روپے

پروفیسر ثریا حسین کا یہ سفرنامہ دراصل ایک تلاش نامہ ہے۔ فرانس کا سفر انھوں نے گارسیں دتاسی پر تحقیق کے سلسلے میں کیا تھا۔ ایران وہ ایک عام ناظرہ کی حیثیت سے گئیں مگر یہ یاترائیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد بھی ہیں اور ممتاز بھی۔ وہ جہاں بھی گئیں۔ انھوں نے اس دلیس کی علمی اور ثقافتی زندگی کے آثار و اسرار سے اپنا سروکار رکھا۔ اس تجربے کے دوران وہ ایسی کیفیتوں سے بھی دوچار ہوئیں جو انسانی طبائع سے ایک طرح کے تخلیقی اور نیم فلسفیانہ تعلق کا پتا دیتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ آپ بیتی اور سفرنامہ لکھنے والے کے ظرف کا بہت روشن آئینہ ہوتا ہے۔ کم عیار آدمی ایسی ہر داستان کا ہیرو اپنی ذات کو سمجھتا ہے۔ ثریا حسین کے اس سفرنامے میں جو عنصر غالب ہے وہ گرد و پیش کی دنیا اور اس میں بسنے والے مناظر اور انسانوں کی شناخت و تفہیم کا ہے۔ ان کی اپنی ہستی بس ایک زیریں ارتعاش کی صورت اپنا احساس دلاتی ہے۔ اس سے ایک شائستہ تربیت یافتہ نظر اور گہری انسانی بصیرت کا خاکہ ابھرتا ہے۔

شخصیت کی طرح زبان و بیان بھی سادہ اور خلوص آمیز نہ کہیں مبالغہ، نہ کوئی آرائش۔ اسی لیے کئی مقامات پر ان کی تحریر کا تاثر بہت سچا اور دیرپا دکھائی دیتا ہے۔ کتابت کی دو ایک غلطیاں ایسی ہیں کہ عبارت متاثر ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ سفرنامہ ایسا ہے کہ ہر سنجیدہ پڑھنے والے تک پہنچنا چاہیے۔

(شمیم حنفی)

مکاتیب احسن

مرتبین: ڈاکٹر عنوان چشتی، صغیر احسنی
تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج دہلی۔
قیمت: ۲۵ روپے۔

مولانا احسن مارہروی کے احباب اور قدر دانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، اس کے علاوہ چونکہ ان کو زبان و محاورے پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اس لیے بڑی کثرت سے ان کے پاس ادبی استفسارات آتے تھے، جن کا وہ پابندی سے جواب دیا کرتے تھے، اس لیے ظاہر ہے انھوں نے بہت بڑی تعداد میں خطوط لکھے ہوں گے۔ اور ان خطوط میں زبان و بیان کی وہی شگفتگی ہو گی جو ان کی نثر اور ان کی شخصیت کی خصوصیت تھی علاوہ ازیں ان میں سے بیشتر زبان و ادب کے اہم مسائل پر مشتمل ہوں گے، اس لیے ان کی جمع و ترتیب اور اشاعت سے اردو ادب میں مزید اضافہ ہو گا۔ خوشی کی بات ہے کہ اردو کے مشہور شاعر اور متعدد کتابوں کے مصنف عنوان چشتی نے، احسن مارہروی کے عقیدت مند اور شاگرد، صغیر احسن جلال آبادی کے اشتراک میں ان کے خطوط کے دو مجموعے مرتب کر کے شائع کیے ہیں، زیر تبصرہ مجموعہ، دوسری جلد ہے جس میں کل ۸۵ خطوط ہیں اور مکتوب الیہم کی تعداد ۳۲ ہے، جن میں سید محی الدین قادری زور اور ساغر نظامی مرحومین قابل ذکر ہیں۔ سب سے زیادہ خط جناب متین مچھلی شہری کے نام ہیں، جن کی تعداد ۱۶ ہے۔ اس جلد کے ۸۵ خطوط میں سب سے قدیم خط ۴ ۲ر فروری ۱۹۲۰ء کا شیدا اٹاوی کے نام ہے۔ اور آخری خط ۲۸ر جولائی ۱۹۴۰ء کا عشرت جلالی کے نام ہے گویا وفات سے ایک ماہ تین روز پہلے لکھا گیا ہے۔ مولانا کا انتقال ۳۰ر اگست ۱۹۴۰ء میں ہوا ہے، ان خطوط میں جو سال وفات میں لکھے گئے ہیں ان کی تعداد ۱۰ ہے۔ گویا ان آٹھ مہینوں میں ان خطوط کا اوسط مہینے میں دو کا ہے، ظاہر ہے پہلی جلد میں ایسے خطوط ضرور ہوں گے جو ۱۹۴۰ء میں آخر اگست تک لکھے گئے ہوں گے اور ایسے بہت سے خطوط ہوں گے جو دست یاب نہ ہو سکیں گے یا ضائع ہوں گے۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے خط لکھنے کی رفتار کیا تھی۔ اس جلد کا آخری خط خاصا طویل ہے اور معائب سخن جیسے خشک موضوع پر ہے، مگر مولانا کی علالت کے باوجود اس خط سے بالکل اندازہ

نہیں ہوتا کہ مولانا خطرناک اور انتہائی تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہیں، چنانچہ یہ بیماری جان لے کر رخصت ہوئی۔

ان خطوط کے علاوہ اس مجموعے میں فاضل مرتب عنوان چشتی صاحب کے قلم سے دو صفحے کا "حرف آغاز"، مکتوب نگار کی سوانح حیات، ان کی شخصیت، ان کا ادبی نقطۂ نظر اور علمی و ادبی کارناموں کے عنوانات سے مختصر مگر پر از معلومات تحریریں اور مرحوم کے تلامذہ کی فہرست شامل ہیں۔ اس طرح اس مجموعے کی افادیت میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے بلاشبہ اردو کے مکاتیبی ادب میں قیمتی اضافہ ہوا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ برصغیر ہند و پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کا پرجوش خیر مقدم کیا جائے گا۔ (عبداللطیف اعظمی)

حیات عابد

مرتبہ : ڈاکٹر صغرا مہدی
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
قیمت : پینتالیس روپے

حیات عابد عابد صاحب کی آپ بیتی ہے۔ کچھ ان کی زبانی، کچھ ان کے اعزا اور احباب کی زبانی۔ عابد صاحب کی شخصیت کی طرح، ان کی آپ بیتی بھی اپنی سچائی اور سادگی کے سبب ہمیں متاثر کرتی ہے۔ عابد صاحب نے ایک خاصی بھری پری، بھانت بھانت کے تجربوں سے آباد اور امتیازات سے آراستہ زندگی گزاری۔ متوسط طبقے کے ایک عام فرد سے ہمارے تعلیمی، تہذیبی اور ادبی معاشرے کے ایک ممتاز دانشور کے منصب تک، یہ زندگی کس سادگی اور دھیمے پن اور وقار کے ساتھ پہنچی۔ یہ کہانی دلچسپ بھی ہے اور پُر پیچ بھی۔ مگر ساری پیچیدگی باطن کی دنیا کے مدوجزر کا پتا دیتی ہے۔ اسی طرح یہ دلچسپی کسی بیرونی وسیلے کے بغیر ایک بے ساختہ اور فطری انداز میں آپ ہی آپ اس کہانی کا حصہ بن گئی ہے۔ عابد صاحب حسب معمول سادہ اور متین اور بے نیاز دکھائی دیتے ہیں۔ افسوس کہ عمر کے ساتھ صحت کی خرابی اور سنجیدہ و سرگرم تہذیبی اور علمی مقاصد سے وابستگی میں اضافے نے عابد صاحب کو اتنی مہلت نہ دی کہ اپنی زندگی کی کہانی وہ پوری کر سکتے۔ مجھے اس محرومی کا احساس اس لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم نے عمر کے آخری سانس تک عابد صاحب کو مصروف اور اپنے مقاصد میں گم دیکھا۔ خود اپنی جانب سے وہ ہمیشہ بے پروا نظر آئے۔ نہ وہ اپنے کارناموں کا ذکر کرتے تھے، نہ اپنی زبان سے اپنے شخصی اوصاف کا۔ عابد صاحب کا اظہار ان کی شب و روز کی زندگی تھی۔ انتھک، ایثار شیوہ۔ اپنے حال سے مطمئن، بہت ستھری اور رچی ہوئی۔ یہی حال ان کی آپ بیتی کا ہے۔ اس کہانی کے واسطے سے عابد صاحب کی شخصیت کا حسن بلا کسی شعوری کوشش، بغیر کسی آرائش اور بناوٹ کے آپ سے آپ نکھرتا جاتا ہے اور اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ مجھے عابد صاحب کو دیکھ کر ہمیشہ ایک ایسے گھنے، چھتنار درخت یا خوشبو کی ایک ایسی لہر کا خیال آتا تھا جس سے دوسرے فیض اٹھاتے ہیں مگر جو خود اپنی فیض رسانی

کے شعور سے یکسر غافل ہوتی ہے۔ شاید اس لیے عابد صاحب اعزا، احباب، اہل علم کے مجمع میں بھی مجھے ہمیشہ تنہا سے محسوس ہوتے تھے۔ شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق۔

ڈاکٹر صغرا مہدی نے جس توجہ، محنت اور خوش ترتیبی کے ساتھ یہ کہانی مکمل کی ہے اس کی داد دینی چاہیے۔ مجھے تو ایک طرح کی شکرگزاری کا احساس ہوا کہ ان کی برسوں کی جدوجہد کے نتیجے میں وہ کہانی سامنے آئی جسے میں نے سنا ہی نہیں، جاگتی آنکھوں سے دیکھا بھی تھا اور جو مجھے اس عالم کم عیار میں کئی حیثیتوں سے بہت قیمتی نظر آتی تھی۔ عابد صاحب کے آخری دنوں کا حال مرتبہ نے بہت موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ پیرایہ مجھے عابد صاحب کی اپنی شخصیت اور ان کی آپ بیتی کے پیرائے سے مطابقت نیز ہم آہنگی کے سبب بھی متاثر کرتا ہے۔

اس آپ بیتی کے ذریعے بہت سی تصویریں سامنے آئیں ہماری قومی اور تہذیبی زندگی کا ایک پورا دور، بہت سے بڑے نام اور کام۔ عابد صاحب کی زندگی کہانیوں کے ایک پورے سلسلے کو ایک مالا میں پرو دیتی ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہونے دیتی کہ اس عمل کا مقصد کسی بھی بہانے اپنے آپ کو سجانا یا مرعوب کن بنانا ہے۔ فراق صاحب کہا کرتے تھے کہ ہلکی شخصیت رکھنے والا سب کچھ لکھ سکتا ہے۔ سوائے اچھی آپ بیتی یا سفرنامے کے۔ سب سے آسان اور سب سے مشکل کام اپنے بارے میں باتیں کرنا ہے۔ ایک ذرا سی چوک سنجیدہ سے سنجیدہ شخص کو بھی مضحک اور معمولی بنا دیتی ہے۔

مجھے اس کتاب میں عابد صاحب کی اپنی تحریر کے ساتھ جو تحریر سب سے زیادہ پرکشش محسوس ہوتی وہ عابد صاحب کے والد ماجد کی ہے۔ وہ بزرگ نہ تو اصطلاحی معنوں میں ادیب تھے نہ انشا پرداز۔ مگر عابد صاحب کے بچپن سے لے کر خاصی پختہ عمر تک کے خیالات انھوں نے ذاتی یادداشت کے طور پر جس ہمدردی کے ساتھ قلم بند کیے تھے اسے دیکھ کر یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اسے اور مفصل ہونا چاہیے تھا۔

بہرنوع، یہ ایک مفید، معیاری اور معنی خیز دستاویز ہے جس کی اشاعت کے لیے مکتبہ جامعہ اور اس کتاب کی مرتبہ دونوں کو مبارکباد۔

(شمیم حنفی)

مذہبیات

حدیثی اصول

مصنف : وجیہہ الدین احمد خاں
پتا : مکتبہ وزیریہ، رام پور
قیمت : چار روپے

نعمتِ اسلام انسان تک دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے وحیِ الٰہی اور انبیاء کرام جنہیں خدا تعالیٰ نے عملی قیادت رہنمائی اور تربیت دینے کے فرائض پر مامور کیا تاکہ انسان کلامِ الٰہی کا صحیح منشا سمجھے نفس کا تزکیہ کرے اور نظام حیات کی تعمیر صالح کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دے۔ انبیاء کی سیرت نبی آخر الزماں کے سمجھے بغیر دین کا فہم حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ کلامِ الٰہی کی روح تک پہنچا جا سکتا ہے۔ احادیثِ مقدسہ کی شکل میں ہمارے پاس ایسا سرمایہ محفوظ ہے جس کی مدد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ کے بارے میں صحیح واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے سامنے ایک ایسی ہستی کامل کے اوراق حیات پوری جزئیات سیاق و سباق کے ساتھ آ جاتے ہیں جو پیغامِ الٰہی کا چلتا پھرتا مرقع تھی۔

مدحت رسول میں فارسی کا مصرع "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" ضرب المثل ہے۔ اسی سے ملتے جلتے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ قرآن کریم کے بعد دین کی اساس احادیث رسول ہیں۔ احادیث کی جمع و تدوین عظیم الشان ملی کارنامہ ہے جس کی مثال کسی بھی مذہب کے ماننے والے نہیں دے سکتے۔ دین سے بے رغبتی کے موجودہ زمانہ میں وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ احادیث رسولؐ کی تعلیم کو عام کیا جائے جس کے عام فہم انداز میں پیش کیے گئے جواہرات رسالت نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوں گے۔

علمِ حدیث ایک بحرِ ذخّار ہے اس میں تکمیل کا دعوا کسی زبان سے نہ نکلا کیوں کہ تمام عمر اس میں لگا دینے کے بعد بھی تشنگی کا احساس رہتا ہے۔ فہم حدیث کے لیے ضروری ہے کہ روایت و درایت کے موٹے موٹے اصول قاری کے گوش گزار ہوں۔ اصطلاحات حدیث سے واقفیت مطالعہ حدیث کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح علومِ حدیث کے سلسلے میں بنیادی باتیں ذہن نشین ہوں تو مطالعہ حدیث کی برکت سے زیادہ اچھی طرح فیض اٹھایا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اصطلاحات حدیث و علوم حدیث کسی ایک جلد میں مجتمع نہیں ہو سکتیں۔ برصغیر کے مشہور عالم دین خطیب اعظم مولانا مولوی وجیہہ الدین احمد خاں صاحب مدظلہٗ نے کمال کے ساتھ فن حدیث سے متعلق اصول قواعد۔ ضوابط و اصطلاحات پر مبنی ایک مختصر تصنیف "حدیثی اصول" مرتب فرمائی ہے جو طلبہ کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام عاشقان رسولؐ کے لیے نہایت آمد ہے۔

عربی زبان سے نا واقفیت کے اس دور میں ضروری تھا کہ علوم فقہ و علوم دین کو مروجہ زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ اردو بھارت۔ بنگلہ دیش۔ پاکستان اور برما کے مسلمانوں کی اکثریت کی زبان ہے۔ صدیوں سے تراجم قرآن کریم اور تفاسیر قرآن کریم اردو میں شائع ہو رہی تھیں۔ کتب احادیث کی اکثریت بھی اردو میں منتقل ہو چکی ہے ایسے حالات میں ایک ایسے رسالہ کی موجودگی جو سہل زبان میں بقدر ضرورت ناواقف اشخاص کو بھی فہم حدیث میں مدد دے۔ خطیب اعظم کی زیر تبصرہ

تصنیف نے سہل نگاری کا اعلاترین نمونہ پیش کیا ہے۔ مصنف کا زورِ تحریر، وسعتِ علم و فیضِ صحبت استادِ محترم محدثِ زمانہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کتاب کے ہر ہر جملہ سے مترشح ہے۔

خطیبِ اعظم گزشتہ ساٹھ سال سے درسِ حدیث میں مشغول ہیں اتنی طویل مدت تک "کلامِ نبوت" کے مطالعہ و درس کی سعادت برصغیر کی چند ہی شخصیات کے حصے میں آئی ہوگی۔ ایسی بابرکت ہستی کی ہمارے درمیان موجودگی ہماری عین خوش نصیبی ہے۔ آج کے دورِ انحطاط میں ایک ایسی ہستی کی موجودگی جو علومِ قرآنی پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ حدیث کا ماہر استاد بھی ہو ایک ایسی برکت ہے جس سے مستفیض نہ ہونا عین بدقسمتی ہوگی۔ مصنف نے رسالہ زیرِ تبصرہ تصنیف فرما کر ایک ایسا ملی فرض ادا کیا ہے جو صدقۂ جاریہ بن کر خود موصوف کے لیے باعثِ اجر ہوگا اور اس کے مطالعے سے نہ معلوم کتنے پیاسے سکون پا سکیں گے۔ خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ الٰہ آباد کے عربی و فارسی بورڈ نے اس کتاب کو اپنے امتحان "عالم" میں شریکِ کورس رکھا ہے

"چار روپے کی کم قیمت میں "مکتبہ وزیریہ۔ انگوری باغ۔ رام پور ۹۰۱ ۲۴۴ سے طلب کی جا سکتی ہے۔ ٹائٹل سادہ اور خوب صورت، معیارِ کتابت و طباعت گرانی کے اس دور میں غنیمت ہے۔

(سید آفتاب علی)

علمِ حدیث اور چند اہم محدثین

مصنف: سالم قدوائی
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
قیمت: ۱۵ روپے

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی سے اہلِ علم کم از کم ۱۵ سال سے ضرور واقف ہیں۔ ان کے مضامین جب بھی نظر سے گذرے تو یہی محسوس ہوا کہ وہ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک پیشِ نظر تصنیف میں بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ حدیث میں ذاتی علم و فکر کو دخل نہیں کہ کسی قسم کی کمی یا زیادتی کی جا سکے لیکن علمِ حدیث، اس کے مبادیات و مصطلحات اور مآخذ سے اس وقت تک واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ اس کی رہبری نہ کی جائے۔ علومِ دینیہ کے مدارس میں تو اس کی تمام سہولتیں ہیں لیکن ایسے تعلیمی ادارے جو دینی تو نہیں مگر دینیات کی تعلیم کا وہاں لحاظ رکھا گیا ہے، ان تعلیم گاہوں میں مدرسین کے رحم و کرم پر علومِ دینیہ سے واقفیت کا دارو مدار ہے لیکن یہ تمام باتیں زبانی ہی ہوتی ہیں یا ان طلبہ کو جو نوٹ لکھا دیا جائے بس اسی پر اکتفا ہوتی ہے۔ اس لیے کہ عموماً ان موضوعات پر اردو میں اچھی کتابیں نہیں ہیں یا اگر ہیں بھی تو ایسی ثقیل اور غیر مروجہ زبان میں ہوتی ہیں جن کا سمجھنا غیر مدارسی طلبہ کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی کی تصنیف "علمِ حدیث اور چند اہم محدثین" نئے دور کے طلبہ کے لیے پُر کشش تحفہ ہے جس کی بامعیار سہل بیانی اور سلیس زبان طالبانِ علومِ جدیدہ کی گم گشتہ راہی میں ہدایت کا کام دے گی۔ یوں تو علمِ حدیث کا دامن بہت وسیع ہے اور یہ کتاب بہت مختصر ہے لیکن اس کا اختصار ہی مفید اور کارگر ہے ورنہ طوالت زدہ کتابوں کی کمی نہیں اور ان کی طوالت

تعقل نے ہی دورِ جدید کے مسلم طلبہ کو ان سے دور رکھا۔

کتاب کا پہلا عنوان "تاریخ تدوینِ حدیث" ۴۲ صفحات میں منضبط ہے۔ اس سے کم کی گنجائش بھی نہ تھی۔ البتہ حدیث کی اہم اور مشہور کتابیں صرف ۶ عدد متعین کی ہیں اور انھیں کتابوں تک اپنے موضوع کو محدود رکھا ہے۔ جب کہ اصول کافی اور الاستبصار جیسی اہم کتب احادیث کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔ اگر ان دونوں کتابوں کو بھی شامل کر لیا جاتا تو افادیت میں عمومیت پیدا ہو جاتی۔

"اصولِ حدیث کا باب مختصر ہے۔ یہ اختصار جامع نہ سہی لیکن مانع ضرور ہے۔ ایسے طلبہ یا وہ حضرات جنھیں پہلے پہل اپنے پیغمبر اکرمؐ کے اقوال سے شغف پیدا ہوا ہو، ان کے لیے اصولِ حدیث کی معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ اختصار ہی مفید ہے۔

تیسرا باب اصطلاحاتِ حدیث" سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ موضوع نہایت اہم ہے۔ مصنف نے نہایت احتیاط سے بہت سہل انداز میں اصطلاحوں کی تعریف و توضیح کی ہے۔ جن کی واقفیت کے بغیر علم حدیث کا حصول بغیر وضو کے نماز جیسا ہے۔

ان تین ابواب کے بعد ائمہ اربعہ کا تذکرہ ہے اس کے بعد صحاحِ ستہ کے مؤلفین سے روشناس کرایا ہے اگر صدرِ اسلام سے امام ابو حنیفہؒ تک کی کڑی بھی ملا دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا اور کتاب کی افادیت عامۃ المسلمین کے لیے ہوتی۔

کتاب طباعت کے اعتبار سے بہت بہتر ہے۔ قیمت مناسب ہے۔ لیکن تعداد میں زیادہ چھپتی تو مزید قیمت میں کمی ہوتی، جس سے یہ فائدہ ہوتا کہ عام قارئین بھی اس سے مستفیض ہو سکتے۔

(ناصر زیدی)

مقدمۃ القرآن یعنی تفسیری اصول

مولف: وجیہ الدین احمد خاں قادری
ملنے کا پتا: مکتبہ وزیریہ محلہ انگوری باغ رام پور (اتر پردیش)
قیمت: چار روپے

علم و سائنس کی ترقی نے اگر ایک طرف انسان کو مادی زندگی گزارنے کے لیے آرام و آسائش کے سامان فراہم کیے ہیں تو دوسری طرف اس کو مختلف نظریات اور عقائد میں الجھا کر روحانی طور پر مفلوج بنا دیا ہے۔ نتیجتاً اس نے مذہبی کتابوں کی آیات اور سلف صالحین کے اقوال کو اپنے نظریات کے سانچے میں ڈھالنے کی ناکام کوششیں شروع کر دیں اور مختلف ایسی تفسیریں لکھی جانے لگیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایسے پُرآشوب دور میں بھی کچھ خدا رسیدہ اپنے وعظ اور تلقین اور تالیف و تصنیف سے ملت کی رہنمائی کرتے رہے۔ خطیب اعظم مولانا وجیہ الدین احمد خاں قادری رام پوری کا نام گرامی بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ موصوف مسلسل پچاس ساٹھ سال سے اپنے درس و تدریس اور وعظ و تلقین سے دینِ اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔ کچھ مخلصین احباب کے اصرار پر آپ نے تالیف و تصنیف کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کتاب کے ابتدا میں مولانا عبد الشاہد خاں شیروانی علی گڑھی کا تحریر کردہ بیش لفظ ہے جس میں

اردو تفاسیر اور قرآنی علوم سے متعلق اردو کتب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جو نہایت مفید اور اہم ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ کتاب میں تفسیر کے اصول اور قواعد بیان کیے گئے ہیں جن کا خاص مقصد یہ ہے کہ عوام مختلف نظریات کے تحت لکھی جانے والی تفسیروں کے پڑھنے سے گمراہ نہ ہوں۔ حفظِ قرآن کے عنوان سے ایک باب قائم کرکے مؤلف نے حفظ قرآن کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے جو آج کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ "غلو اور میانہ روی" سے معنون باب کے تحت مؤلف نے اپنے اعتدال پسند نظریات کا ذکر کیا ہے۔ کتاب کا اندازِ بیان خطیبانہ ہے لیکن قاری کہیں بھی الجھن محسوس نہیں کرتا۔ یہ کتاب اہلِ علم اور طلبہ کے لیے تو خصوصیت سے مفید ہے۔ لیکن مؤلف نے اس بات کا بھی خاص طور سے خیال رکھا ہے کہ عام لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ ہمیں کتاب کا نام مقدمۃ القرآن کچھ مناسب معلوم نہیں ہوا کیوں کہ قرآن کا مقدمہ لکھنا انسانی طاقت سے باہر کی چیز ہے۔ صرف "تفسیری اصول" ہی کافی ہے یا "مقدمہ تفسیر القرآن" ہونا چاہیے جس کے تحت موصوف کو حسبِ وعدہ قرآن کی تفسیر لکھنے کی طرف فوری توجہ دینا چاہیے تاکہ مقدمہ اور کتاب دونوں یکجائی طور پر طبع ہو سکیں۔ کاغذ کی گرانی اور مضامین کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے کتاب کی قیمت چار روپے بہت ہی کم ہے۔ اہلِ علم اور طلبہ اور عام مسلمانوں کو اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ (عبدالہادی خاں کاوش)

"گگن میگزین" کا "مذاہبِ عالم نمبر"

مدیر: شمس کنول
پتا: ماہنامہ "گگن"۔ بمبئی
قیمت:

بہارہا، بنفشہ ہا، شقیقہ ہا، شگوفہ ہا!

کیا آپ جانتے ہیں کہ یہودی سال میں ایک ہی بار سجدہ ریز ہوتے ہیں! گیتا گووند اکن گنیوں کو کہتے ہیں؟ سالوشن آرمی کیا ہے؟ نبی اور ولی میں کیا فرق ہے؟ ہندستان کی پہلی مسجد کس ہندو راجا نے بنوائی تھی اور جو قبلہ نما بھی نہیں ہے! برٹر ینڈ رسل جیسا سرمایہ دار کن اسباب سے مذہب سے برگشتہ ہوا؟ زبانوں کی ابتدا کیوں کر ہوئی؟ اسلام کے بہتر فرقے کون کون سے ہیں؟ رادھا کس کی بیوی تھی؟ بارہ امام اور چار پیر چودہ خانوادے کون سے ہیں؟ لامہ باڑی تھارو، ڈانگی، کنجر اور گوجر میزد کہاں کے قبیلے ہیں اور ان کی معاشرت کیا ہے؟ دروزی، نصیری، چارواک اور ست نیتھی کن فرقوں کو کہا جاتا ہے؟ یوم سبت کسے کہتے ہیں؟ عید فسح کیا ہے؟ کمبھ کے میلے کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ جنت اور دوزخ کے کتنے طبقے ہیں؟ اعلان بل فور کیا تھا؟ بیوٹریشن کنھیں کہتے ہیں؟ اسلام سے پہلے کے مسلمان کون تھے؟ رومن کیتھولک "سکارنیوال" پارسی "پٹیٹی" اور سکھ "بیساکھی" کیوں اور کیسے مناتے ہیں؟ "علم نکاح" اور "گاندھی" کیوں کامیاب ہوئیں؟ لارنس آف عربیہ کون تھا؟ اور دنیا کے بے روح انسان اور ڈاکٹر ابراہیم کوور کے چیلنج کو عہدِ حاضر کے بھگوان اور روحانیت کے حامل افراد کیوں نہ توڑ سکے!؟

غافلوں کے لیے صور اور عاقلوں کے لیے جلوۂ طور

دراصل مذکورہ بالا اشارے تو گگن کے "مذاہب عالم نمبر" کے ۱/۴ (ہیبوبیں حصے) کا احاطہ بھی نہیں کرتے، البتہ اس عدیم المثال خاص نمبر کی چند جھلکیاں ضرور پیش کرتے ہیں۔ "گگن میگزین" اردو رسائل کی دنیا میں اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ یہ رسالہ پچھلے بائیس برسوں سے انسان دوستی، عقلیت پسندی، قومی یک جہتی اور روشن خیالی کا پرچار کر رہا ہے، اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی اس کے ایڈیٹر شمس کنول نے اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔ "مذاہب عالم نمبر" جس میں ہر مذہب فکر کے لکھنے والے شامل ہیں، بجائے خود قومی یک جہتی کی مثال اور مدیر کی روشن خیالی کا مرقع ہے۔ "گگن" کا یہ کہنا کہ وہ غافلوں کے لیے صور اور عاقلوں کے لیے جلوۂ طور ہے "گگن" کے مطالعے کے بعد صحیح معلوم ہوتا ہے۔

شمیم گلشن، نسیم صحرا، شعاع خورشید و موج دریا

ساڑھے بارہ سو صفحات پر مشتمل اس خاص نمبر میں تقریباً ہر اہم مذہب کے تعارف، اس کی تاریخ، تعلیمات، اصطلاحات، تلمیحات اور روایت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں ہر مذہب کے عالم سے مقالات لکھوائے گئے ہیں جیسے عیسائیت پر ناور کرلیسٹین ٹرول، بدھ مت پر بھکشو سنالی، اسلام پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی، جین مت پر چندن مل چاند اور یہودیت پر شیلم سیموئل، احمدیہ جماعت پر بشیر احمد قادیانی اور سکھ مذہب پر این۔ ڈی آہوجہ سے لکھوایا گیا ہے۔ ہر مذہب کے ضمنی فرقوں، ان کے طریق عبادت، مختلف ذاتوں اور قبیلوں کا احوال تفصیل سے مہیا کیا گیا ہے۔ دنیا کی اہم مذہبی تحریکات اور ان کے رہنماؤں اور مصلحوں کے حالات بھی کافی کدّ و کاوش کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مذہب کے تیج تیوہار، میلوں ٹھیلوں، رسوم و رواج کا دلچسپ حال بڑی تحقیق و تلاش سے اکٹھا کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دنیا بھر کے مقدس مقامات معابد، دریا، پہاڑ، شہروں اور شہروں کی تفصیلات بہم پہنچانے میں بھی فاضل مدیر نے انتہائی دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے۔ رسالے کے مستقل عنوان "نشان راہ" کے تحت ایک سو سے زائد مذہبی و معاشرتی استفسارات کے جوابات دیے گئے ہیں، اور ایک دوسرے مستقل عنوان "سورج بھی تماشائی" کے تحت "ظلم" "نکاح" پر تبصرہ کرتے ہوئے فاضل تبصرہ نگار نے عائلی قوانین کے آغاز و ارتقا سے بحث کرتے ہوئے مسلم، ہندو، کرسچین، اور پارسی مذہبی قوانین کا بھی ضروری جائزہ لیا ہے اور اس طرح اس تبصرے نے ایک مقالے کی صورت اختیار کر لی ہے، نیز "حرف و حکایت" کی سرخی کے تحت تقریباً سو صفحات پر مشتمل فرہنگ مذہبیات بھی قابل قدر اور معلومات افزا ہے۔

یہاں نیرنگی فکر و نظر ہے

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ مذہب اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ تاریخ انسانی۔ اس لیے مذہب کے اثرات تاریخ کے ہر دور اور حیاتِ انسانی کے ہر شعبے میں نظر آتے ہیں اور اس وسیع و بسیط موضوع کو سمیٹنے کے لیے متنوع مضامین کا قابلِ قدر ذخیرہ اس خاص نمبر میں موجود ہے جیسے مذہب پر جغرافیہ کے اثرات (حیات اللہ انصاری)، مذہب اور فنِ طب۔ حکیم سید ظل الرحمٰن) اسلام اور سائنس (ڈاکٹر احسان اللہ خاں)، مذہب اور مارکسزم (اصغر علی انجینیر)، مذہب اور موسیقی (محمد رمضان)، مذہب اور روحانیت

(اچاریہ بدھ رکھیتا)، ہندو فلسفۂ زندگی (پنڈت دیووت شاستری)، مذہب اور عورت (قرۃ العین)، مذہب اور قومیت (کنول بی کے نارائن)، مذہب اور فوج (جنرل کے ایم کیری اپا)، بین مذہب شادی (محمد مجتبیٰ صدیقی)، مذہب اور حفظانِ صحت (شمس کنول)، یوگ (سی ایل کاؤنس) وغیرہ۔

اندرا گاندھی کے دونوں مضمون (عقل و دانش کی راہیں، عورت دھرم کرم کی دنیا میں) اندرا کو ایک روشن خیال اور وسیع النظر مصنفہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ شہناز کنول کے مضامین (عہد نبوت میں دنیا کے حالات، عربوں کی تاریخ) ان کی تاریخ اسلامی سے کماحقہ واقفیت کے مظہر ہیں۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کے تصوف اور صوفیا کے سلسلے میں دونوں مضمون قابلِ مطالعہ ہیں اور انھوں نے اپنی دل نشیں نثر کا جادو "جانوروں کی مذہب پرستی" کے اچھوتے عنوان سے بھی جگایا ہے۔ "خدا آگہی" کے سیکشن میں خدا اور مذہب کی ضرورت اور عدم ضرورت کی بحث میں مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ عقلیت پسندی کے نظریے کے تحت ڈاکٹر ابراہم کوور، برٹرنڈ رسل، بلراج ساہنی، اشوک کمار شمس کنول اور اسیم کاویانی کے مضامین غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

اس بھاری بھرکم، سنجیدہ، علمی، تحقیقی اور معلوماتی خاص نمبر میں آپ کو سستانے، اپنے ذہن کو آسودہ کرنے اور تھکان مطالعہ دور کرنے کے مواقع کرشن چندر اور آئی ایس جوہر کے طنزیہ مضامین، نظیر صدیقی کا فکاہیہ اور راجندر کرشن اور حیات اللہ انصاری کے انسان دوستی کے پیام کے حامل افسانے فراہم کریں گے اور حالی، اقبال، جوش، یاس یگانہ، حسرت، احمد فراز، نشتر خانقاہی، عبدالعزیز خالد، رئیس امروہوی، عبداللہ کمال، ادیب مالیگانوی اور برجیس قدر کی شعری تخلیقات "قارئین کے ذوقِ شعر پسندی کی تسکین کا وافر سامان بہم پہنچائیں گی۔ مختصر یہ کہ "مذاہب عالم نمبر" معلومات کا ایک خزانہ ہے اور "گلگن کے بیبے دل سے یہی صدا نکلتی ہے کہ ع

چنیے کز تماشا مست گلِ او بہار بادا۔ (اسیم کاویانی)

جدید دنیا میں اسلام
(مسائل اور امکانات)

مرتب: پروفیسر آل احمد سرور
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت: ۴۰ روپے

"جدید دنیا میں اسلام" اقبال انسٹی ٹیوٹ، سری نگر کی ایک قابلِ قدر پیش کش ہے جسے پروفیسر آل احمد سرور نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب اس سیمینار کے مقالات پر مشتمل ہے جو ۳ تا ۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء سری نگر میں منعقد ہوا تھا اور جس میں ملک کے اہم ترین دانش وروں نے حصہ لیا تھا۔ کتاب میں پروفیسر سرور کے پیش لفظ اور وزیر اعلیٰ کشمیر شیخ عبداللہ مرحوم کے خطبۂ افتتاحیہ کے علاوہ کشمیر اور بیرونِ کشمیر سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام اور دانش وران کے ۲۱ مضامین شریکِ اشاعت ہیں۔ ہر مضمون اپنی جگہ پر اہم ہے اور کسی نہ کسی اہم پہلو کو پیش کرتا ہے۔ بعض موضوعات پر ایک سے زیادہ مضامین بھی لکھے گئے ہیں مگر خیالات کی تکرار بہت کم نظر آتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے علما اور دانش ور بھی اب اہم مسئلوں پر آزادی اور بے باکی کے ساتھ غور وفکر اور اظہار خیال کرنے لگے ہیں۔

شیخ عبداللہ مرحوم نے اپنے افتتاحی خطبے میں اسلام کی تاریخ، تعلیمات اور موجودہ صورت حال سے اپنی گہری واقفیت کا ثبوت فراہم کیا ہے اور سری نگر میں ایک ایسے اسلامی مرکز کے قیام کی بات کہی ہے جس میں دورِ حاضر کے ان تمام مسائل پر تحقیق ہوگی جو آج اسلام کو درپیش ہیں۔ پتا نہیں ان کے بعد یہ کام کس مرحلے میں ہے؟ اگر اس طرح کا کوئی مرکز قائم ہو جائے تو شاید جناب صباح الدین عبدالرحمٰن اور بعض دیگر دانش وروں کی یہ خواہش عملی جامہ پہن لے کہ عصرِ حاضر کے پیدا کردہ نزاعی امور سے متعلق تمام علما متفقہ طور پر کوئی فیصلہ کرلیں اور پوری ملت اس کی پابندی کرے۔

کتاب کا پہلا مضمون پروفیسر آل احمد سرور کا ہے اور اس کا عنوان بھی وہی ہے جو کتاب کا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر موصوف نے اسلامی نظامِ حیات کے مختلف پہلوؤں اور ان کو درپیش تازہ ترین مسئلوں پر مختصراً اظہارِ خیال کرنے کے بعد بالآخر یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

"شریعت جو ڈسپلن قائم کرتی ہے اس کی ضرورت مسلّم ہے اور ڈسپلن کے بغیر انتشار فطری ہے۔ مگر اس ڈسپلن کے پیچھے ایسی نظر بھی ضروری ہے جو قدیم وجدید ماضی وحال دونوں سے گہری واقفیت رکھتی ہو... اس لیے اسلام کے ابدی اصولوں کی روشنی میں 'قانونِ وراثت'، تعدادِ ازدواج اور حدودِ شرعی پر برابر غور کرنے اور ان کی روح کے مطابق ان کی عملی تعبیروں کی ضرورت بہرحال مسلّم ہے"۔ پروفیسر سرور کا خیال ہے کہ اسلامی نظامِ حیات میں زندگی کے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی بھرپور اہلیت موجود ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں مروّج نظامِ تعلیم کو درست کیا جائے۔ جب دانش وری کی روایت محفوظ ہوگی اور مسلمان عہدِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اسلام کی روح تک پہنچ کر اس کا مطالعہ کریں گے تو خود بخود تنگ نظری اور اندھی ماضی پرستی کے جال سے نکل آئیں گے۔

پروفیسر سرور کے علاوہ میر واعظ مولانا محمد فاروق، محمد یوسف ٹینگ، غلام رسول ملک، خواجہ حسن ثانی نظامی، حافظ رحمت اللہ میر، حافظ مجیب اللہ ندوی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا اخلاق حسین قاسمی، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر منیر الحق اور محمد اسلم اصلاحی کے مقالے بھی زینتِ کتاب ہیں۔ اسلام اور بینکنگ کے موضوع پر ایک اچھا مضمون جناب ریحان الحق نے لکھا ہے اور ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نے جمہوریہ اسلامی ایران میں اسلام کے مسائل اور امکانات کا اچھا جائزہ پیش کیا ہے۔ مفتی محمد رضا انصاری، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، غلام نبی ہاگرو، ایم اے شیدا اور منشی جلال الدین نے بھی بعض اہم نکات اٹھائے ہیں اور خاصے دلائل فراہم کیے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب عہدِ حاضر میں اسلام کو درپیش مسائل اور ان کے حل کے علاوہ اسلامی اقدار اور بعض اہم اجتہادات سے متعلق بھی اچھی خاصی معلومات فراہم کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض سوالات کا کوئی فیصلہ کن جواب یہاں سامنے نہیں آسکا ہے مگر جیسا کہ مرتب نے "پیش لفظ" کے تحت لکھا ہے، موضوع کے بارے میں ایک مجموعی تاثر یقیناً قائم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ علمی حلقوں کے علاوہ عوام میں بھی اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

آئینہ ملفوظات

مصنف: علامہ اخلاق حسین دہلوی
ناشر: کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی ۶
قیمت: پچیس روپے

"آئینہ ملفوظات" علامہ اخلاق حسین دہلوی کی تصنیف ہے۔ اس میں فوائد السالکین، اسرار الاولیاء اور راحت القلوب پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ مصنف نے تصوف اور خواجگان چشت سے متعلق مباحث پر مضامین سپرد قلم کیے تھے۔ بعض جرائد میں ان کی اشاعت ہوئی خصوصاً معارف اس سلسلہ متبرک کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ ان مضامین کے ضمن میں یہ بھی ہوا "منقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات"
پروفیسر محمد حبیب تاریخ کے عالم ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ کے جریدے میں چشتیہ صوفیہ کے قلمی ذخیرے پر ایک مضمون انگریزی میں سپرد قلم کیا تھا اپنے تاریخی شعور اور تحقیقی صلاحیت کی روشنی میں بعض ملفوظات کو جعلی قرار دیا تھا۔ یہاں عقیدت کا مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ سند اور تحقیق کا ہے۔ احادیث کے انتخاب اور جمع کرنے میں یہی عمل کارفرما تھا۔ "صحاح ستہ"، اس عمل کی متبرک شکل سمجھی جاتی ہے۔ بہرحال سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور علامہ اخلاق حسین دہلوی نے پروفیسر محمد حبیب کے موقف سے اختلاف کیا۔ ۱۹۷۴ء میں ادھر "منادی دہلی" کا بابا فرید نمبر شائع ہوا۔ بعض تحریروں کو غیر مستند قرار دیا گیا۔ اسی طرح کے مضامین پر نظر ثانی کر کے علامہ اخلاق حسین نے "آئینۂ ملفوظات" شائع کی ہے۔ اس باب میں مصنف نے چشتیہ ملفوظات کے قلمی نسخوں کی تلاش بھی کی ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ ص ۱۴ پر "حضرت نظام الدین اولیاء۔ حیات و تعلیمات"، کو موازنہ کی بات بتایا ہے۔ پروفیسر محمد حبیب نے لکھا ہے۔

سیر الاولیا مصنفہ سید مبارک علوی کرمانی المدعو بہ امیر خورد (ص ۱۱)

اس کی تردید میں سیر الاولیا (فارسی) چرنجی لال اڈیشن کی تحریر پیش کی گئی ہے۔

(سیر الاولیاء سید مبارک علی علوی کرمانی کی تصنیف نہیں ہے اور نہ وہ امیر خورد کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے)

"قلمی نسخوں کے متعدد اڈیشن ہوتے ہیں اور مختلف ادوار کے رقم کردہ بھی۔ کتابت کی غلطی سے بھی مفر ممکن نہیں۔ اس لیے اختلاف بیان کو ریسرچ کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ علمی مباحث میں ہمارے نزدیک عقیدت یا جذباتیت سے کام نہیں لینا چاہیے۔

"آئینہ ملفوظات" کا مطالعہ ضروری ہے۔ قاری کو معلوم ہونا چاہیے کہ ملفوظات کیا ہیں؟ ملفوظات مجموعہ ہوتے ہیں، ان بیانات کا جو اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ کی ترغیب و تحریص کے لیے صوفی بزرگ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے مجمع میں بیان کیا کرتے تھے اور کرتے ہیں ملفوظات کو اشارات و ارشادات اور اقوال و فوائد بھی کہتے ہیں اور ان کے مجموعوں کو کتب اہل سلوک اور کتب مشائخ سے تعبیر کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ مطالعہ ملفوظات کے مبادیات پر اس کتاب میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

فوائد السالکین کے مطالعے میں اس کی قدامت، سیر الاولیاء کی الحاقی عبارت، حضرت بابا

کی ولادت اور وفات کا صحیح تعین فوائد السالکین میں مافوق الفطرت عناصر اور قدیم قلمی نسخوں سے بحث کی گئی ہے۔

اسرار الاولیا کے مطالعے میں عہد تدوین، فصول، احادیث کی تدوین، فصول کا اختتامیہ کتابت کی غلطیاں۔ تحریف اور قدیم قلمی نسخے وغیرہ سے آگہی ملتی ہے۔

راحت القلوب کے مطالعے میں استبداد زمانت، حضرت محبوب الٰہی کی سوانح حیات سے متعلق اہم سنین کا تعین خرق عادات وکرامات، اور قدیم قلمی نسخوں کی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

یہ کام بڑی لگن اور تلاش سے کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے خواجگان چشت کے حالات و فرمودات کے علاوہ بعض تاریخی اور معاشرتی نیز علمی نکات بھی ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

"آئینۂ **ملفوظات**" ایک قابل توجہ اور معتبر تصنیف ہے۔ اس کی کتابت و طباعت بھی معیاری ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

ابوالکلام آزاد: بحیثیت مفسر و محدث

مؤلف: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری
ناشر: ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، ۸۶-۸۱، کراچی ۴۳
قیمت: بیس روپے

مولانا ابوالکلام آزاد جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ایک بلند پایہ انشا پرداز، ایک بے مثل خطیب ایک جید عالم اور ایک اعلا مرتبت سیاسی مفکر و رہنما تھے۔ ان کی روشن ضمیری اور خردمندی نے انھیں بیسویں صدی کے عظیم مفکرین و مصلحین میں جگہ دلائی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال پر ۲۶ سال کی مدت گزر جانے کے بعد بھی ان کے فکر و عمل پر نئے نئے انداز سے روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کام کا دائرہ موجودہ ہندستان کے جغرافیائی حدود تک محدود نہ رہ کر سرحد کے اس پار تک پھیلا ہوا ہے۔ زیر نظر کتاب جو مولانا آزاد پر مفسر و محدث کی حیثیت سے لکھے گئے ۸ (آٹھ) مضامین کا مجموعہ ہے، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"ترجمان القرآن" مولانا آزاد کی مذہبی فکر کا سب سے بڑا مجموعہ اور شاہکار ہے۔ ان کا یہ کارنامہ (جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں مکمل ہو کر بھی مکمل طور پر شائع نہ ہو سکا) ان کی کوئی اتفاقی یا وقتی تحریر نہیں بلکہ بقول خود ان کے:

> "کامل ۲۷ برس سے قرآن میرے شب و روز کے لیے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے اس کی ایک ایک سورۃ ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں طے کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں، تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ وغیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔۔۔۔ اس تمام عرصے کی جستجو وطلب کے بعد قرآن کو جب کچھ اور جتنا کچھ سمجھ چکا ہوں میں نے اس کتاب کے

صفحوں پر پھیلا دیا ہے۔ (ترجمان القرآن صفحہ ۷،۸)

مولانا آزاد کی زندگی ہی میں ان کے اس ترجمہ و تفسیر پر بہت کچھ لکھا گیا اور دینی علمی اور ادبی حلقوں میں اس کا عام طور پر استقبال ہی کیا گیا۔ زیرِ نظر کتاب میں بحیثیت مفسر جو پانچ مقالے شامل ہیں ان میں ہم ایسے ہیں جو کہ پہلے چھپ چکے ہیں جیسے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اور مولانا محمد حنیف ندوی کے مقالے عبداللہ بٹ کے مرتبہ مجموعہ " ابوالکلام آزاد" (لاہور: ۱۹۴۳ء) میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا مقالہ ماہ نامہ آج کل دہلی کے مولانا آزاد نمبر (۱۹۵۸ء) میں اور سید عبداللطیف صاحب کا مقالہ ہمایوں کبیر مرتبہ انگریزی مجموعہ " ابوالکلام آزاد" میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ان سب کے علاوہ خود اس کتاب کے مؤلف ابوسلمان صاحب کا " مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی خدمات" پر ایک ۵۶ صفحات پر پھیلا ہوا مقالہ دقتِ مطالعہ اور مرتب کی موضوع سے دلچسپی کا ثبوت ہے۔

اس کتاب میں مولانا آزاد پر "بحیثیت محدث" جو دو مضمون شامل کیے گئے ہیں وہ بھی پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مضمون مولانا ابوالکلام آزاد کا تصورِ حدیث اور ان کی خدمات" جو ۱۹۶۷ء میں ماہ نامہ الرحیم حیدرآباد (سندھ) میں شائع ہوا تھا اور دوسرا مضمون " فنِ حدیث میں مولانا آزاد کا تبحر" مولانا محمد شعیب عمری کی فکری کاوش ہے اور جامعہ عمرآباد کے رسالہ " صحیفہ" کے ۱۹۷۷ء کے سالنامہ میں شائع ہو چکا ہے۔

اس مجموعہ کو مؤلف نے اس لیے نذرِ قارئین کیا ہے کہ " مولانا کے ترجمان القرآن کا بالاستیعاب اور گہرا مطالعہ کیا جائے" کیوں کہ ان کی رائے میں ترجمان القرآن ایک ایسا ترجمہ اور تفسیر ہے جس کے مترجم اور مفسر نے اپنے ذوق کی ترجمانی کا ذریعہ بنانے کے بجائے قرآن کی دعوت و تعلیمات اور اس کے مقصدِ نزول کو صرف اسی کے حروف و سواد میں پیش کیا۔ جو بیرونی و خارجی تبلیغ اور داخلی اصلاح و تعلیم اور پھر فرد سے لے کر عالم گیر اجتماعِ انسانی کے قیام تک ہر سطح اور دائرے میں تربیتِ افراد و اجتماع اور تشکیل انسانیت کا سر و سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسا ترجمہ جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ یہ ترجمہ کسی خاص فکر، عقیدے، فلسفے، یا کسی فرقے یا گروہ کے عالم کا نہیں، صرف قرآن کا ترجمہ ہے"۔

اس دعوے میں بھی کوئی کلام نہیں ہے کہ اس مجموعہ میں شامل مضامین کے مطالعے سے نہ صرف مولانا کے ترجمہ و تفسیر کے محاسن کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے ذہن و فکر کے کمالات، اندازِ فکر کی خوبیوں اور مطالعہ و نظر کی وسعتوں اور گہرائیوں کا بھی بے روک مشاہدہ ہو جاتا ہے۔

کتاب میں ترجمان القرآن کی جلد اول اور دوم کی اشاعتِ اول کے پہلے صفحوں، نیز ترجمان القرآن، البیان فی مقاصد القرآن، البصائر اور البیان کے جو اشتہارات شائع ہوئے تھے ان کے فوٹو بھی ہیں۔ شروع میں فاضل مؤلف کے پیش لفظ کے علاوہ روش صدیقی مرحوم کی نظم " امام الہند کی یاد میں" بھی شامل ہے۔

ہم ان بکھرے ہوئے شہ پاروں کو جمع کر دینے اور حسن و خوبی کے ساتھ شائع کرنے پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ اس طرح کی علمی کوششوں سے وہ اردو دانوں کو آئندہ بھی نوازتے رہیں گے۔

(پروفیسر مشیر الحق)

بہارِ سیرت حصہ اوّل و دوم

مصنف : محمد علی خاں شاہین اشرف بدایونی
طابع وناشر : محمد علیخاں شاہین اشرف محلہ جالندھری سرائے۔ بدایوں
قیمت : ۲۵ روپے

بہار سیرت بدایوں کے ایک اہم نعت گو شاعر کا کارنامہ ہے۔ کارنامہ میں نے اس لیے کہا کہ یہ مثنوی موجودہ نعت گو شعراء کے عام راستے سے ہٹ کر اپنا ایک مخصوص راستہ بناتی ہے۔ کتاب ۲ حصول میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ قبل ظہور سے ــ بعثت تک۔ اور دوسرا حصہ ــ بعثت سے ــ ورود مسعود مدینہ منورہ تک پہلے حصہ میں چھ ابواب ہیں اور دوسرے میں آٹھ۔ کل صفحات کی تعداد ۶ ۵۳ ہے ان میں سے صفحہ ایک سے ۵۴ تک۔ فہرست اوّل و دوم۔ افتتاحیہ از جناب سید حسین مثنی تقریظ از جناب صغیر احمد صدیقی۔ بہار سیرت پر ایک طائرانہ نظر از جناب دیریندر پرشاد سکسینہ دیباچہ از جناب مصنف ہیں اور صفحہ ۵۶ سے کتاب شروع ہوتی ہے۔ اگر یہ پیش لفظ تقریظ اور مقدمے نہ بھی ہوتے تو کتاب کی افادیت اور معیار میں کمی نہ ہوتی۔ صرف مصنف کا دیباچہ کافی تھا۔ بقیہ صفحات میں مزید اشعار آسکتے تھے۔ اور حضور صلعم کے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد واقعات (چند ہی سہی) نظم ہو جاتے اور اس سلسلے میں تشنگی کا احساس نہ ہوتا لیکن آج کل کی سیاسی زندگی میں مکمل کتاب بہت کم لوگ پڑھتے ہیں۔ زیادہ تر پیش لفظ اور مقدمے پڑھ کر رائے قائم کر لی جاتی ہے کیوں کہ ان میں کافی اقتباسات آجاتے ہیں۔ مصنف نے ہر جگہ اپنے آپ کو مصنف کی جگہ مؤلف لکھا ہے۔ لیکن یہ تنقید نگار کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کو ایک کامیاب مصنف کا درجہ دینے کو تیار ہے۔

گزشتہ گیارہ سال سے میں بدایوں میں مقیم ہوں۔ محمد علی اشرفی کو نعتیہ مشاعروں میں کلام پڑھتے سنا ہے۔ رفیع بخش قادری کے یہاں ہر سال ربیع الاوّل میں ایک محفل میلاد منعقد ہوتی ہے۔ اسی قسم کی ایک محفل میں اشرفی نے اپنا ایک سلام سنایا تھا تو سماں بندھ گیا تھا اور سامعین لطف اندوز ہو رہے تھے۔

سلام اے صبا شاہِ ذی شاں سے کہنا

اشرفی صاحب ایک صاحب علم مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے اور ایک اچھے انسان ہیں۔ عمر کا بیشتر حصہ معلمی میں گزرا ہے۔ فارسی، اردو اور عربی کے ایک اچھے استاد ہیں۔ کئی سال ہوگئے کہ انھوں نے نعتیہ سلام کا ایک مجموعہ دکھایا تھا جو غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ اس میں بھی کئی نظمیں اور غزلیں خاصہ کی چیز تھیں۔

زیرِ نظر کتاب "بہار سیرت" کے عنوانات کا طرز حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام جیسا ہے اور مثنوی کی بحرِ گلزارِ نسیم کی ہے۔ لیکن ان کی کاربن کاپی نہیں بلکہ اوریجنل ہیں۔ فاضل مصنف اقبال سے بھی کافی متاثر ہیں۔ اور جگہ جگہ ان کے اشعار بطور سند کے پیش کیے ہیں۔ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فٹ نوٹ کے ساتھ مشکل الفاظ کے معانی و مطالب اسی متعلقہ صفحہ پر دے دیے گئے ہیں۔ اور اس سے طالب علم اور عام آدمی دونوں مستفید ہو سکتے

ہیں۔ ایک عنوان ہے "کیا اسلام کی اشاعت تلوار سے ہوئی (صفحہ ۲۴۷) چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نادان ہیں دیتے ہیں جو الزام — پھیلا تلوار سے ہے اسلام
سوچیں تو وہ ذرا ٹھنڈے دل سے — تلوار کہاں تھی پاس ان کے
تلوار تھی پاس دوسروں کے — پیاسے جو ان کے خون کے تھے
ہاتھوں میں تو صرف سر تھے ان کے — حاضر جو خدا کی راہ میں تھے
گھر بار لٹے کہ جان جاتے — ایمان میں مگر نہ فرق آئے
سچ بات تو ہے یہی کہ یہ دین — حقانیت ہے جس کا آئین
تلوار سے ہے نہیں یہ پھیلا — سائے میں ہے اس کے بلکہ پھیلا

"حضرت اسمٰعیل کی قربانی" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے (صفحہ ۹۶۔ ۹۵)

ہے آج اسی پسر کا قاتل — تعمیل حکم پر ہے مائل
حیرت میں زمین و آسماں ہیں — سکتے میں مکان و لامکاں ہیں
گھٹنا گردن پہ آ چکا ہے — گردش میں چرخ آ چکا ہے
تاباں ہے ادھر پدر کا چہرہ — شاداں ہے ادھر پسر کا چہرہ
جیسے ہی چھری گلے پہ آئی — چکرا کے فلک نے دی دہائی
لرزہ ہوا دو جہاں پہ طاری — تھرا گئی کائنات ساری
حق کی رحمت کو جوش آیا — اک رونگٹا بھی نہ کٹنے پایا
آئے جبریل ہاتھ تھاما — تھا ہو چکا امتحان پورا

شب معراج کے سلسلے میں ایک عنوان ہے "بیت اُمّ ہانی میں محبوب خدا کا آرام فرمانا"۔ صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

نازاں نہ ہو کیوں سواد تحریر — دلبل کی ہو کے آج تفسیر
شبدیز قلم عروج پر ہے — بام افلاک پہ نظر ہے
یہ شب وہ سہانی شب ہے جس پر — قرباں ہوں ہزاروں ماہ و اختر
اللہ رے بیت اُمّ ہانی — معراج کی رات کی نشانی (صفحہ ۲۹۵)

اسی قسم کے اشعار بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح کتاب میں جا بجا ملتے ہیں جن کو پڑھ کر آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی مکاتب میں یہ کتاب نصاب میں داخل ہونا چاہیے دیگر مدارس میں اخلاقی ضمن میں اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ قومی یک جہتی کے سلسلے میں بھی اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

لکھائی چھپائی عمدہ اور کتابت کی غلطیوں سے پاک ہے۔ کتاب کی جلد پر کعبہ شریف کا فوٹو جاذب نظر ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کی پذیرائی کی جائے گی اور اردو کے نعتیہ لٹریچر میں اس سے اضافہ ہوگا۔

(مبشر علی صدیقی)

نورِ نظم (انتخاب سراج نظم)

مرتب و مؤلف: ڈاکٹر حکیم سید محمد کمال الدین حسین
ملنے کا پتا: حکیم سید محمد اعظم الدین حسین
قیمت: دو روپیا

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک جامع اور مستند حدیث توحید مفضّل کے نام سے مشہور و معروف ہے جو مختلف علوم کے حقائق کی روشنی میں عرفانِ حق تعالیٰ سے متعلق ہے اس کا ترجمہ زبانِ اردو میں جناب مولانا محمد ہارون صاحب زند پوری نے "توحید الائمہ" کے نام سے فرمایا ہے۔ اور شیخ امام بخش ناسخ نے اس حدیث کا منظوم اردو ترجمہ فرمایا ہے جسے آپ کے شاگرد رشید میر علی اوسط رشک نے استاد ناسخ کی وفات (۱۲۴۸ھ) کے بعد ۱۲۵۴ھ میں مرتب فرمایا۔

ڈاکٹر حکیم سید محمد کمال الدین حسین صاحب نے اس منظوم ترجمے سے تشریح سے متعلق اشعار کا انتخاب فرما کے ایک مجلس کی صورت میں مدون فرمایا ہے اور نورِ نظم کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ کتاب ادارہ محمدانیہ جلالی ضلع علی گڑھ سے سید محمد ضیاء صاحب و سید محمد سبطین صاحب کے مالی تعاون سے بغرض ایصال ثواب جناب سید علی نذیر صاحب رئیس جلالی مرحوم و مغفور شائع ہوئی ہے۔

(مولوی حکیم سید اصغر حسین واسطی)

میلادِ خضر

شاعر: خضر برنی
ناشر: ادبی سنگم، مولانا محمد علی جوہر مارگ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت: ۳ روپے

خضر برنی اردو کے کہنہ مشق شاعر، ادیب اور صحافی ہیں جنھوں نے اردو شعر و ادب میں گذشتہ پچاس سال کے دوران ہر صنف میں اپنی منی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ اردو غزل کی زلفوں کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے نعتیہ کلام کے دو مجموعوں کی اشاعت سے اپنی ہمہ جہت شخصیت کا ثبوت دیا ہے۔

زیرِ تبصرہ مجموعۂ کلام میلادِ اکبر کی طرز پر ہے جس میں نعتیہ کلام کے علاوہ سرورِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی سیرتِ پاک کا تذکرہ نثر میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ حکایاتِ روایات اور احادیث کو نعتوں کے ساتھ اس خوبی سے مربوط کیا گیا ہے کہ داد دینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

مناجات، درود و سلام، اور نعت کے تحت خضر برنی نے پیغمبرِ اسلام کی ولادت اور طفلی کے زمانہ کے حالات قلم بند کیے ہیں اور حواشی میں اس ذات بابرکات کی صفات، محاسن اور توجیہات کے متعلق واقعات کو بڑے مربوط اور دلکش پیرایے میں بیان کیا ہے ان کا خیال ہے کہ

روزِ اوّل ذاتِ حق تھی، کچھ نہ تھا
لا الہ کے بعد رب نے نام احمد خود لکھا
کی بشر سے خوب اس نے ابتدا و انتہا
تذکرہ یہ آسمانی کچھ صحیفوں میں پڑھا

دو جہاں کیوں کر بنے گلزار کی باتیں کریں
آؤ مل کر احمد مختار کی باتیں کریں

حضور اکرم کی ولادت کے متعلق بہت سی روایتیں وابستہ ہیں خضر صاحب نے ان باتوں کو اس طرح منظوم کیا ہے۔

تمھیں کچھ خبر بھی ہے اے دنیا والو، یہ کیوں ساری دنیا بنائی گئی ہے
یہ کوہ بیاباں، یہ گل اور گلشن، بہاروں سے محفل سجائی گئی ہے
وہ لوح و قلم عرش و کرسی سنوارے کیا ساتھ محبوب کے نام شامل
فلک پر کیے ماہ و انجم نمایاں فرشتوں کی دنیا بسائی گئی ہے

دیکھا ایسا نہ رہبر و ہادی
جس نے جفا کی اس کو دعا دی
شانِ نبوت اور بڑھا دی
ہوئے نہ دشمن پر بھی برہم
صلی اللہ علیہ وسلم ،،

حلیمہ سے روایت ہے کہ جب آپؐ پیدا ہوئے، ایک رات ہمارے قبیلہ میں غیب سے آواز آئی کہ اے بنی سعدیہ کی عورتوں! خبردار ہو، اللہ تعالٰے نے برکت نازل فرمائی ہے کہ ایک لڑکا قریش میں پیدا ہوا ہے اور وہ دن کا سورج اور رات کا چاند ہے۔

آمنہ بی کا راج دلارا
دائی حلیمہ کی گود کا پالا
کہلایا جو کملی والا
نور کا پیکر تو عظمتِ آدم
صلی اللہ علیہ وسلم

خیال ایسا آیا سویرے سویرے
ہوا عام جلوا سویرے سویرے

جس کے لیے فلک پہ ستارے بچھا دیے
لوح و قلم سے عرش کے دفتر سجا دیے
دنیا پہ مہر و ماہ کے گوہر لٹا دیے
فرشِ زمیں پہ اس نے دکھائے عجائبات
، اللہ ہی جانتا ہے محمد کی بس صفات (مرتضا ملک بانکوٹی)

فیوضاتِ وزیریہ
(تصوف)

مصنف: وجیہ الدین احمد خاں قادری
ناشر: مکتبہ وزیریہ محلہ انگوری باغ رام پور
قیمت: ۲۰ روپے

زیرِ نظر کتاب مشہور عالم دین مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رام پوری کی تصنیف ہے جسے وجاہت اللہ خاں نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں تصوف اور اس کے متعلقات سے عمدہ پیرائے میں مفید بحث کی گئی ہے۔ موجودہ دور کے بے روح تصوّف کا بھی اس میں ذکر کیا گیا ہے اور حقیقی تصوّف کی طرف مراجعت کی اپیل کی گئی ہے۔

مرتب نے ۳۰ صفحات کا ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے۔ جو ابتدا کتاب میں شامل ہے۔ منشی محبوب علی صاحب نے مختصر مگر اہم تعارف دو صفحوں میں کرایا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف اور ان کے مرشد مولانا وزیر محمد خاں صاحب کا تذکرہ بھی بطور تبرک شامل کیا گیا ہے۔ آخر میں تصوّف کے چاروں سلسلوں کے شجرے بھی درج کیے گئے ہیں جن میں بزرگان برحق کی جائے وفات اور تاریخ وفات وغیرہ کی محققانہ انداز میں نشان دہی کی گئی ہے۔ تصوف اور اس کے مشاغل سے علمی وعملی دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کتاب کی ضرور قدر کریں گے۔ (دایم شعائر اللہ)

حالاتِ مشائخ
(تذکرہ)

مصنف: سردار شاہ خاں
ناشر: مکتبہ وزیریہ محلہ انگوری باغ۔ رام پور۔ یوپی
قیمت: ۱۴ روپے

تذکرہ نگاری کا رواج اہل علم میں قدیم دور سے ہے۔ ہر زمانے میں مشاہیر کے حالات جمع کیے گئے چاہے وہ کسی بھی میدان کا مرد ہو۔

طبقۂ صوفیا کے بھی بہت سے تذکرے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ اس طبقہ میں سلسلۂ قادریہ کو زیادہ فروغ ہوا اور اس سلسلے کے بیشتر تذکرے منظر عام پر آتے ہیں۔ سلسلۂ قادریہ مجددیہ کی جو شاخ رام پور میں پہنچی ہے اس کے تعلق سے یہ سلسلہ مرتب کیا گیا ہے۔

اس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوتے ہوئے مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رام پوری تک ۳۹ نیک نفسوں کے حالات جمع کیے گئے ہیں۔

کتاب کی ترتیب وتہذیب بہت اچھی ہے۔ زبان وبیان بھی بہت سلیس اور شستہ ہے۔ حضرت امام حسنؓ کی اولاد کا ذکر عموماً تذکروں میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ مگر اس کتاب کے فاضل مصنف نے کافی تحقیق وجستجو کے بعد ان حضرات کا بھی تذکرہ درج کیا ہے جو ایک خوش آیند قدم ہے۔

تاریخ وتذکرہ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جس سے محروم رہ جانا بد قسمتی ہوگی۔

(دایم شعائر اللہ)

جذباتِ وجیہ

مصنف: وجیہ رام پوری
پتا: مکتبہ وزیریہ محلہ انگوری باغ۔ رام پور۔ یوپی۔
قیمت: ۶ روپے

وجیہ الدین احمد خاں کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان کی نعتوں کا مجموعہ ہے۔ اصنافِ سخن میں نعت گوئی سب سے مشکل فن ہے یہاں پر ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ نعت گوئی کے لیے عشقِ نبی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا کے اندر یہ جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے اور کلام سے ظاہر ہے ؎

فانی شدہ ام بذات پاکت
باقی شدہ ام کہ تو بقائی

ایک اور شعر ہے

وجیہ بے نوا سودائے عشقِ احمدِ مرسل
تمھیں گر نقدِ جاں دیکر بھی مل جائے تو سستا ہے

شاعر کی انگلیاں نبضِ زمانہ پر بھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ آج کا معاشرہ اس لیے بگڑ چکا ہے کہ مسلمانوں نے شیرِ خدا حضرت علیؓ کی غلامی چھوڑ دی ہے کہتے ہیں ؎

یہ کیا بلا ہے کہ مسلم کو خاک کر ڈالا
سبب یہ ہے کہ غلام ابو تراب نہیں

اس مجموعہ میں نعتوں کے علاوہ مدحِ قرآن میں بھی پانچ نظمیں شامل ہیں جو اس صنف میں یکتا ہیں مختصر یہ کہ اپنے موضوع کا یہ ایک نادر نسخہ ہے جس کا مطالعہ بادۂ حبِ نبیؐ کے سرشاروں کے لیے مفید ہوگا۔

(عبدالہادی خاں کاوش)

اسلام دورِ حاضر میں

مصنف: ولفرڈ کینٹویل اسمتھ (مترجم: پروفیسر مشیر الحق)
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
قیمت: چھتیس ۳۶ روپے

"اسلام دورِ حاضر میں" مشہور مستشرق پروفیسر ولفرڈ کینٹویل اسمتھ کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے جسے پروفیسر مشیر الحق صاحب نے مرتب کیا ہے۔ کچھ مضامین کا ترجمہ خود ان کا کیا ہوا ہے اور کچھ ایسے ہیں جو اس سے پہلے ترجمہ ہو کر بعض علمی و مذہبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر اسمتھ اپنے فکر و عمل کے اعتبار سے ایک مذہبی انسان ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے اپنے مذہب پر عمل پیرا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسلام سے متعلق پروفیسر اسمتھ کا کہنا ہے کہ اس کا اطلاق کسی مخصوص مذہب پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا مطلب "اطاعت خداوندی" ہے اس کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ ایمان کسی انفعالی کیفیت کا نام نہیں بلکہ یہ بندے کا اپنے خدا سے کیا ہوا وہ معاہدہ ہے جس کی رو سے وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے اور اسی اطاعت و فرماں برداری کو اسمتھ "اسلام"

کہتے ہیں۔ اس اطاعت وفرماں برداری کے اظہار کے لیے بندہ جو طریقہ اجتماعی طور پر اختیار کرتا ہے وہ مذہب کہلاتا ہے اور مروجہ مذہب اسلام بھی اس کی ایک شکل ہے لیکن واحد ترین شکل نہیں۔ اسی طرح اسمتھ لفظ "مسلم" کے بارے میں کہتے ہیں کہ لغوی طور پر تو اس کا مطلب "فرماں بردار بندہ" ہے لیکن اصطلاحاً اسے "تاریخی مذہب اسلام کے پیرو" کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ ان کا خیال ہے کہ "اسلام" اور "مسلم" کا جو مفہوم وہ سمجھتے ہیں وہ قرن اول کے مسلمانوں کی تشریحات کے عین مطابق ہے اور اس کے ثبوت میں وہ طبری اور ان کے معاصرین کی مثالیں دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں دین ہمیشہ ایک رہا ہے لیکن ہر دور کے تقاضوں کے مطابق شریعتیں بدلتی رہی ہیں۔ پروفیسر اسمتھ نے بعض مثالوں اور اعداد و شمار کے ذریعے یہ بھی بتایا ہے کہ قرآن نے اصل زور "ایمان" پر دیا ہے نہ کہ مذہب (یعنی بندہ کے اطاعت کا اظہار کرنے کے طریقے پر) لیکن جوں جوں مسلم سماج منظم ہوتا گیا اور دوسرے مذاہب کی طرح مخصوص مذہب کی شکل اختیار کرنے لگا تو ایمان کے بجائے اسلام پر زور دیا جانے لگا۔ بظاہر تو پروفیسر اسمتھ کے یہ نظریات بہت جاذب توجہ اور صلح کل کا پیغام لیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر جزئیات کا مطالعہ کیا جائے تو حقیقی اسلام اور پروفیسر اسمتھ کے پیش کردہ نظریات کے مابین تفریق یا اختلاف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ جیسا کہ فاضل مرتب نے واضح کیا ہے۔ پروفیسر اسمتھ کی نیک نیتی پر شک کرنا دشوار ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فرد واحد کی فکر اور اجتہاد میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔ ان کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض جگہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اظہار بیان مسلمانوں کے فکری اور اعتقادی میلانات سے مختلف ہے۔

کتاب کو مرتب کے پیش لفظ "پروفیسر اسمتھ: شخصیت اور فکر" کے علاوہ چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کا عنوان "مطالعاتِ اسلامی" ہے، اس کے تحت دو مضمون ہیں ایک "اسلام میں قانون اور اجتہاد" دوسرے "کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟ — مسیحی علمائے الٰہیات سے خطاب" ان کا ترجمہ خود پروفیسر مشیر الحق نے کیا ہے دوسرے حصے کا عنوان "تقابلی مطالعہ مذہب" ہے اور اس کے تحت بھی دو مضمون ہیں ایک "مذہب کا تقابلی مطالعہ — کیوں اور کس طرح" جس کا ترجمہ سید مبارز الدین رفعت اور ڈاکٹر ابونصر محمد خالدی نے کیا ہے اور یہ مضمون رسالہ برہان دہلی (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۲ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مضمون "اسلام اور مسیحیت — کچھ فرق کچھ یکسانیت" ہے اس کا ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی نے کیا ہے اور یہ "دنیائے اسلام" نامی کتاب میں ۱۹۶۴ء میں لاہور سے شائع ہو چکا ہے تیسرے حصے میں "مسلمانانِ برصغیر کا فکری مطالعہ" کے تحت ۴ مضامین درج ہیں۔ اول "جدید ہندستان کا مسلمان اور اس کا مستقبل" جسے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے ترجمہ کیا ہے اور یہ رسالہ برہان دہلی (نومبر، دسمبر ۱۹۵۸ء اور جنوری ۱۹۵۹ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے "سرسید کے مذہبی افکار کا مطالعہ — ایک سوال" بھی ۱۹۵۵ء میں علی گڑھ میگزین کے علی گڑھ نمبر میں چھپ چکا ہے۔ تیسرا مضمون "پاکستان — ایک اسلامی ریاست" اصل کا ترجمہ و تلخیص ہے اسے عبد الرحمٰن عبد نے کیا ہے اور یہ چراغ راہ کراچی کے نظریۂ پاکستان نمبر میں ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے، چوتھا مضمون "اسلامی ریاست — ایک وضاحت" کا ترجمہ ظفر اسحاق انصاری نے کیا ہے۔ اور یہ بھی "چراغ راہ" کراچی

کے مذکورہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ چوتھا حصہ "کتابیات ۔ تصنیفات اسمتھ" ہے۔

ترجمے اچھے ہیں، حواشی عالمانہ ہیں اور فاضل مرتب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک حد تک اپنے استاد کا جو میرے بھی استاد رہے ہیں، حق ادا کیا ہے اگرچہ ایسے لتعمق اور طالب علم کے دل میں علم کا شوق پیدا کرنے والے استاد کا حق ادا نہیں ہو سکتا، میرا خیال ہے کہ اسلامک اسٹڈیز اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کے متعلق اردو ادبیات میں یہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہے (ضیاء الحسن فاروقی)

اسلام اور بدلتی دنیا

مصنف: ضیاء الحسن فاروقی
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
قیمت: اکیس روپے

پیشِ نظر کتاب ضیاء الحسن فاروقی کے ان اداریوں کا مجموعہ ہے جنھیں موصوف نے بحیثیت مدیر "اسلام اور عصرِ جدید" جنوری ۱۹۷۹ء تا جنوری ۱۹۸۲ء سپردِ قلم کیا ہے۔ ایک مضمون نگار کے برعکس مدیرِ رسالہ کو کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے وقت جن نزاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں سب سے مشکل کام اپنے موقف کو اس ڈھنگ سے پیش کرنا ہے جس میں کسی کٹر پن یا مخصوص مکتبِ فکر کی جھلک بھی نہ نظر آئے اور موضوع کے ساتھ انصاف کے ساتھ ساتھ اختصار کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس لحاظ سے ان مضامین میں اداریہ نگاری اپنے کمالِ فن کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

سولہ اداریوں کے اس مجموعے میں دو ذاتی نوٹ ہیں ـــ "مرحوم عابد صاحب" اور "کل من علیہا فان" جو مولانا مودودی پر ہے۔ چودھویں صدی، "اسلامی فنڈا منٹلزم"، "مسلمانوں کی اخلاقی حالت"، "اصلاح و تجدد کے حامی اور ان کی الجھنیں" اور "شریعت و وقت کے تقاضے" کے تحت لکھے گئے اداریوں کا مخاطب خود مسلمان ہیں۔

مسلمانوں کی اخلاقی حالت کے عنوان سے سپردِ قلم اداریے میں انھوں نے مسلم ملکوں کی باہمی رقابت، خودغرضانہ، قومی مفاد کی پاسداری، جھوٹی انانیت، اور اجتماعی غرور کی مضرت رسانیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑے ہی دردمندانہ لہجہ میں لکھا ہے کہ "مسلمانوں کے مقابلے میں ہم دیکھتے ہیں نہ تو مصائب و آلام سے ان کے دلوں کی تطہیر ہوتی ہے اور نہ خوش حالی اور فارغ البالی ہی سے ان کے اخلاق بہتر ہوتے ہیں۔ خدارا ہمیں کوئی سمجھائے کہ یہ معمہ کیا ہے..."

اصلاح و تجدد کے حامی اور ان کی الجھنیں کے موضوع پر بحث کو پروفیسر فاروقی نے دو اداریوں پر پھیلایا ہے۔ اس کے تحت محمد بن عبدالوہاب، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سرسید احمد خاں اور سر محمد اقبال کی اجتہادی کوششوں کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کی ناکامی کی وجوہات پر تبصرے کیے ہیں۔ پروفیسر فاروقی کا خیال ہے کہ ان جملہ تحریکات نے اسلام کے چوکھٹے میں جدید افکار کے لیے گنجائش نکالنے کی حمایت تو ضرور کی لیکن جدید افکار کو عملی سطح پر اسلامی اقدار میں اپنا لینے کے لیے جس مربوط نصابِ تعلیم کے پروردہ مردِ مومن کی ضرورت تھی وہ نصابِ تعلیم ہی وجود میں نہ آسکا۔ نتیجہ میں تجدد پسندی کے رجحانات سے متاثر ذہن یا احیائیت اور اساسیت کی راہ پر

چلے گئے اور معقول اور اعتدال پسند تجدد کی کوششیں بے اعتنائی کا شکار ہو کر رہ گئیں

پروفیسر فاروقی اُن چند مفکرین میں سے ایک ہیں جن کے خیالات میں ہمیں قدیم اور جدید دونوں نصاب تعلیم کا سراغ ملتا ہے۔ ان کے اندر اسلام کے بنیادی اقدار کی ہمہ گیری پر یقین، بدلتی دنیا میں پیدا مسائل کے حل پیش کرنے کی اسلامی صلاحیت پر مکمل بھروسہ اور اسلام کے ابدی اصولوں کی پاسداری کی جھلک ہے ان کا انداز بلندیوں سے بہنے والے پر شور اور تیز رو چشمے کا نہیں ہے۔ جو صرف دور ہی سے بھلا معلوم ہوتا ہے بلکہ میدانوں میں بہنے والی اس جوئے کم رفتار کا ہے جو لوگوں کو اپنے پاس بلاتی ہے اور سیراب ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ وہ اپنی بات کو مدھم لہجے میں لیکن ایسے مضبوط دلائل کے ساتھ اور اس خوش اسلوبی سے کہتے ہیں جو دل کو چھو لیتی ہے۔ وہ قاری کے سامنے ایک سوچا سمجھا حل نہیں پیش کرتے بلکہ مسئلے پر غور و فکر کے عمل میں اپنا شریک سفر کر لیتے ہیں اور جب منزل پر پہنچتے ہیں تو وہ منزل قاری کے لیے نئی جگہ نہ بن کر اس کی اپنی تلاش کی ہوئی منزل معلوم ہوتی ہے۔ معقول اور اعتدال پسند تعلیم یافتہ حلقوں میں یہ مجموعہ ضرور پسند کیا جائے گا۔

کتابت و طباعت کے اعتبار سے یہ ایک ستھری کتاب ہے اور قیمت بھی نہایت مناسب ہے۔

(شہاب الدین انصاری)

نغمۂ سرمدی

شاعر: نازش پرتاپ گڑھی
ناشر: بزمِ اردو، پرتاپ گڑھ
قیمت: دس روپے

اردو شاعری نے جذبۂ عقیدت اور قدرِ روحانیت پر ہمیشہ توجہ مرکوز رکھی ہے۔ قدیم شعرا اپنے کلیات اور دیوان کی اشاعت میں یہ اہتمام مدِ نظر رکھتے تھے کہ ابتدا میں حمد، نعت اور منقبت وغیرہ کو شائع کیا جائے اور بعد میں ان کا کلام۔ لیکن اب باطنی زندگی کو فروغ دینے والا نسخہ کیمیا جداگانہ طور پر شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری میں ایک صحت مند روایت اور انسانی قدر کی نشانی یہ ملتی ہے کہ اردو کا شاعر خواہ اس کا تعلق کسی عقیدے اور مذہب سے ہو، حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ وغیرہ مقدس اصناف پر بھی اپنے قلم کا جوہر دکھاتا رہا ہے۔ دوسری خوبی یہ کہ اردو کے نامور شعرا نے مذکورہ اصناف پر خلوص کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ اسی قبیل کی ایک مثال نازش پرتاپ گڑھی کا "نغمۂ سرمدی" ہے۔ اس کی اشاعت فخر الدین علی احمد میموریل اردو کمیٹی کے مالی اشتراک کا نتیجہ ہے۔

اس مجموعۂ نعت کے متعلق شاعر نے خود بیان کر دیا ہے: "احساس کی شدت، اظہار و بیان کا خلوص محبت و عقیدت اور ارادت کے حقیقی جذبات کی کمی ان شاء اللہ کہیں محسوس نہ ہو گی۔ میں نے سچائی اور سادگی کے ساتھ اور شرعی ہدایات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ادب اور احترام۔ درد و سوز کے ساتھ اپنے محسوسات اور جذبات کو اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

والی آسی نے اپنی رائے پیش کی ہے۔

"نعتیہ شاعری کی حدود شریعت نے متقرر کی ہیں اور ان حدود سے تجاوز" نیکی برباد گناہ لازم" کے مصداق ہے۔ مگر نازش پرتاپ گڑھی نے خود کو ان حدود میں پابند رکھ کر بھی نعت گوئی کا حق ادا کیا ہے۔"

ہمارے نزدیک "مدینے چلیں" سلام و پیام' اور بادۂ کوثر ایسی تخلیقات ہیں جن سے محفلِ میلاد میں نورانی فضا پیدا ہوگی۔

نغمۂ سرمدی کا صوری حسن بھی دیدنی ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

اسلامیات

مصنف : مالک رام
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۲۵
قیمت : ستائیس روپے

جناب مالک رام صاحب کی تازہ ترتصنیف "اسلامیات" ہے جو اصل میں اسلام سے متعلق بعض مخصوص موضوعات پر ان کے چند مضامین اور مقالوں کا مجموعہ ہے " لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ"، کے عنوان کے تحت ایک جگہ کیا خوب لکھتے ہیں۔

"عبادت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے، انسان صفات الٰہی کا اس درجہ تتبع کرے کہ خود ان کا مظہر بن جائے۔ ہم میں سے ہر ایک کسی خاص ماحول میں رہنے پر مجبور ہے۔ مختلف اوقات میں اس ماحول کے مقتضیات بھی مختلف ہوں گے۔ جو شخص کسی خاص حالت میں بطور رد عمل کسی صفت الٰہیہ کا سب سے زیادہ مظاہرہ کرتا ہے، وہ اتنا ہی اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب کر جائے گا اور اللہ سے رنگ میں بہتر کون ہوگا۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (۲ : ۱۳۸)" اسلامیات صفہ ۱۹

اسی مضمون میں ایک دوسری جگہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر مصابیح الاسلام کے مولف کا اعتراض نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ یہ اعتراض بہت لوگوں نے کیا ہے۔ الفاظ بدلتے رہتے ہیں لیکن مقصد سب کا یہی ہے کہ کلمے میں رسول کے نام کی شمولیت عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔ یہ ایک نوع کا شرک ہے (اسلامیات صہ ۲) پھر خود ہی اس اعتراض کو قلت تدبر کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے جواب دیتے ہیں۔

"کلمہ خدا یا اس کے رسول کو سنانے کے لیے نہیں پڑھا جاتا۔ بلکہ یہ اپنے ایمان اور اعتقاد کا اعلان ہے۔ کلمہ جزو عبادت نہیں بلکہ یہ صرف پڑھنے والے کی کیفیت اور جامعی تعلق کی شہادت ہے۔ جب کوئی آدمی لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے، تو وہ اس بات کا اشتہار دے رہا ہے کہ میں آج سے خدا کے سوائے کسی اور کو معبود سمجھوں گا نہ اس کی عبادت کروں گا۔

"خلق عظیم" نامی مقالہ میں "تکذیبِ انبیاء کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے عوامی نفسیات کا کتنا اچھا تجزیہ کیا ہے فرماتے ہیں

• دیکھیے یہود میں کتنے نبی آئے۔ قرآن کہتا ہے وقفینا من بعدہ بالرسول (۲: ۸۷) لیکن انھیں کی طرف جب حضرت مسیح ناصری علیہ السلام آئے تو ان کی اکثریت ان کی شناخت اور ان پر ایمان لانے سے محروم رہ گئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کا حضرت موسیٰ اور ان کے بعد کے انبیاء پر ایمان محض رسمی اور آبائی تقلید کا نتیجہ تھا۔ نہ کہ ان کے اپنے غور وفکر اور انشراح صدر کا چنانچہ جب کچھ وقفے کے بعد ایک نیا نبی ان کے سامنے آیا تو وہ اُسے پہچان نہ سکے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جن انبیاء پر وہ ایمان کے دعویدار تھے اگر وہ بھی ان کے زمانے میں مبعوث ہوئے ہوتے تو وہ ان کو بھی نہ پہچان سکتے اور ان پر بھی ایمان نہ لاتے اور ان کی بھی تکذیب کر دیتے گویا ان کی ایک نبی (حضرت مسیح) کی تکذیب نے ثابت کر دیا کہ وہ سارے نبیوں کے مکذب ہیں۔ (اسلامیات ص۸۶)

اس کتاب کے دوسرے مضامین میں بھی جناب مالک رام صاحب نے کافی حق تحقیق ادا کیا ہے۔ خصوصاً وہ مقالہ بڑا معرکتہ الآرا ہے، جو "عورت مذاہب عالم میں" کے زیر عنوان سپرد قرطاس کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس مقالہ کا عنوان ہے۔ انھوں نے ہندو دھرم کی معتبر کتابوں کے علاوہ یہود و نصاریٰ کی کتابوں یعنی عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید سے جگہ جگہ تقابل کر کے بتایا ہے کہ اسلام میں عورت کا مقام کتنا اونچا ہے ایک سے زیادہ شادیوں کے بارے میں اسلامی تعلیم کیا ہے۔

"بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام میں لونڈیوں کو نکاح کے بغیر بیوی کی حیثیت سے رکھ لینے کی اجازت ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ قرآن نے کسی جگہ نکاح کے بغیر کسی عورت کو بیوی کے طور پر رکھنا جائز نہیں ٹھہرایا ہے اگر عورت مسلمان ہے تو اس کے لیے حکم دیا کہ (ان محرمات کے علاوہ) تمام عورتیں تم پر حلال ہیں بشرطیکہ ان سے نکاح ہو نہ کہ شہوت رانی اور جب ان سے نکاح کرو تو ان کے مہر انھیں ادا کر دو۔ اگر مومنہ لونڈی ہو تو کہا، اگر تم میں سے کسی کو آزاد مومنہ عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہ ہو تو پھر وہ ان مومنہ لونڈیوں سے نکاح کرے جن کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔"

اس سلسلہ کی چند اور آیتیں درج کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"غرض کہ اسلام لونڈیوں سے بھی نکاح کا حکم دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ انھیں نکاح کے بغیر بطور بیوی رکھ لیا جائے۔ جیسا کہ ویدک دھرم اور یہودیت کا قانون ہے۔"
(اسلامیات ص۱۵۹)

اس کتاب میں کتنے ہی ایسے مقامات ہیں جو توجہ اور دلچسپی سے پڑھنے کے لائق ہیں۔
(سید خدا بخش خوندمیری)

بچّوں کا ادب

قصرِ جوش

شاعر و ناشر: جوش ادیب
ملنے کا پتا: مکتبہ فخر ۲۵/۳ جوشی پیٹھ۔ جلگاؤں
قیمت: دس روپے

جوش ادیب نے بچوں کے لیے نظمیں کہی ہیں وہ مختلف رسائل میں چھپتی رہی ہیں۔ اب انھوں نے اپنی نظموں کا مجموعہ "قصرِ جوش" کے نام سے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر نسیم فہمی، ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا اور ڈاکٹر افتخار احمد فخر نے قصرِ جوش اور جوش ادیب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔
اس مجموعے میں فطری مناظر کے علاوہ ہندستان کی نامور شخصیات پر نظمیں شامل ہیں بعض منظوم کہانیاں اور منظوم لطائف اس مجموعے کی خوبی میں اضافے کا سبب ہیں۔ اخلاقی نظمیں بھی ہیں۔ شاعر کو سائنسی موضوعات پر توجہ کرنی چاہیے۔ آج کے بچوں کی اس ضرورت کو پورا کرنا ہماری شاعری کا پہلا کام ہے۔
شاعر کی نظموں میں کتاب، وقت، جنرل معلومات وغیرہ عمدہ نظمیں ہیں۔ رشتہ داروں کے لیے منظوم خطوط نئی چیزیں ہیں۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

رنگا رنگ

مصنف: محبوب راہی
پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
قیمت: سات روپے

محبوب راہی عام طور پر غزل کے شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں حالاں کہ وہ مذہبی نظمیں اور مزاحیہ چیزیں بھی لکھتے ہیں۔ تنقیدی مضامین بھی قلم بند کرتے ہیں۔ نیز خواتین اور بچوں کے لیے بھی شعر کہتے ہیں۔ بچوں کی نظموں پر مشتمل ان کی کتاب "رنگا رنگ"، مہاراشٹر اردو اکیڈیمی کی مالی معاونت سے شائع ہوئی تو چند ماہ کے اندر اس کے تین ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ نونہالوں میں اس کی مقبولیت کا اندازہ مجھے بھی ہوا۔ میرے کمسن بیٹے عرفان مظفر نے جب تک اس کا جی بھر کر مطالعہ نہیں کر لیا۔ یہ کتاب میری میز سے غائب رہی۔ محبوب راہی تخلیق کار بھی ہیں اور ابتدائی درجات کے مدرس بھی۔ کتاب میں ان کی دونوں حیثیتوں سے بھرپور استفادے کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ ہر نظم میں تخلیقی شان اور ادبی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ نوعمر بچوں کو لبھانے والے موضوعات، آسان زبان، سادہ اندازِ بیان اور بالواسطہ سبق آموز پیرائے ملتے ہیں۔ راہی کی ان تخلیقات میں خاص طور پر مجھے "اللہ میاں"، "ماں کے قدموں میں"، "آزادی کا جشن"، "چڑیا رانی"، اور "میں کیا نہیں کر سکتا" بہت پسند آئیں۔ کتاب با تصویر ہے اور اس کی تزئین میں مشہور مصور تشکیل اعجاز کی معاونت شامل ہے (ڈاکٹر مظفر حنفی)

دوست

مترجم: تسکلنتلا کشوایا
ناشر: دارالاشاعت ترقی ماسکو
قیمت: ندارد

"سوویت یونین" میں بچوں کی ذہنی اور جسمانی پرداخت، تربیت اور ترقی پر جتنا زور دیا

جاتا ہے وہ قابلِ رشک کارنامہ ہے۔ بچوں کا صحت مند ادب سوویت ری پبلک سے شائع ہوتا ہے۔ تمام ری پبلکوں کے بچے چھوٹی چھوٹی سائنسی کہانیاں پڑھتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ ادب کی پیشکش سائنسی نقطۂ نظر کے تحت کی جاتی ہے۔ اس میں نئے دور کی اقدار کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

"ماسکو دارالاشاعت ترقی" ایک نیاض اور منفعت بخش ادارہ ہے جو بچوں کا دلچسپ اور افادی ادب شائع کرتا ہے۔

"سورج ہمیشہ چمکتا رہے" اسی ادارے کا ایک نیا باتصویر سلسلہ ہے اس کی پہلی کتاب "دوست" شائع ہوئی ہے جس میں سوویت ری پبلکوں کے بچوں کی کہانیاں تصویروں کی زبانی پیش کی گئی ہیں اختصار اور دلچسپی اہم عناصر ہیں۔

رنگین تصویریں الکسنیف اور گرشین جیسے معروف مصوروں کے موقلم کی تیار کردہ ہیں۔ ان مصور کہانیوں سے دنیا کے بچوں کو معلوم ہوگا کہ سوویت یونین میں بچے کیسے رہتے ہیں۔ ان کے والدین کیا کرتے ہیں۔ ان بچوں کے مشاغل کیا ہیں۔ آرام اور تفریح کا سامان کیا ہے اور کون سا وقت وہ ان امور کے لیے وقف رکھتے ہیں۔ بچوں کی دوستی کا پیمانہ کیا ہے اور کس کس سے دوستی کا رشتہ قائم رکھتے ہیں۔

بچوں کی یہ رنگین کتاب اردو ٹائپ میں چھپی ہے۔ جلد مضبوط اور خوب صورت پلاسٹک کی ہے۔

(ڈاکٹر سیفی پریمی)

نیلا ہیرا

مصنف: ڈاکٹر مظفر حنفی
ناشر: مکتبہ پیامِ تعلیم جامعہ تعلیم نئی دہلی ۲۵
قیمت: ساڑھے چار روپے

مجھ سے اس کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ حالاں کہ میں بچوں کے ادب کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں۔ ہاں بچوں کی بے ادبی پر گہری نظر رکھتا ہوں۔ استاد جو ٹھہرا۔ خیر کچھ تو کہنا ہی ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب جو اس کتاب کے مصنف ہیں انھیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں بلکہ ان کے ذریعے مجھے خود اپنے تعارف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مظفر صاحب جہاں اردو کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ وہیں انھیں بچوں کا ادیب اور شاعر کہنے میں مجھے کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔

انھوں نے یہ کہانیاں چودہ سے انیس ۱۹ سال کی عمر میں لکھی تھیں۔ اتنی کم عمری میں لکھنے کے باوجود یہ کہانیاں زیادہ عمر کی معلوم ہوتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں ۱۴ کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں دیو اور پریوں کی کہانیوں سے ہٹ کر ہیں ان کے کردار ہماری دنیا کے جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں۔ ان کو ہم اپنے ارد گرد محسوس کر سکتے ہیں کہانیاں دلچسپ ہیں۔ ان کو پڑھنے میں برابر دلچسپی قائم رہتی ہے۔ جب تک کتاب ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کتاب کو پڑھ کر بچے لطف اندوز بھی ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس کریں گے کہ یہ کہانیاں خود ان کی اپنی ہیں۔

جس کہانی کے نام پر اس کتاب کا نام ہے وہ نیلا ہیرا ہے۔ یہ بہت اچھی کہانی ہے۔ ان کہانیوں کے اندر کیا ہے۔ یہ آپ خود پڑھیں۔ اگر میں نے بتا دیا تو آپ کو پڑھنے میں کیا لطف آئے گا۔

(محمد یوسف پاپا)

بچو! آؤ گیت سنائیں

شاعر: نذیر فتح پوری
پتا: حکیم رازی ادبی۔ اساق پبلیکیشنز پونہ نمبر ا
قیمت: تین روپے

نذیر فتح پوری ادبی دنیا میں خاصی معروف و مقبول ہستی کا نام ہے۔ ان کی ادبی فتوحات کا دائرہ بھی خاصا وسیع ہے۔ وہ بیک وقت ایک کامیاب ناول نگار بھی ہیں۔ ایک قابلِ قدر شاعر بھی اور ایک بیدار مغز ادیب و صحافی بھی۔ بچو! آؤ گیت سنائیں کے وسیلے سے اب وہ بچوں کے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف ہوتے ہیں۔ میدان شعر و ادب میں بالعموم تخلیق کار اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کرتے ہیں اور چند منزلیں طے کرنے کے بعد اپنی سمت سفر تبدیل کر کے نئی نئی بلندیاں سر کرنے اور نئی نئی جہتوں کی کھوج میں اشہب قلم کو دوڑانے لگتے ہیں۔ نذیر فتح پوری کا معاملہ اس کے برخلاف ہے۔ وہ پہلے دو شاہ کار ناول، کئی افسانے اور مضامین کے ذریعے اپنی فن کارانہ شناخت مستحکم کرانے کے بعد اپنے اشہب فکر کی باگ شاعری کے سبزہ زاروں کی جانب موڑ کر آج ایک باشعور شاعر کی حیثیت سے اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ ہندستان کے بیشتر رسائل و جرائد میں مختلف اصناف سخن پر مشتمل ان کی شعری تخلیقات آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی شعری اور سماجی معنویت سے معمور پابند اور آزاد غزلوں نظموں کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے بھی قابل قدر شعری ادب تخلیق کیا ہے۔ حال ہی میں ان کا بچوں کی دلکش، مترنم سبق آموز، اخلاقی اور حب الوطنی کے پاکیزہ جذبوں سے معمور نظموں کا مجموعہ بچو! آؤ گیت سنائیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ سادہ لیکن خوش رنگ، دیدہ زیب اور معنی خیز سرورق میں لپٹے ہوئے خوب صورت، بے داغ اور روشن کتابت و طباعت کی خوبیوں سے آراستہ مختصر مجموعے میں نذیر فتح پوری کی ۲۸ سدا بہار نظمیں بکھری ہوئی ہیں۔ پونہ کے ہونہار آرٹسٹ رشید اعجاز نے ہر صفحہ پر نظموں کی مناسبت سے انتہائی دلکش، برجستہ اور معنی خیز تصویریں اور خاکے بنا کر ہر نظم کی معنویت میں اضافہ کر دیا ہے۔

بچوں کے لیے لکھنا بظاہر جس قدر آسان ہے درحقیقت اتنا ہی مشکل بھی ہے کہ اس کے لیے اپنی سطح سے نیچے اتر کر بچوں کی نفسیات اور ان کے فطری تقاضوں سے کماحقہ آگاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اس افسوس ناک اور مسلّمہ حقیقت کے سبھی معترف ہیں کہ اردو میں بچوں کے لیے بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی بچوں کے معیار سے کم مطابقت رکھتا ہے۔ مشہور و معروف ادبا و شعرا میں جن لوگوں نے اس انتہائی اہم صنف کی طرف توجہ دی ہے اس کے نام انگلیوں پر شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اقبال، اسماعیل میرٹھی، افسر، حالی، سلیم اور شفیع الدین نیر کے بعد جن فن کاروں

نے ملک وملت کے نونہالوں کی ذہنی واخلاقی تربیت کی انجام دہی کے لیے اپنی فکری کاوشوں اور ذہنی صلاحیتوں کا بیشتر حصہ وقف کر رکھا ہے ان میں نذیر فتح پوری کو نمایاں مقام حاصل ہے جس کا دستاویزی ثبوت ان کا زیرِ تبصرہ مجموعہ ہے۔ بچوں کے لیے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس میں شامل نظموں کے عنوانات ہی سے لگایا جا سکتا ہے مثلاً دعا' ماں کا پیار' علم کی حقیقت' بھائی چارے کا گیت چھبیس جنوری' ہم پر وطن کو ناز ہے۔ بچو! آؤ گیت سنائیں۔ حوصلہ' جیسے جاؤ۔ عید آئی ہے۔ دوالی کی رات' ہولی آئی۔ ہمارا جھنڈا وغیرہ۔ ان میں بالخصوص "بچو! آؤ گیت سنائیں۔ قلم کی کہانی اور نیا عہدنامہ' زبان کی سلاست' انداز بیان کی دلکشی خوش آہنگی اور تازگی کی بنا پر ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

اس کتاب میں شامل اپنے پیش لفظ میں عبدالمجید سرور نے نذیر فتح پوری کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔" جناب نذیر فتح پوری کی نظمیں آفاقی حسن کا مظہر ہیں۔ بچوں کی زبان میں دلکش انداز بیان اور سلیس وسادہ ترسیل کا حیرت انگیز استعمال نذیر کی صلاحیتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بچوں کی گانے والی فطرت سے واقفیت کا نتیجہ ہے کہ کتاب میں جابجا وہ بحور و اوزان پائے جاتے ہیں جنھیں آسانی سے گایا جا سکتا ہے۔

اور عتیق احمد عتیق نے نذیر فتح پوری کا تعارف پیش کرتے ہوئے رائے دی ہے کہ۔

بچو! آؤ گیت سنائیں کی منتخب اور مفید نظموں کو داخل نصاب نہ کیا گیا تو یہ نہ صرف نذیر فتحپوری کے ساتھ بلکہ ان بچوں کے ساتھ بھی ناانصافی ہوگی جن کے لیے نہایت فکر و کاوش سے اس میں شامل نظمیں کہی گئی ہیں۔

میں ان مستند اور ناقابلِ تردید آرا کی تائید کرتے ہوئے ملک کی ہر چھوٹی بڑی لائبریری اور سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی اداروں کے علاوہ ہر طالبِ علم کے پاس نصابی کتابوں کے ساتھ اس مفید اور اہم کتابچہ کی شمولیت ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کی قیمت بھی اس ہوش ربا گرانی کے دور میں ہر کس و ناکس کے لیے قابل برداشت گویا نرخ بالاکن کہ ارزانی ہنوز" کی مصداق ہے۔ (محبوب راہی)

اردو شناسی

مؤلف: ڈاکٹر فضل امام
ناشر: مسکین بک ڈپو، موتی ڈونگری روڈ۔ جے پور
قیمت: ایک روپیا پچاس پیسے

یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۳۲ صفحات پر محیط ہے۔

طلبہ اور طالبات کے لیے یہ ایک عمدہ معلوماتی کتاب ہے۔ اس کتاب کے ڈھائی ہزار الفاظ یکجا کر دیے گئے ہیں۔ جو مختلف صوت و آہنگ پر قائم ہیں۔ ان الفاظ کی مشق و ریاض سے صحیح لکھنا آ جائے گا اور املا کی غلطیاں سرزد نہیں ہوں گی۔

یہ حقیقت ہے کہ آج تعلیم کا معیار اس قدر گر گیا ہے کہ اردو کا مستقبل تابناک ہوگا کہ تاریک یہ کہنا مشکل ہے۔ اردو ایک حقیر زبان خیال کی جاتی ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو پڑھنا وقت ضائع کرنا ہے۔ حالاں کہ ان کی خام خیالی ہے کج روی ہے۔ زبان کوئی بھی ہو۔ اس کی اہمیت

افادیت مسلّمہ ہے۔ دوسری طرف لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو مادری زبان ہے۔ یہ بالکل آسان و سہل ہے۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ اردو زبان کئی زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ اس کے خمیرا در ہیولیٰ میں مختلف مقاموں اور ملکوں کے آب و گل کی آمیزش ہے۔ یہ مختلف زبانوں کی ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کی چمن سازی میں عربی، فارسی، ہندی انگریزی اور پالی اور پراکرت سب زبانوں سے خوشہ چینی کی گئی ہے۔ لہٰذا اس میں متنوع صورت حال اور صوت و آہنگ کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ مختلف حروف اور الفاظ میں یکسانیت ومماثلت ہوتے ہوئے بھی الفاظ اور تلفظ میں فرق ہے۔ طلبہ اور طالبات لفظوں کے صحیح تلفظ اور آوازوں کے اتار چڑھاؤ یا ہلکے پن اور بھاری پن پر ذرا بھی دھیان نہیں دیتے۔ لفظی صوت و آہنگ کیا چیز ہے کچھ پتا نہیں۔ یہی سبب ہے کہ طلبہ املا میں غلطی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس خامی اور کمزوری کو رفع کرنے کی غرض سے فضل امام صاحب نے ہر رنگ و آہنگ کے الفاظ کی ایک کثیر تعداد اس کتاب میں جمع کر دی ہے تاکہ الفاظ کی شناخت کی جائے۔ اس قدر الفاظ کی شناختی اور ذہن نشینی سے غلطیاں سرزد ہونے کے امکانات کم ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر فضل امام صاحب نے وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کیا ہے۔ اس کتاب سے اردو شناسی میں مدد ملے گی۔ یہ ایک مفید اور کارآمد کتاب ہے اسکول اور مدرسہ کے نصاب میں اس کتاب کو ضرور شامل کرنا چاہیے۔ (ڈاکٹر سید غلام مرتضیٰ)

اندرا گاندھی کی کہانی

مصنف : شمیم حنفی
ناشر : مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
قیمت : چار روپے پچاس پیسے

شمیم حنفی قبل ازیں بچوں کے لیے غالب اور جواہر لال نہرو کی سوانح عمریاں آسان زبان میں لکھ چکے ہیں۔ ہندستان کی محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی المناک موت کے بعد اُن کے حالاتِ زندگی اور کارناموں پر مشتمل بہت سی کتابیں بڑوں کے لیے لکھی گئیں تو مکتبہ پیام تعلیم نے بطور خاص فرمائش کرکے یہ کتاب بچوں کے لیے شمیم حنفی سے لکھوائی جس میں اندرا گاندھی کی پیدائش سے موت تک کے اہم واقعات عام فہم لیکن دلکش انداز میں اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ ان کی شخصیت اور حیات کا روشن خاکہ بچوں کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ امید ہے شمیم حنفی بچوں کے لیے دیگر قومی رہنماؤں پر بھی ایسی کتابیں لکھیں گے۔ کتاب اندرا گاندھی سے متعلق بہت سی تصویروں سے مزیّن ہے۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

متفرقات

تاریخ کے آنچل میں

مصنف : رفعت سروش
ناشر : نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
قیمت : پندرہ روپے

رفعت سروش کثیر الجہات فنکار ہیں، شاعری ان کے تخلیقی کارناموں کی مرکزی جولانگاہ ہے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین اور شخصی خاکے بھی لکھے ہیں، افسانے اور غنائی فیچر بھی نیز ان کے آپیرا اور ڈانس ڈراموں نے بھی خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ موصوف کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں تازہ ترین ہے "تاریخ کے آنچل میں" جس میں رفعت سروش کا اوپیرا "حبہ خاتون" اور ڈانس ڈراما "جہانگیر" شامل کیے گئے ہیں۔

اوپیرا منظوم ڈرامے کی ایک شکل ہے اور اپنے اندر خاصی نزاکتیں رکھتی ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے محض شاعر کی قدرت کلام ہی کافی نہیں اس میں مکالموں کی برجستگی کردار سازی پر قدرت، موسیقی سے شناسائی اور اسٹیج کے تقاضوں کا لحاظ بھی رکھنا ہوتا ہے اور رفعت سروش نے یہ فنی مطالبات پورے کیے ہیں۔ حبہ خاتون کشمیر کی مشہور شاعرہ، جس نے شہنشاہ اکبر کے دور میں اپنے تخلیقی جوہر کے اظہار سے کشمیری عوام کا دل جیت لیا تھا، اس اوپیرا کی مرکزی کردار ہے اور اس نازک مزاج شاعرہ کے خارجی ماحول نیز باطنی سوزش کی تصویر کشی میں رفعت سروش نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے۔ بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ "حبہ خاتون" اردو کے قابل ذکر اوپیراؤں میں سے ایک ہے۔

کتاب کی دوسری تخلیق "جہانگیر" بھی مغلیہ عہد کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے اس ڈانس ڈرامے کا مرکزی کردار شہنشاہ جہانگیر ہے جس میں اس جلیل القدر بادشاہ کی پیدائش، جوانی میں اس کی رنگین مزاجی، انارکلی سے عشق، نورجہاں سے والہانہ محبت، شیر افگن کے قتل کے بعد اس سے شادی کے واقعات ڈرامائی انداز میں پیش کیے گئے ہیں پھر نورجہاں کے تیر سے ایک دھوبی کی جان جانے اور اسی ضمن میں جہانگیر کے بے مثال عدل و انصاف کی داستان ایسے دلچسپ منظوم بیانات اور مکالموں کی صورت میں پیش کی گئی ہے کہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے تاریخ اور شاعری کو موسیقی سے ہم آہنگ کرکے رفعت سروش نے اپنی اس تخلیق کو ایک منفرد ذائقے سے مملو کر دیا ہے جس میں بیانیہ شاعری کا بہاؤ، زبان کی سلاست، لہجے کی تازگی اور تخلیقی توانائی سبھی کا نہایت خوشگوار امتزاج ہے۔

اس کتاب کے پہلے حصے "حبہ خاتون" کا پیش لفظ پروفیسر محمد حسن نے اور مقدمہ قیصر قلندر نے لکھ کر رفعت سروش کی تخلیقی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے دوسرے حصے "جہانگیر" کا تجزیاتی مطالعہ بھی شامل ہے جو ڈاکٹر خلیق انجم کے قلم سے نکلا ہے۔

بحیثیت مجموعی کتاب اس لائق ہے کہ اردو حلقے اس کی پرجوش پذیرائی کریں۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

ماہ نامہ اسباق (پونہ)

(سالِ اوّلین نمبر)

ادارت: حکیم رازی، نذیر فتح پوری، سید آصف
پتا: ۵۷۲۔ ساچاپیر اسٹریٹ، پونہ نمبر ۲
قیمت: ۳۵ روپے

جذبے صادق ہوں، ارادے مستحکم ہوں۔ دلوں میں ایثار و خلوص کی کارفرمائی اور کچھ کر دکھانے کی لگن ہو تو آج بھی معجزے سرزد ہو سکتے ہیں۔ ثبوت کے لیے ماہ نامہ اسباق کا سالِ اوّلین نمبر پیش کیا جا سکتا ہے۔

حالات کی نامساعدت، وسائل کے فقدان، اربابِ اردو کی مجرمانہ سرد مہری، اربابِ اقتدار کی بے اعتنائی اور اپنی بے سروسامانی کے باوجود ادبی مراکز سے دور مرا ٹھی کے گڑھ شہر پونہ کے کچھ سر پھروں نے جرأت سے کام لیتے ہوئے گزشتہ سال اردو کے ادبی رسالے اسباق کا اجرا کر ڈالا۔ اس تلخ حقیقت سے آگہی کے باوجود کہ یہ گھر پھونک کر اجالے پھیلانے والا عمل ہے اور اچھے اچھے سورما اس میدان سے ہزیمت اٹھا کر راہِ فرار اختیار کر چکے ہیں۔ بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑنے والے ان عشاقِ صادق میں اسباق کے سرپرست حکیم رازی ادیبی اور مدیران نذیر فتح پوری اور سید آصف کے علاوہ ان کے رفقائے کار نے اپنی انتھک جدوجہد اور شبانہ روز کاوشوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اسباق کا ایک سالہ طویل اور دشوار گزار سفر طے کر لیا اور اب ایک مجاہدانہ شان کے ساتھ اردو دنیا کے سامنے سالِ اوّلین نمبر کی صورت میں رنگا رنگ، بیش بہا، بے مثال اور باوقار ادبی دستاویز پیش کر کے تاریخِ ادب و صحافت میں اپنے نام جلی حروف میں لکھوا لیے ہیں۔

جذبۂ ایثار سے سرشار اردو کے ان متوالوں نے اس خاص نمبر کو منفرد ترین انداز میں سجا سنوار کر پیش کرنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے ہوں گے۔ کتنی راتوں کی نیندیں حرام کی ہوں گی۔ سرمایہ کثیر کی فراہمی کے لیے کیا کیا جتن کیے ہوں گے۔ کتابت و طباعت کی دشوار گزار اور پُر خار گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے اپنے تلوؤں کو کس قدر لہولہان کیا ہوگا۔ کوئی انھیں کے دلوں سے پوچھے۔

شعر و ادب کی تقریباً تمام اصناف پر مشتمل ہر صنف کے معروف ترین۔ نسبتاً کم معروف اور ابھرتے ہوئے فن کاروں کی تخلیقات اراکینِ اسباق نے جس عرق ریزی اور ذہن دہی کے ساتھ یکجا کر کے ترتیب دی ہیں۔ اس سے کچھ زیادہ محنت لگن اور توجہ رسالے کی تزئین کاری میں دکھائی ہے جو پونہ کے ہونہار آرٹسٹ رشید اعجاز کے فن کی مرہونِ منت ہے۔

درج ذیل اوصاف کی بنا پر اسباق کا یہ خاص نمبر رسائل کے خاص نمبروں کی بھیڑ بھاڑ میں منفرد اور ممتاز دکھائی دیتا ہے۔

۱۔ ایک دو چھوڑ اردو ادب کی تمام مروجہ اصناف کے لیے حسبِ مقدور گنجائش نکالی گئی ہے۔ ۲۔ ہر صنفِ شعر و ادب کے لیے نہ صرف یہ کہ الگ الگ ابواب متعین کیے گئے ہیں بلکہ ہر باب کے ساتھ چکنے اور دبیز آرٹ پیپر پر رنگین دیدہ زیب اور معنی خیز سرورق بھی لگایا گیا ہے۔ ۳۔ ہر تخلیق کے ساتھ تخلیق کار کی تصویر آرٹ پیپر پر چھاپی گئی ہے۔ ۴۔ ہر صفحہ کو رنگین اور دلکش ڈیزائن کے بارڈر سے طغرے کی طرح سجایا گیا ہے۔

لگ بھگ ..۴ صفحات پر محیط تخلیقات میں حمد و نعت بارہ ۱۲، ان سے متعلق ایک مضمون۔ آٹھ

تحقیقی مقالے، ۳۲ آزاد اور پابند نظمیں۔ ۸۳ اسی غزلیں۔ ایک آزاد غزلیں۔ آزاد غزل پر تین مضامین بشمول شعراء کی رباعیات۔ قطعات اور ثلیثیات سے متعلق دو سیر حاصل تبصرے۔ دس مختلف زبانوں کی تخلیقات کے ترجمے۔ فن ترجمہ سے متعلق دو مقالے یا دداشتوں پر مبنی دس مشاہیر اہل قلم کی آپ بیتیاں۔ فن اور شخصیت سے متعلق سات طویل مقالے اور بارہ کتابوں پر تبصروں کے علاوہ مختلف یادگار تصویریں اس خاص نمبر کی زینت ہیں۔

رہا سوال معیار کا تو میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر کے ان صف اول کے فن کاروں کے نام ہی رسالے کے معیار کی ضمانت قرار دیے جاسکتے ہیں جن کی تخلیقات اس خاص نمبر کے وقار میں اضافے کا موجب ہیں۔ ان میں بالخصوص ڈاکٹر وزیر آغا۔ انتظار حسین۔ رشید امجد۔ مصطفےٰ زیدی۔ مظفر حنفی، عصمت جاوید۔ راجندر سنگھ بیدی۔ حرمت الاکرام۔ رام لال۔ جوگندر پال۔ رزاق دکنی۔ کالی داس گپتا رضا۔ دیویندر اسر۔ فضا ابن فیضی باقر مہدی۔ فضیل جعفری۔ ندا فاضلی۔ ماجد الباقری۔ بشیر بدر۔ عروج زیدی۔ خلیق اللہ شاکر۔ پروین شاکر۔ عنوان چشتی۔ مظہر امام۔ جگن ناتھ آزاد۔ عبدالرحیم نشتر۔ شاہد کبیر۔ پرکاش پنڈت۔ یوسف ناظم کے نام قابل ذکر ہیں۔

میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا خوب صورت۔ اتنا دلکش، اس درجہ منفرد اور اس قدر دلچسپیوں کا حامل کسی اور اردو رسالے کا خاص نمبر آج تک میری نظر سے کم ہی گزرا ہے۔ ممکن ہے اوروں کی بھی یہی رائے ہو۔

مواد، معیار اور رسالے کی لاگت کے پیش نظر قیمت ۳۵ روپے مناسب ہے۔ (محبوب راہی)

"ماہنامہ "روشن"
(فانی بدایونی نمبر)

مدیر: شمس بدایونی
ناشر: ادارہ "روشن" سوتھ، بدایوں
قیمت: دس روپے

فانی ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو قصبہ اسلام نگر ضلع بدایوں میں پیدا ہوتے تھے۔ اس طرح ان کی پیدائش کو ۱۳ ستمبر ۱۹۷۹ء میں پوری ایک صدی ہو گئی۔ اور اس صدی کی تقریب منانے کے لیے ہندستان کے مختلف حصوں میں سیمینار کیے گئے۔ مباحثے ہوئے اور مقالے پڑھے گئے۔ فانی کی غزلیہ شاعری کا عرفان حاصل کرنے کے لیے ان سب کا مطالعہ ادب کے طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ اس سے قبل بھی ڈاکٹر مغنی تبسم اور دوسرے اسکالر بھی فانی پر تحقیقی کام کر چکے ہیں۔ فانی کے مجموعۂ کلام یعنی دیوان فانی" (نقیب پریس بدایوں ۱۹۲۱ء" "باقیات فانی" (آگرہ اخبار پریس آگرہ ۱۹۲۶ء) "عرفانیات فانی" (لطیفی پریس دہلی ۱۹۳۸ء) اردو غزلیات (مع فارسی بطور ضمیمہ)" "وجدانیات فانی" (مطبع دارالکتاب دکن ۱۹۴۰ء) "کلیات فانی (مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۶۲ء مرتبہ حیرت بدایونی) شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ فانی کی شاعری پر تنقیدی کتابوں اور مضامین کا بھی ایک انبار ہے۔ جس میں ڈاکٹر مغنی تبسم کی کتاب " فانی بدایونی شخصیت اور شاعری سر فہرست ہے۔

فانی کا یوم پیدائش تقریب منانے کے لیے پروفیسر آل احمد سرور نے مرکزی انجمن ترقی اردو

دہلی میں ایک تجویز پیش کی کہ ہندستان کے مختلف شہروں میں اس موقع پر جشنِ فانی منایا جائے۔ سمینار منعقد ہوں، مقالات پڑھے جائیں اور مشاعرے ہوں اور فانی کی شاعری کے مختلف پہلو اجاگر کیے جائیں۔ پروفیسر سرور کی یہ تحریک کامیاب رہی اور اس سلسلہ میں سری نگر (کشمیر)، مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) جامعہ ملیہ (دہلی) اور حیدرآباد (آندھرا پردیش) میں کامیاب سمینار ہوئے۔ مقالات پڑھے گئے اور فانی کی شاعری کے مختلف پہلو اجاگر کیے گئے۔ بدایوں میں اس سلسلہ میں اب تک اس نوعیت کا کوئی سمینار نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن رسالہ "روشن" بدایوں نے اپنے رسالے کا "فانی نمبر" شائع کرکے اس کمی کو ایک حد تک پورا کر دیا ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر سرور کی تحریک پر ترقی اردو بورڈ (دہلی) ایک جامع کتاب شائع کرے گا لیکن اس کے منظر عام پر آنے کے لیے ابھی کچھ وقت درکار ہے۔ علی گڑھ میگزین کا "فانی نمبر" اور "شاعر (آگرہ)" کا فانی نمبر اب پرانے ہو چکے ہیں۔ گزشتہ چالیس سال میں اردو تحقیق و تنقید نے ارتقا کی کافی منزلیں طے کی ہیں اور ان سب کا احاطہ کرنے اور ساتھ ہی فانی سے متعلق ایک جامع کتابیات مرتب کرنے کا ارادہ تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ شمس بدایونی مرتب (فانی نمبر" بدایوں) نے انتہائی کاوش کے بعد ان سب چیزوں کو "فانی نمبر" میں یکجا کر دیا ہے۔ روشن کے "فانی نمبر" کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فاضل مدیر نے فانی کی شاعری کے ہر پہلو کو مدنظر رکھا ہے۔ اور ان مضمون نگاروں کے جنھوں نے فانی کی شاعری کے تاریک پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے نظرانداز نہیں کیا۔ چنانچہ میرے اس دعوے کی تصدیق ڈاکٹر نصیح احمد کے مضمون "فانی کے ناکامی کے اسباب" سے ہو سکتی ہے۔ اس نمبر میں فانی کی شاعری کے متعلق جو مضامین قابلِ توجہ ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

۱۔ برادرزادہ فانی کا ایک مکتوب۔ از فراست علی خاں۔ ۲۔ فانی کے انتقال کے چار دن بعد از اختر انصاری۔ ۳۔ تذکرہ فانی۔ از ایوب قادری۔ ۴۔ فانی کا نقطۂ منظر رباعیات کی روشنی میں از انصار اللہ۔ ۵۔ قید حیات بند غم از ڈاکٹر ذکاء الدین شایاں ہیں۔ حصہ نظم میں حکیم مختار احمد مختار کی نظم۔ "فانی کے جشن صد سالہ پر" اور اظہر کمال کی نظم۔ "لے کے گلہائے عقیدت تیرے مجرم آئے ہیں" اچھی ہیں اور قارئین کو پڑھنے کی دعوت دیتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ روشن کے اس "فانی نمبر" کے کچھ مضامین اگر ایک کتابی شکل میں شائع کر دیے جائیں تو وہ نہ صرف فانی پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے بلکہ عام قاری کے لیے بھی یہ مجموعہ مفید ثابت ہوگا لیکن جہاں پھول ہیں وہاں کانٹے بھی اس نمبر کی کتابت و طباعت جس معیار کی ہونا چاہیے تھی ویسی نہ ہو سکی۔ خصوصاً اظہر کمال کی نظم اس کا بری طرح شکار ہو گئی ہے۔ ایک زمانہ میں نظامی پریس بدایونی کی طباعت اردو والوں کے لیے بطورِ نمونہ پیش کی جاتی تھی۔ لیکن آج کل اس کا معیار کیا ہے۔ یہ ایک سوالیہ نشان ہے اور اس نمبر کی کتابت و طباعت خوش قسمتی یا بدقسمتی سے وہاں ہوئی ہے۔ اگر کتابت و طباعت بھی اچھی ہوتی تو اس نمبر میں چار چاند لگ جاتے۔ بہرکیف پڑھنے والوں کے لیے کتابت و طباعت کی اس خامی کو چھوڑ کر اور فانی پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے یہ ایک نایاب تحفہ ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کتابیات میں اب تک جتنے مضامین اور فانی سے متعلق کتابیں شائع

ہوتی ہیں ان سب کی تفصیلات آگئی ہیں اور میں سمجھتا ہوں یہ ایک بڑا کام ہوگیا ہے جو مستقبل میں بہت سوں کی رہنمائی کرے گا۔

صفحات کی تعداد ۱۴۴ ہے اور قیمت آٹھ روپے ہے۔ یہ کافی ہے۔

رسالہ "روشن" روشن محل محلہ سوتھ بدایوں (یوپی) سے دست یاب ہوسکتا ہے (مبشر علی صدیقی)

تاریخ ناگپور

مصنف: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
ملنے کا پتا: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل محمد علی روڈ مومن پورہ ناگپور
قیمت: دس روپے

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی کتاب "تاریخ ناگ پور" دراصل پی۔ایچ ڈی کے لیے لکھے گئے ان کے تحقیقی مقالے کا ایک حصہ ہے۔ انھوں نے ۱۹۷۸ء میں "ناگپور میں اردو" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس کے باب اول سے پیش نظر کتاب کا تعلق ہے۔ مقالے کا ایک حصہ "کامٹی کی ادبی تاریخ" کے نام سے پہلے ہی منظر عام پر آچکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پیش نظر کتاب ناگپور کے تاریخی کوائف پر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے اور ڈاکٹر شرف الدین تحقیق کے ہر مرحلے سے کامیاب و کامران گزرے ہیں۔ مختلف حقائق کی ترتیب، توضیح و تصحیح کا کام انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ بعض سنین پر انھوں نے سوالیہ نشان لگا کر چھوڑ دیا ہے۔ یہ بات کھٹکتی ہے۔

کتاب کی ابتدا میں ناگپور شہر کی وجہ تسمیہ، قدیم تاریخ اور مغل حکمرانوں سے اس کے تعلق پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد ناگپور سے تعلق رکھنے والے دو اہم حکمرانوں خاندانوں یعنی راجا جاٹبا اور بھوسلہ خاندان کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے ہر طرح کے مآخذ سے مدد لے کر ان دونوں خاندانوں کے عہد حکومت میں موجود سیاسی، سماجی، مالیاتی اور مذہبی حالات سے بحث کی ہے اور انگریزی یا ہندی کے بعض مصنفین نے واقعات کی پیش کش میں جو غلطیاں کی ہیں ان کی نشان دہی بھی کردی ہے اس طرح یہ کتاب تاریخ کے ایک ایسے باب سے ہمیں روشناس کراتی ہے جو زیادہ مشہور نہیں ہے اور اردو زبان میں تو اس موضوع پر نہیں کے برابر لکھا گیا ہے۔

ویسے تو مصنف کی محنت اور لگن کا ثبوت کتاب کے ہر صفحے پر ملتا ہے لیکن گونڈ خاندان کے مشہور بادشاہ بخت بلند شاہ کے قبول اسلام سے متعلق انھوں نے جس طرح تحقیق کی ہے، اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ بخت بلند شاہ جسے جدید ناگپور شہر کا بانی اور معمار کہنا چاہیے، اورنگ زیب کے دربار میں تقریباً ۸ سال رہا۔ اور اسی دوران اسلامی تہذیب اور معاشرت سے متاثر ہوکر اس نے اسلام قبول کرلیا۔ لیکن اس حقیقت کو اکثر مورخین نے غلط طور پر پیش کرکے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ بخت بلند شاہ مجبوری کے تحت بعض مسلم رسوم و رواج کی پیروی پر آمادہ ہوا تھا ورنہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ڈاکٹر شرف الدین صاحب نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

کتاب کا انداز نگارش دلکش ہے۔ مصنف نے تاریخ کے علاوہ ادب سے بھی حوالے پیش کیے ہیں۔ کتابت وطباعت بھی صاف ستھری ہے اور قیمت بے حد مناسب۔ اس لیے باذوق حضرات سے اس کتاب کے مطالعے کی سفارش بہ آسانی کی جا سکتی ہے۔ (ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

کیا انجیلیں قابلِ اعتبار ہیں؟

مصنف: جان واٹسن گارڈس ایم ایچ ایم اور علی ناصری ایم اے
ناشر: کیتھولک ادارۂ تحقیقات، دہلی ۵۳
قیمت: ۲ روپے

زیرِ تبصرہ کتاب جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر تحریر کی گئی ہے کہ انجیلوں کو قابلِ اعتبار اور مستند ثابت کیا جائے۔ ابتدا میں اس جذبہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ماضی میں پائی جانے والی غلط فہمیاں اور تلخیاں رفع ہونی چاہئیں اور انھیں فلاحِ انسانیت کی خاطر باہم مل جل کر اجتماعی عدل، اخلاقی اقدار اور امن و آزادی کی حفاظت اور نشوو نما میں حصہ لینا چاہیے اس بات کو زیادہ واضح اور موثر انداز میں بیان کرنے کے لیے "کلیسا اور اسلام" کے عنوان سے دلچسپ) پولوس ششم کی ایک اپیل صفحہ ۳ پر اور کتاب کے آخر میں ٹائٹیل کی پشت پر شائع کی گئی ہے۔ اس اپیل میں اور کتاب میں جس جذبہ کا اظہار کیا گیا ہے اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کتاب کے بقیہ مندرجات اس جذبہ کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں ایک طرف اس جذبہ کا اظہار کہ ماضی میں پائے جانے والے منفی رجحانات کا خاتمہ ہونا چاہیے اور دوسری طرف نت نئے القابات میں جس سے علامہ ابن حزم اور دوسرے جید علمائے اسلام کو نوازا گیا ہے۔ کوئی نسبت نظر نہیں آتی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ الزامی اور منفی انداز کو ترک کر کے کوئی ایسا قابلِ قبول لائحہ عمل پیش کیا جاتا جو فریقین کو مثبت بنیادوں پر متحد کر سکتا لیکن اس کے برعکس ماضی میں جنم پانے والی تلخیوں کی یاد مسلمانوں کے ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسری طرف اس پرانی بحث کا اعادہ کیا گیا ہے کہ انجیلیں قابلِ اعتبار ہیں یا نہیں اور وہ کتنی الہامی ہیں اور کتنی غیر الہامی۔ انجیلوں کو معتبر قرار دیے جانے کے سلسلے میں وحی والہام کی ایک ایسی تعبیر پیش کی گئی ہے جو مسلمانوں کے نزدیک وحی والہام کے دائرے سے باہر کی چیز ہے۔ حالاں کہ اس بحث کے ضمن میں خود زیرِ تبصرہ کتاب میں صفحہ ۷ پر ایک سوال نما اعتراف اس طرح کیا گیا ہے کہ "کیا آج ۱۹ صدیوں بعد کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم یہ معلوم کر سکیں کہ ۳۰ء اور ۶۰ء کے درمیان جو الہامی تحریریں وجود میں آئیں ان کی اصل عبارت کیا تھی" جب یہ صورت ہو تو پھر موجودہ انجیلوں کے بارے میں کوئی حتمی اور یقینی بات کس طرح کہی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں زیرِ تبصرہ کتاب میں عیسائیت کی تعریف و تشریح اور انجیلوں کے دفاع کے ذیل میں بنیادی سچے عقائد کو نظر انداز کر کے صرف کچھ ایسی تعلیمات کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جو تقریباً تمام مذاہب میں یکساں ہیں، حالاں کہ ہر مذہب میں تعلیمات بنیادی عقائد کے تابع ہوتی ہیں اس قضیہ کو حل کرنے کے لیے ہمیں کسی ایسے ذریعہ کی تلاش کرنی چاہیے جو فریقین کے نزدیک الہامی اور قابلِ اعتبار ہو اور مسئلہ زیرِ بحث میں ہماری رہنمائی بھی کر سکتا ہو۔ اب

تقریباً تمام انصاف پسند عیسائی محققین اس بات کے معترف ہیں کہ قرآن ہر قسم کی تحریف سے مبّرا اور من جانب اللہ ہے۔ وہ تمام انبیاء اور ان کی تعلیمات کی نہ صرف تصدیق و تائید کرتا ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو ان کی آخری کڑی قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیرِ تبصرہ کتاب میں قرآن مجید کے بارے میں نہایت اچھے تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے اور بطورِ سند اس کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ قرآن الہامی کتاب ہونے کے علاوہ زمانی اعتبار سے بھی آج کے مقابلے میں مسیحی عہد سے زیادہ قریب ہے۔ اس طرح قرآنی کسوٹی کی روشنی میں ہم یقینی طور سے یہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے کہ موجودہ انجیلیں کس حد تک الہامی ہیں اور کس حد تک غیر الہامی۔ عیسائیت کے بنیادی عقائد اور اس کی تعلیمات میں کتنے الہامی اجزاء شامل ہیں اور کتنے غیر الہامی۔ بظاہر یہی ایک ایسا طریقۂ کار ہے جو فریقین کے لیے قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

(خالد حامدی)

ہندستان کدھر

مصنف: پروفیسر آل احمد سرور
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت: تین روپے

خواجہ غلام السیدین کی شخصیت علمی و ادبی دنیا میں خاصی معروف ہے۔ سیدین میموریل ٹرسٹ، دہلی نے ان کی یاد میں توسیعی خطبات کا ایک سلسلہ پچھلے چند سالوں سے شروع کیا ہے جس کے تحت ملک کی مشہور علمی و ادبی شخصیتیں کسی اہم موضوع پر اظہارِ خیال کرتی رہی ہیں۔ اب تک اس سلسلے کے پانچ لکچر ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور کی پیشِ نظر کتاب اس سلسلے کی چھٹی کڑی ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور ایک بے حد شگفتہ اور دلکش اسلوب کے مالک ہیں۔ بنیادی طور پر ادب سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ قومی اور سماجی مسائل پر بھی اظہارِ خیال کرتے رہے ہیں اور ان کا وہ حسنِ اسلوب جو تنقید کو تخلیق سے قریب تر کر دیتا ہے، ہر جگہ نمایاں رہا ہے۔ اس لکچر میں بھی ان کے مخصوص اندازِ بیان نے انفرادی حسن پیدا کر دیا ہے۔ سرور صاحب نے ملک کے ایسے مسائل پر قلم اٹھایا ہے جن کا تذکرہ کرتے وقت اکثر اہلِ قلم تلخی یا خطابت کا شکار بن جاتے ہیں، مگر آل احمد سرور اس پل صراط سے بہ آسانی گزر گئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"اکثریت کے نزدیک سیکولرزم ایک علامتی چیز ہے اور علامت کا احترام کرنا چاہیے اس پر عمل ضروری نہیں۔"

"جمہوریت کی روح کو جس طرح ہمارے یہاں ۳۵ سال میں مجروح کیا گیا ہے۔ جس طرح بقول ٹیگور صفائی کے لیے گھر کا فرش جھاڑا جا رہا ہے اور گرد کے مرغولے ہمارا دم گھونٹ رہے ہیں، جس طرح شہر بڑھ کر انسانوں کا جنگل ہوتے جا رہے ہیں، جس طرح زندگی ایک دیوانی دوڑ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کو خاموشی سے برداشت کرنے کے بجائے اس کی اصلاح میں تن من دھن سے لگ جانا چاہیے۔"

"وہ نفع کا سودا کرتے ہیں، قرآن کا سودا نہیں کرتے۔ وہ ساحل سے تماشا دیکھتے ہیں، طوفانوں"

سے نبرد آزما ہونے کا ان میں حوصلہ نہیں۔ ان میں عقل مصلحت اندیش ہے، عشق جنوں پیشہ نہیں۔"

سرور صاحب نے اس ادبی اور پرلطف انداز بیان کے سہارے ایک سنجیدہ موضوع پر بھی بڑی لطافت اور رعنائی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے جہاں تک موضوع کا سوال ہے یہ نہ صرف اہم ہے بلکہ دورِ حاضر کے بیشتر ہندستانیوں کے ذہن میں موجود ہے۔ آج ہر شخص جو قومی و ملکی مسائل سے تھوڑی بہت بھی دلچسپی رکھتا ہے، ہندستان کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہے اور موجودہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے صحیح طریقہ کار جاننا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدشات سے بھری اس صورت حال میں پروفیسر آل احمد سرور جیسے دانش ور کا اس موضوع پر اظہار خیال کرنا بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے دیباچہ کے تحت ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ــ

"پروفیسر آل احمد سرور نے ایسے موضوع کا انتخاب فرمایا ہے جو سب کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا اور دعوتِ غور و فکر دے گا" سرور صاحب نے اپنے اس لیکچر کا عنوان جواہر لال نہرو کے ایک شہرت یافتہ لیکچر سے لیا ہے۔ جو ۱۹۳۳ء میں کتابستان الہ آباد سے شائع ہوا تھا اور ایک عرصے تک موضوع بحث بھی رہا تھا۔

یہ خطبہ ہندستان کی آزادی سے قبل کے بعض اہم رجحانات خصوصاً پنڈت نہرو کی پالیسی، نظریات اور طریقۂ کار کے ذکر سے شروع ہوا ہے۔ لیکن اس حصے میں صرف نہرو جی کے نظریات کی توضیح و تشریح نہیں، بلکہ ان کی تنقید بھی ہے۔ پنڈت نہرو کی خامیوں کی طرف سرور صاحب نے واضح طور پر اشارہ کیا ہے اور اس کے لیے دلائل فراہم کیے ہیں اس کے بعد ایک سوال اٹھایا گیا ہے یعنی ــ" اتنے اچھے آغاز کے بعد آج ہماری حالت کیا ہے، ہمارے مسائل کیا ہیں، ہم جانا کدھر چاہتے ہیں اور جا کدھر رہے ہیں" (صفحہ ۱۳)

ان ہی سوالات پر بقیہ صفحات میں واضح طور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ سرور صاحب نے کہیں کسی رعایت، تامل یا مصلحت سے کام نہیں لیا بلکہ تمام نکات بلا تامل سامنے لاتے ہیں۔ موجودہ طریقۂ انتخاب، جمہوری اور تعلیمی نظام کی خرابیوں پر خاص طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مجموعی طور پر کتاب کی شکل میں پیش کردہ اس توسیعی خطبے کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ملک کے معاشی، سماجی، تعلیمی، تنظیمی اور سیاسی مسائل کے بارے میں بھی آل احمد سرور کا ذہن اتنا ہی بیدار اور واضح ہے جتنا علمی و ادبی مسائل کے بارے میں۔ سید بن میموریل ٹرسٹ کی یہ کاوش قابلِ قدر ہے۔ کتاب ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ ہے۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

ہماری غذا

مصنف: پروفیسر ایم ابن پوری اور پروفیسر اے۔ ابن طیش
ناشر: سلوچنہ پرکاشن۔ اے۔ ۵ گل مہر پارک نئی دہلی ۴۹
قیمت: بارہ روپے

ہماری صحت و تندرستی کا دارومدار زیادہ تر اس بات پر ہے کہ ہم کون سی غذا کھائیں جو ہماری صحت کو نہ صرف برقرار رکھے بلکہ اس میں چستی لائے اور اسے بالعموم بگڑنے نہ دے۔ اس کے لیے بنیادی طور پر ضروری ہے کہ ہمیں اپنی خوراک کا موزوں انتخاب کرنا چاہیے، جو مقامی آب و ہوا اور موجودہ صحت

کے مطابق ہو یا جو ماہر غذا کی نظر میں ہمیں زیادہ صحت مند رکھے۔

غذا کا انتخاب بڑی عقل مندی کا طلب گار ہے۔ ہمیں خون پیدا کرنے والی غذا چاہیے یا مقوی ذہنی طاقت کے لیے غذا چاہیے یا قبض سے نجات دلانے والی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری بیماری کو دور کرنے والی غذا کا جاننا بھی ضروری ہے۔ بدپرہیزی سے بھی صحت قائم نہیں رہ سکتی اس لیے یہ بھی لازم ہے کہ ہم اس کے متعلق معلومات رکھتے ہوں کہ کون سی خوراک کی بدپرہیزی سے ہمارا جسم بیماری کا شکار بن سکتا ہے۔ یا اگر ہم بیماری سے چھٹکارا پاکر بہت نحیف و کمزور ہوگئے ہیں تو اس حالت میں کون سی خوراک کس خوراک سے بدل دی جائے جس سے توانائی عود کرآ جائے۔ غرض کہ صحت کو بگڑنے سنوارنے اور اسے بہتر بنانے میں ہماری غذا بڑا حق ادا کرتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی غذا کی غذائیت کا جتنا بھی علم ہوگا اتنا ہی ہمارے لیے فائدہ مند ہوگا۔

زیرِ نظر کتاب محض اتفاقاً انعام یافتہ نہیں، بلکہ ہر طبقے کے قاری کے لیے مفید بھی ہے۔ اس میں وٹامن اے۔ وٹامن۔بی ولیہ۔ ریبوفلاوین۔ نوکلک ایسڈ۔ وٹامن بی ۱۲۔ وٹامن سی۔ پھل سبزیوں وٹامن ڈی۔ وٹامن ای۔ وٹامن کے اور اس طرح کی کئی اور جزئیات کا بیان شامل ہے۔ کھانے پکانے کی ضروری کچی سبزیوں۔ پھلوں وغیرہ پر ان کی غذائیت کو بڑے معلوماتی انداز میں سمجھایا گیا ہے اور کھانے کی مختلف چیزوں کے فوائد اوقات اور ان کی اہمیت وغیرہ پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے اور بہت سی کام کی باتیں کہہ دی گئی ہیں۔

کتاب ڈرامائی انداز بیان میں اور سلیس زبان میں لکھی ہونے کے باعث قاری کے دل کو چھو لیتی ہے۔ جا بجا تصاویر نے کتاب کی معنویت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ کہیں کہیں مصنفین نے شاعری اور مکالموں کا سہارا بھی لیا ہے جس سے دلچسپی ایک گونہ بڑھ گئی ہے۔ اردو میں چونکہ ایسے موضوعات پر کم کتابیں میسر ہیں اس لیے یہ کتاب ہر خاص و عام کے لیے سودمند ثابت ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو صحت و تندرستی سے متعلق کچھ جاننے کی خواہش رکھتے ہوں۔ اس کتاب سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

(اندر جیت لال)

گلستانِ سائنس

مصنف: خلیل اکمل
ملنے کا پتا: دارالقرآن نور خاں بازار۔ (حیدرآباد۔ اے پی)
قیمت: ۸ روپے

آج سے لگ بھگ تین دہائی پہلے جب جامعہ عثمانیہ میں سائنس اردو میں لکھائی پڑھائی جاتی تھی تب از درسی کے ساتھ ساتھ معلوماتی سائنس پر بھی کتابیں میسر ہو جاتی تھیں لیکن جب اردو ذریعہ تعلیم ہی نہ رہی تو اردو موضوعات پر انحطاط آئے نہ آئے۔ سائنس پر ضرور انحطاط آیا اور عوامی تقاضوں اور مزاج کے مطابق سائنس پر لکھنا پڑھنا رفتہ رفتہ بالکل ہی بند ہو گیا۔ دوسرے اردو داں لوگوں کا مزاج بھی ان حالیہ برسوں میں دوسری اصناف ادب کی طرف زیادہ رہا ہے۔ کچھ سہل پسندی کی وجہ سے اور کچھ شعر و شاعری سے زیادہ لگاؤ ہونے کی وجہ سے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد بھی اور سائنس ٹکنالوجی کی اہمیت جانتے ہوتے بھی اردو ادیب آج بھی شعر و ادب میں ہی اپنی گلکاریاں دکھا رہا ہے اور شاید

بھی کوئی معلوماتی انداز میں سائنس کے جانے پہچانے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے۔

اس اعتبار سے خلیل اکمل جو کہ تعلیمی طور پر کیمیکل انجینیر ہیں کی یہ کوشش بڑی اطمینان بخش ہے موصوف چوں کہ حیدرآباد کی ایک لیبارٹری میں ملازم ہیں، اس واسطے سے انھیں اپنے تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ سائنسی رسالے بھی پڑھنے کو میسر ہیں جس سے ان کے اپنے علم کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے۔ اور معلوماتی انداز پر لکھنے سے قارئین کے لیے پڑھنے کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے کچھ معلوماتی مضامین آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عوام کی ذہنی سطح تک سائنس کو سمجھانے اور پیش کرنے کا فن جانتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ۷ مضامین پر مشتمل ہے جس میں گھریلو ایندھن۔ تمباکو، آلودگی۔ گیاسی ایندھن شمسی توانائی، بحری وسائل۔ مصنوعی ریشہ اور ناریل کی صنعت قابلِ ذکر ہیں۔ مضامین کوئی زیادہ طویل نہیں۔ بلکہ کئی مضامین نہایت مختصر ہیں جیسا کہ ہر مضمون صرف اڑھائی صفحات میں ختم کر دیا گیا ہے۔ لیکن چوں کہ موضوعات ایسے ہیں جو ہماری روزانہ زندگی سے متعلق ہیں اس لیے ان میں قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے زبان زیادہ سلیس ہے۔ نیز بھاری بھرکم اور تکنیکی اصطلاحات سے احتراز کیا گیا ہے جو کہ خوش آئند ہے اور قاری کو پڑھنے کے لیے راغب کر لیتی ہے۔ یہ کتاب ہر سطح کے قاری کے لیے کچھ نہ کچھ معلومات فراہم کرتی ہے۔ طباعت قدرے کمزور ہے اگر اس طرف کچھ توجہ دی جاتی تو اس کا اثر کچھ زیادہ خوش گوار ہو سکتا تھا (اندرجیت لال)

تاریخی طب عربی

(تاریخی جائزہ)

مصنف: حکیم شاہ نور فیصل
ناشر: شعبۂ دارالاشاعت صولت پبلک لائبریری رامپور
قیمت: دس روپے

علم طب ایک قدیم ترین علم ہے اور اس کے بارے میں بہت ساری باتیں مشہور ہیں۔ اس کی ابتدا اور ارتقا کے سلسلے میں اہلِ عرب اور اہلِ یونان کا نام بھی اکثر لیا جاتا رہا ہے لیکن کم از کم میری نظر سے اس علم کی کوئی ایسی تاریخ نہیں گزری جس میں انتہائی اختصار کے ساتھ تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہو۔ حکیم شاہ نور فیصل نے یہ ایک اچھا کام کیا ہے۔

یہ کتاب کل نو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں یونانی طب کے تاریخی حالات مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تاریخ ۲ ہزار برس قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ اسقلی بیوس اول علم طب کا موجد اور پہلا رکن تھا۔ اس کے بعد غورس، مینس، برمانیدس اور افلاطون وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ علم طب کا ساتواں حکیم بقراط اور آٹھواں اہم رکن حکیم جالینوس ہے۔ ان تمام حکما کے حالاتِ زندگی اور طریقۂ علاج پر چند سطروں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور شاید اس سے زیادہ کی یہاں گنجائش بھی نہ تھی۔ پھر بھی ہر ماہر طب کی انفرادیت ایک حد تک واضح ہو جاتی ہے۔

دوسرے باب میں عربی طب کی ابتدا کے بارے میں اور تیسرے باب میں طب اسلامی کے ظہور کے سلسلے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مصنف اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ عرب میں علم طب زمانۂ قدیم سے

موجود تھا اور پوری دنیا میں یہیں سے یہ طریقۂ علاج پھیلا مگر خود عرب والے تقریباً یہ علم بھول چکے تھے ظہور اسلام کے بعد اہل عرب نے دوبارہ اس طرف توجہ کی اور یونانی ماہرین طب پر سبقت حاصل کر لی۔ انھوں نے اس فن کو اس قدر ترقی دی کہ اس کا نام ہی "طب اسلامی" پڑ گیا۔

چوتھے باب میں اس حقیقت کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ دنیا کی متعدد قوموں نے مسلمانوں کے خرمن علم و فن سے خوشہ چینی کی۔ پانچویں باب میں فن جراحی کی ابتدا عربوں سے تسلیم کی گئی ہے اور اس سلسلے میں بطورِ خاص ابوالقاسم ابن عباس الزہراوی الاندلسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں جابر بن حیان کو علم کیمیا کے موجد کی حیثیت سے روشناس کرایا گیا ہے۔ ساتواں باب مشہور فلسفی ابن رشد کے حالات پر مشتمل ہے لیکن مزید تفصیل کا متقاضی ہے۔ آٹھواں باب اسلامی حکومت کے دورِ عروج میں طبی مدارس اور شفا خانوں کی حالت پیش کرتا ہے۔ نویں باب میں طب اسلامی کے معمار کے عنوان سے ابوبکر محمد بن زکریا رازی کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد زکریا رازی اور ابن سینا کی تصنیفات اور اہل یورپ کے ان سے استفادہ کرنے کا ذکر ہے۔ پھر علم طب سے متعلق چند اہم امور پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ آخر میں اسلامی میٹریا یا میڈیکا کی خوبیوں اور انگریزی طب کی ابتدا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ موضوع علمی ہے مگر اندازِ بیان کہیں بھی خشک اور بوجھل نہیں ہے بعض سنین کے تعین میں کچھ اور احتیاط سے کام لیا جاتا، کچھ نکتوں کی مزید وضاحت کر دی جاتی اور چند شخصیتوں سے متعلق ذرا تفصیلی گفتگو کی جاتی تو کتاب اور بھی مفید اور بہتر ہو سکتی تھی۔ بہرحال یہ کتاب ایک اہم موضوع پر لکھی گئی ہے اور موجودہ دور میں جب علم طب کی طرف لوگ نئے سرے سے متوجہ ہو رہے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ دلچسپ اور معلومات افزا ثابت ہوگا۔ (ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

ایک سیاسی ڈائری

مرتب: اثر بن یحییٰ انصاری
پتا: ناصر عالیہ پبلی کیشنز، دھولیہ
قیمت: ساٹھ روپے

ترجمہ قرآن پر جب گفتگو ہو رہی ہو تو مولانا آزاد کا نام ذہن میں آ ہی جاتا ہے۔ وہ برصغیر کے شاید پہلے شخص ہیں جنھوں نے ترجمے پر "ترجمانی" کو ترجیح دی لیکن یہاں ان کا "ترجمان القرآن" زیر بحث نہیں ہے بلکہ اثر بن یحییٰ انصاری کی مرتب کردہ "مولانا آزاد: ایک سیاسی ڈائری" کا تعارف مقصود ہے۔ کتاب کے عنوان پر نہ جائیے گا۔ یہ کوئی مولانا آزاد کی خود نوشت ڈائری نہیں ہے بلکہ ان کی پیدائش (۱۸۸۸ء) سے وفات (۱۹۵۸ء) تک کے اہم متعلقہ سیاسی واقعات کو اثر صاحب نے مختلف اخبارات، رسائل اور کتابوں سے جمع کر کے مختصراً تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مولانا آزاد پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت اختیار کر سکتی تھی اگر مرتب نے تحقیق کے تقاضوں کا خیال رکھا ہوتا اور آزاد دوستی سے بلند ہو کر ڈائری کو مرتب کیا ہوتا۔ ڈاکٹر ظ انصاری نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے چپکے سے یہ بات بالکل صحیح کہی ہے کہ "اسے سائنسی انداز سے مرتب یا شائع نہیں

کیا گیا ہے۔ ناظر صاحب کی اس بات پر کتاب کا ہر پڑھنے والا صاد کرے گا کہ اس کتاب کے شائع کرنے میں بڑی محنت اور لگن صرف ہوتی ہے۔ انھیں کے بقول "اخباروں کے فائل چھانٹنا، اقتباسات جمع کرنا، پھر کچے مال کو آنچ دے کر صاف کرنا، برسوں پتہ پانی کرنا ہے۔ زیر کتیبر کا ذکر ہی نضول ہے معلوم نہیں مذکورہ بالا ترکیب الفاظ من وعن ناظر صاحب کی ہے یا حضرت کاتب کی کرم فرمائی کا نتیجہ ہے۔ حضرت کاتب مجھ جیسے تبصرہ نگار پر ناراض نہ ہوں۔ کیوں کہ کتاب کی ابتدا میں ہی خود اثر صاحب نے "ناظر بن سے التماس" کے تحت فرمایا ہے کہ "بعض مقامات پر کتابت کی کچھ غلطیاں ملیں گی جو اتنی ضخیم کتاب میں بہر حال ناگزیر تھیں" یہ صحیح ہے کہ موت کی طرح کتابت کی غلطیوں سے بھی مفر نہیں ہے لیکن معاملہ اس وقت ذرا زیادہ نازک ہو جاتا ہے کہ جب التماس یہ کیا جاتے کہ "بعض صفحات کے حاشیے [یعنی صفحات، کیوں کہ حاشیہ کہیں کوئی نہیں ہے] پر سنہ کی معمولی غلطی ہوگئی ہے... امید ہے کہ اس سے صرف نظر کر کے مجھ ناچیز کو ممنون کرم فرمایا جائے گا" ڈائری میں سنہ وتاریخ کی جو اہمیت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اگر تاریخ ہی مشتبہ ہو جائے تو پھر کسی بھی دستاویز کی حیثیت کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اب ہر شخص میرے دوست لطیف صاحب (عبداللطیف اعظمی) کی طرح خوش قسمت تو نہیں ہے جن کی اپنی پرائیوٹ ڈائری میں بعض بڑے لوگوں کی "مستند" تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات، ایک نہیں، تین تین، چار چار موجود ہیں اور ہر ہر تاریخ کے لیے وہ دستاویزی حوالے بھی پیش کر سکتے ہیں۔

زیر مطالعہ کتاب کہیں زیادہ مختصر اور مفید ہو سکتی تھی اگر اثر صاحب نے ہاتھ روک کر پیسے خرچ کیے ہوتے اور غیر متعلق مندرجات کو پوری بے مروتی کے ساتھ قلم زد کر دیا ہوتا۔ مثلاً دسمبر ۱۹۱۸ء کے تحت انجمن اقوام متحدہ کے قیام کے سلسلے میں صدر امریکہ ولسن کے سہ نکات کا تعلق تو کسی نہ کسی طرح مولانا آزاد سے جوڑا جا سکتا ہے لیکن مندرجہ ذیل اقتباس کو بھلا مولانا آزاد سے کیا رشتہ ہے؟ — "سال رواں دہلی میں اردو لغت فرہنگ آصفیہ کے مؤلف و مصنف سید احمد دہلوی کا انتقال ہو گیا۔ مذکورہ لغت مرحوم کی ۲۵ سالہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جو خسرو دکن نظام حیدر آباد کے تعاون سے شائع ہوتی ہے" اسی طرح حسب ذیل اندراج کو بھلا کس خانے میں رکھا جائے گا۔

> "۱۶ر جون ۱۹۱۷ء راقم التحریر (اثر بن یحییٰ) کی تولید کا دن ہے۔ میرے بزرگ اور اعزا نے درازی عمر اور اچھی تعلیم و تربیت کی دعائیں مانگیں۔ والد صاحب نے بڑے ذوق اور شوق سے میرا عقیقہ کیا اور میرا نام محمد سعید رکھا۔"

اثر صاحب مولانا آزاد کی محبت اور عقیدت کے معاملے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی حساس معلوم ہوتے ہیں۔ حالاں کہ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ وہ اپنی ڈائری نہیں لکھ رہے ہیں جس کے ذریعے دل کا بخار نکالا جا سکتا ہے۔ بلکہ مولانا آزاد پر تحقیق کرنے والوں کے لیے خام مواد اکٹھا کر رہے ہیں۔ اگر یہ نکتہ ان کے ذہن میں رہا ہوتا تو پھر صفحہ ۱۲ پر وہ ڈاکٹر عاشق بٹالوی پر اس طرح نہ برستے۔ کہ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اس پاکستانی نژاد نے اپنی تالیف اقبال کے دو سال بعد ص ۴۶۷ پر

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق انتہائی غلط بیانی، دروغ گوئی، دریدہ دہنی اور اپنی بیہودگی کا اظہار کیا ہے۔ شاید اس کی بود و باش کسی شریف خاندان سے نہیں ہے۔ اس کی ہرزہ سرائی ہند و پاک دوستی و رواداری کو استوکام بخشنے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہے۔ بنا بریں حکومت پاکستان کو چاہیے کہ اس بدبخت و بدزبان کی تمام کتابیں ضبط سرکار کر کے اسے قرار واقعی سزا کا مستحق گردانتے ہوئے اس کے اس فعل ناکارہ پر اظہار تاسف کرے۔

دراصل اثر صاحب یہ بھول گئے کہ تحقیق شے دیگر است و ترتیب شے دیگر۔ مرتب بیچ بیچ میں اپنی رائے نہیں دیتا۔ اس کی حیثیت تو دراصل اس بے چارے "ریسرچ اسسٹنٹ" کی سی ہوتی ہے جس کی محنت کا پھل محقق کھاتا ہے۔ اس ڈائری میں اثر صاحب نے دونوں حیثیتوں سے سامنے آنے کی کوشش کی ہے اور یہی اس کتاب کی بنیادی خامی ہے۔ ایم۔ او متھائی نے اپنی کتاب Reminiscence of the Nehru Age میں مولانا آزاد کے متعلق کتنی ایک ناگفتنی باتیں لکھی ہیں۔ متھائی محقق نہیں ہیں۔ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اسے اپنی ذاتی معلومات کہہ کر پیش کیا ہے۔ اب یا تو ہم متھائی کے انکشافات کو "مجذوب کی بڑ" سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔ یا پھر ہم اگر اثر صاحب کی طرح یہ دعوا کریں کہ " مذکورہ بالا کتاب میں مختلف الزامات مولانا پر عائد کیے گئے ہیں جس کا اصل سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے" تو پھر ہمیں باقاعدہ ان الزامات کو غلط "ثابت کرنا چاہیے مولانا آزاد کی زندگی میں ہی بعض لوگ دبے لفظوں ان پر شراب خوری کی تہمت لگانے لگے تھے۔ میری دانست میں متھائی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے کچھ گواہوں کے نام بھی لیے ہیں۔ مثلاً انھوں نے مولانا کے سفر یورپ کے متعلق لکھا ہے کہ جرمنی میں وہ جتنے دنوں رہے وہاں کا ہندستانی سفارت خانہ انھیں "شراب احمریں" کی بوتلیں پہنچاتا رہا۔ یہ بات بہت آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے کہ ان دنوں جرمنی کے ہندستانی سفارت خانے میں کون سے افسران تعینات تھے، ان لوگوں سے انٹرویو لیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ متھائی کے الزام کو لغو قرار دیں تب تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ الزام میں کوئی حقیقت نہیں ورنہ پھر خاموشی ہی بہتر ہے جس طرح خود مولانا آزاد اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اثر صاحب نے مسودہ مرتب کرنے کے بعد اس پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی۔ اگر وہ اس کے لیے وقت نکال لیتے تو بعض تاریخوں اور بیانات پر وہ خود ہی نظر ثانی کرتے اور اس سلسلے میں پڑھنے والوں کے ذہن میں جو شبہات پیدا ہو سکتے ہیں انھیں دور کرنے کی کوشش کرتے۔ مثلاً صفحہ ۲۴۸ پر مولانا آزاد کی اہلیہ کے سلسلے میں حمیدہ سلطان کے ایک مضمون کی بنیاد پر وہ اطلاع دیتے ہیں کہ " مولانا آزاد کی عمر ۱۲ سال کی تھی اور ان کی اہلیہ زلیخا بیگم کی چھ سال کی جب دونوں کا عقد ہوا تھا۔" میرے علم کے مطابق مولانا نے خود ان کے قلم سے نکاح کے وقت اپنی اہلیہ کی عمر کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے اس لیے حمیدہ سلطان صاحبہ کی روایت کو تسلیم نہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگرچہ میرا دل کم از کم چھ برس والی بات پر ٹھکتا نہیں۔ اثر صاحب نے اس بیان کو معتبر سمجھ کر تسلیم کر لیا ہے حالاں کہ اگر وہ اس سلسلے میں بعض تاریخوں کا تقابلی مطالعہ کرتے تو انھیں خود ہی "غلطبہاے مضامین" کا پتا چل

جاتا۔ اسی کتاب کے ص ۳۵۰ پر غبار خاطر کے حوالے سے زلیخا بیگم کے انتقال کے سلسلے میں مولانا آزاد کا یہ بیان ملتا ہے کہ "اس طرح ہماری ۳۶ برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی۔ واضح رہے کہ یہ بات ۱۹۴۳ء کی ہے گویا اس حساب سے مولانا اور زلیخا بیگم کا نکاح ۱۹۰۷ء میں ہوا ہو گا۔ گویا اس وقت مولانا اپنے سن پیدائش ۱۸۸۸ء کے حساب سے کم از کم ۱۹ برس کے تھے۔ اس طرح بارہ برس والی بات کی تردید تو خود مولانا کے قلم سے ہو گئی۔ ان کی اپنی تحریری شہادت کے بعد کسی دوسرے کا بیان اس معاملے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ زلیخا بیگم کی تاریخ پیدائش کا مجھے علم نہیں، اس لیے جب تک "نکاح نامہ" سامنے نہ ہو مجھے ذاتی طور پر اس بات کے تسلیم کرنے میں تکلف ہے کہ ۱۹ برس کے عاقل و بالغ ابوالکلام آزاد نے ۶ برس کی تقریباً دودھ پیتی بچی سے نکاح کر لیا ہو گا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ بارہ اور چھ کی ذمہ داری بھی کاتب کے سر ہو۔

بہر حال ان باتوں سے کتاب کی اہمیت گھٹانی مقصود نہیں ہے۔ کتاب اس معاملے میں منفرد ہے کہ مولانا آزاد کے بارے میں سنہ وار اتنی زیادہ معلومات کسی دوسری کتاب میں نہیں ملیں گی کتاب کی انفرادیت اور افادیت سے قطع نظر اثر صاحب اس لیے بھی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ایسے زمانے میں جب نئی نسل کے لیے آزاد اجنبی بنتے جا رہے ہیں انھوں نے آزاد کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اب تو آزاد ایک کہانی بن گئے ہیں اور ان کا تذکرہ کبھی ہوتا بھی ہے تو ان کے کارناموں اور قربانیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ India Wins Freedom کے ان چند صفحات کی وجہ سے۔ جو گورنمنٹ کے پاس بطور امانت رکھے ہوئے ہیں اور اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے اس وقت منظر عام پر آئیں گے جب لوگ پوچھتے پھریں گے کہ آزاد کون تھے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جب تک چل سکے، اور کچھ نہیں تو آزاد کا ذکر چلے۔

(پروفیسر منیرالحق)

انقلاب ۱۸۵۷ء
(تصویر کا دوسرا رخ)

مترجم: شیخ حسام الدین
ناشر: اتر پردیش اردو اکاڈمی قیصر باغ لکھنؤ
قیمت: چھ روپے

۱۸۵۷ء کا تاریخی معرکہ ہندستانی تاریخ میں متعدد ناموں سے رقم کیا گیا ہے۔

۱۔ غدر۔ ۲۔ بغاوت ۳۔ انقلاب ۱۸۵۷ء لیکن سیاسی اور تاریخی اعتبار سے یہ سب نام یا اصطلاحیں ذہنی طور پر فریب خوردہ ثابت ہوئیں۔ "کارل مارکس" نے اس کو "ہندستان کی پہلی جنگ آزادی" بتایا۔ مورخوں اور دانش وروں نے اس کو قبول کیا اور یہی تاریخی سچائی ہے۔

اس موضوع پر امریکہ سے ایک کتاب The other side of the Medal شائع ہوئی تھی۔ مصنف کا نام ایڈورڈ ٹامسن تھا۔ مولوی محمد علی (وکیل ایبٹ آباد) نے اس کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ "غدر ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رخ" ۱۹۲۷ء میں "الہلال" کے دو شماروں میں شائع کیا تھا۔

شیخ حسام الدین نے اس کتاب کا آزاد ترجمہ کر کے ۱۹۳۱ء میں "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر

کا دوسرا رخ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اسی کتاب کے عکس کی اشاعت سے اترپردیش اردو اکاڈمی نے زیرِ نظر کتاب چھاپی ہے۔

اس کتاب کا پیش لفظ محمود الٰہی چیئرمین مجلسِ منتظمہ" دیباچہ" شیخ حسام الدین امرت سری اور " مقدمہ" عبدالرحیم خاں پو پلزئی پشاوری نے رقم فرمایا ہے۔

اس کتاب سے ہندستانیوں کی جاں فروشی اور برطانوی سامراج کے سیاسی استحصال نیز ظلم و تشدد کا پتا چلتا ہے۔ سرہیوروز نے مہارانی جھانسی کو شکست دی اور میدانِ جنگ میں یہ دخترِ ہند کام آئی۔ ہوڈسن نے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا اور شہزادوں کو تہ تیغ کیا۔ ہولناک داستان کے علاوہ ملکہ وکٹوریہ کی تحریر لارڈ کیننگ کا مراسلہ اور دیگر دستاویزی چیزیں مطالعے کے قابل ہیں سرکاری رپورٹیں اور اخباروں میں چھپی خبریں اس عہد کے واقعات کی شاہد ہیں۔ پنجاب میں ۱۸۷۲ء تک جو غیر انسانی سلوک ہوا وہ لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ جلیانوالہ باغ اور قصہ خوانی بازار کی خون چکاں داستان ۱۸۵۷ء کا تتمہ سمجھیے۔ غرض ملک کی آزادی کے لیے بلا تفریق مذہب و ملت ہندستانیوں نے مثالی قربانی پیش کی ہے۔

کتاب عمدہ چھپی ہے۔ قیمت کم ہے۔ (ڈاکٹر سیفی پریمی)

ماہ نامہ "سہیل" گیا

ترتیب: ڈاکٹر علیم اللہ حالی۔ جمیل منظر سہسرامی
پتا: ماہ نامہ سہیل ریور سائڈ روڈ۔ گیا
قیمت: دس روپے

"گیا" اردو ادب کا ایک زرخیز علاقہ ہے اور ماہ نامہ "سہیل" اس زرخیزی کی جیتی جاگتی علامت۔ مختلف قلم کاروں کی جرأت مندانہ تخلیقی کاوشیں اس رسالہ میں جا بجا نظر آجاتی ہیں۔

سہیل کا زیرِ نظر شمارہ منوّر رانا کے نام ہے۔ منوّر رانا اردو ادب کا بے باک شاعر اپنی شعری عمر کے اعتبار سے جو نہیر سہی اس کے قلم میں حوصلوں کی دنیا آباد ہے۔ سادہ پیرایہ میں صاف اور سچی باتیں کرنا بلکہ کھری کھری باتیں سنانا منوّر رانا کا وہ وصف ہے جو آج کے سیاسی کردار یا منافقانہ رویے کی نفی کرتا ہے۔ منوّر رانا اپنے جذبات و احساسات کو کسی نظریہ کے پاس گروی رکھنے کے قائل نہیں۔ اس کے مشاہدات بھی اگرچہ شہروں کے دوسرے باشندوں کی طرح عام ہیں لیکن شیوۂ گفتار" عام نہیں۔ اس کے بات کہنے کا وہ طریقہ نہیں ہے جو کہیں سے مستعار ہو اس کا اپنا لب و لہجہ اور اپنی آواز ہے جو پاکیزگی، خلوص، صداقت سادگی اور بے ساختگی کا مرکب ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بھرے شہروں میں قربانی کا موسم جب سے آیا ہے
مرے بچے کبھی ہولی میں پچکاری نہیں لاتے

لبوں پہ اس کے کبھی بد دعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

اس جنگ نے بیساکھیاں بخشیں مجھے رانا
سرکار سے انعام و زیروں کو ملے گا
حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ
دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا
بڑے لوگوں سے ملنے میں بُرائی کچھ نہیں رانا
مگر اس پیڑ کی شاخیں بہت کمزور ہوتی ہیں

اس شمارے میں اتنے مضامین ہیں کہ منور رانا سے بھرپور تعارف ہو جاتا ہے۔ نئے اور اچھے اشعار کا ذوق رکھنے والوں کو میرا مشورہ ہے کہ منور رانا کو ضرور پڑھیں (خالد محمود)

قلم

مدیر: الیاس شوقی
ناشر: الیاس شوقی۔ بمبئی
قیمت: دو روپے

ایک لٹل میگزین جس میں ایک مقالہ تین افسانے چند نظمیں اور غزلیں نیز آزاد شاعری کے پہلے شاعر۔ تصدق حسین خالد کے کلام کا انتخاب اور ان کے اپنے قلم سے اپنے فن پر لکھا گیا ایک مضمون شامل ہے۔ (خالد محمود)

تاریخ اطبائے بہار "جلد دوم"

مؤلف: محمد اسرار الحق
پتا: کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴
قیمت: ۳۵ روپے

زیر نظر کتاب اپنے موضوع پر منفرد اور خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اطبا کے حالات کی فراہمی ہوتی ہے بلکہ یہ کتاب ان کے تعلیمی، سماجی، سیاسی، ثقافتی ذوق کی جانکاری بھی فراہم کرتی ہے۔ اس کتاب میں جہاں ایک جانب اطبائے بہار کے سوانحی حالات ہیں، وہیں ان کے تجربات، کمالات، مشاہدات بھی درج ہیں، ادبی، سماجی اور مذہبی سرگرمیوں کا بھی ذکر ہے۔

کتاب کا انتساب مؤلف موصوف نے اپنے پیر و مرشد کی جانب کیا ہے۔ پیش لفظ علامہ طب حضرت مولانا حکیم عبد الاحد صاحب سابق پرنسپل گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ و ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر انڈیجنس میڈیسین بہار کے قلم کا رہین منت ہے۔ جس میں موصوف نے کتاب کی اہمیت اور اس کی افادیت پر تفصیلی بحث کی ہے، مزید برآں دوسری طبوں سے طب یونانی کا تقابلی مطالعہ بھی موجود ہے۔" موصوف لکھتے ہیں کہ میں اپنی طرف سے، تمام اطبا کی طرف سے، بلکہ تمام تاریخی وعلمی حضرات کی طرف سے اور اردو دنیا کی طرف سے حکیم محمد اسرار الحق کو اس تصنیف پر مبارک باد پیش کرتا ہوں ....." پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "حکیم صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور تصنیف و تالیف کا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں، یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو بہار کے اطبا کے تذکرے پر مشتمل ہے۔"

"تاریخ اطبائے بہار" میں بھی جا بجا تنقیدی عناصر ملتے ہیں، جس سے نہ صرف مولف کے تنقیدی

شعور کا پتا چلتا ہے بلکہ اس سے موصوف کے ادبی اور تحقیقی ذوق و شوق کی بھی جانکاری ہوتی ہے، جو آپ کے جمالیاتی تنقیدی ادراک کا ایک نمونہ ہے۔

اس طرح یہ کتاب خاصی معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس میں ۱۹۴ اطباء کے حالات کے علاوہ علاقائی طبوں سے بھی بحث کی گئی ہے، جن میں بابلی، مصری، چینی، ہندی، یونانی، اور عربی و اسلامی طبوں کے ذکر شامل ہیں۔ طب کی تاریخ بھی مختصراً تحریر ہے۔

اسلامی دور کے ممتاز مسلم اطباء اور ان کی تصانیف، یونانی طب ہندستان میں فن طب میں ہندستانی مصنفین کی کتابیں، قدماء کی کتابوں پر ہندستانی اطباء کی شروح، بہار کے مشہور اطباء اور ان کی تصانیف، بہار کی طبی درس گاہیں، وغیرہ عنوانات بھی اس کتاب میں شامل ہیں، جس سے کتاب کی زینت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ کتابت و طباعت بھی خوب ہے، کاغذ بھی اچھا ہے اور گیٹ اپ بھی بہتر ہے۔ اس لیے توقع ہے کہ یہ کتاب خاص و عام میں مقبولیت کا شرف ضرور حاصل کرے گی۔

(شمشاد لکھنوی)

امنگ (میگزین) اندرا گاندھی نمبر

مرتبین : عبدالحق خاں۔ خالد محمود

ناشر: جامعہ سینیر سیکنڈری اسکول۔ نئی دہلی ۲۵

کسی تعلیمی ادارے کی علمی فضا کو برقرار رکھنے اور طلبا کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لیے ادبی سرگرمیوں کی بڑی اہمیت ہے۔ اور طلبا میں تحریر و تقریر کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے اسکول میگزین نہایت موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

جامعہ سینیر سیکنڈری اسکول کے اسکول میگزین۔ "امنگ" کا ایک خصوصی شمارہ اندرا گاندھی نمبر شائع ہوا ہے۔ سرورق اپنی مثال آپ ہے حصہ اردو میں مرتبین کی معروضات کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر علی اشرف اور پرنسپل عبدالحق خاں کے پیغامات آنجہانی اندرا گاندھی کی جامعہ کے کنووکیشن اور بانی جامعہ مختار احمد انصاری کے جشن صد سالہ کے مواقع پر لی گئی دو تصاویر طلبا کے پندرہ مضامین تین نظمیں نیز جامعہ کے دانشوروں میں پروفیسر علی اشرف، کرنل بشیر حسین زیدی، بیگم صالحہ عابد حسین پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، پروفیسر مشیر الحق، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی بیگم سعیدہ خورشید عالم، پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر مظفر حنفی، عبداللطیف اعظمی، شہاب الدین انصاری، دیویندر جوشی۔ محمد طیب کے تاثرات مفتی محمد مکرم احمد کا مضمون اور محمد یوسف پاپا کی نظم شامل ہے یہ حصہ خاصا وقیع ہے، ہندی اور انگریزی کے مضامین اگرچہ نسبتاً کم ہیں مگر اپنی جامعیت کے پیش نظر طلبا کی یہ کاوش بھی لائق تحسین ہے۔ رسالہ میں اندرا گاندھی کی جامعہ سے متعلق چند یادگار تصاویر شامل کی گئی ہیں اندراجی کی تصاویر اور تصاویر دونوں سے ان کی جامعہ سے قربت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر مضامین کے انتخاب سے لے کر اشاعت کی آخری منزل تک سلیقہ مندی اور خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

(ولی شاہجہانپوری)